تفسیر نمونہ موضوعی

# پیام قرآن

از

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ

مولانا سید صفدر حسین نجفی

مصباح القرآن ٹرسٹ

تفسیر موضوعی

جلد سوم

زیرِ نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

# پیامِ قرآن

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

علامہ حافظ سید ریاض حسین نجفی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ------------------ تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن

جلد ------------------ سوم

مؤلف ------------------ آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ------------------ علامہ حافظ سید ریاض حسین نجفی

فنی معاون ------------------ قلب علی سیال

کمپوزنگ ------------------ فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

سال اشاعت ------------------ جون 2012ء

ناشر ------------------ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ مکمل سیٹ (جلد اوّل تا دہم) ------ 3500 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرضِ حسنہ تعاون فرمایا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

## ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulqurantrust.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دورِ حاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہوتو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جو عموماً صدرِ اوّل سے لے کر آج تک لکھی جارہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتابِ الٰہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔۱۔تفسیرِ مفرداتی ۲۔تفسیرِ ترتیبی ۳۔تفسیرِ موضوعی ۴۔تفسیرِ ارتباطی ۵۔تفسیرِ کلی۔

تفسیر کے پہلے دوطریقے عام طور پر متعارف ہیں۔بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیاتِ قرآنی کو ایک مقام پر لاکر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کردی گئی ہے،لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیرِ موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظر عام پر آچکا ہے۔تفسیر موضوعی کا زیرِ نظر سلسلہ (پیام قرآن) جو کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعیٔ جمیل کا نتیجہ ہے،اس کی دس جلدیں (جلد اوّل تا جلد دہم) قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''تفسیرِ موضوعی۔ پیامِ قرآن جلد سوم'' کا اردو ترجمہ علامہ حافظ سید ریاض حسین نجفی نے کیا ہے۔جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔اس کتاب کی اشاعت میں مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرضِ حسنہ تعاون فرمایا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

مزید برآں مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔جون 2012ء تک آپ ہماری تمام کتب ہماری ویب سائٹ www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

# فہرست

# تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن جلدنمبر 3


| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|
| معرفتِ خدا کے راستے | 16 |
| (۱) برہانِ نظم | 17 |
| (۲) برہانِ تغیر وحرکت | 18 |
| مفردات کی تشریح | 19 |
| تفسیر اور اہم مطالب پر ایک نظر | 21 |
| بت پرستوں کے مقابلے میں حضرت ابراہیم کا مضبوط استدلال | 21 |
| افول اور حدوث کا باہمی تعلق: | 25 |
| توضیحات | 29 |
| (۱)......برہان حرکت اور اس کے مقدمات: | 29 |
| ا۔حرکت کی تعریف: | 29 |
| ب۔حرکت کا وجود | 30 |
| ج......حرکت کے ارکان | 30 |
| د......وہ امور جن میں "حرکت" واقع ہوتی ہے | 30 |
| جوہر میں پائی جانے والی حرکت کے دلائل | 31 |
| (۲) برہان حرکت کے ذریعے وجودِ خدا کی پہچان: | 33 |
| (۳) تمام جہان متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہے | 35 |
| (۴) عصر حاضر کے علمی قوانین اور جہان کا حادث ہونا | 36 |
| (۳) برہان وجوب وامکان (غنیٰ وفقیر) | 38 |
| الفاظ کی تشریح | 39 |
| آیات کی تفسیر اور اہم مطالب کا ذکر | 40 |
| سب اسی کے محتاج ہیں: | 40 |
| توضیحات | 44 |
| (۱)۔برہان وجوب وامکان فلسفی نقطۂ نظر سے: | 44 |
| (۲) اسلامی روایات میں دلیل غنیٰ وفقر کا ذکر: | 46 |
| برہان علت ومعلول | 48 |
| الفاظ کی تشریح: | 49 |
| تفسیر آیات | 50 |
| ایک عجیب سوال: | 50 |
| توضیحات | 53 |
| برہان علت ومعلول فلسفہ وعلم کلام میں | 53 |
| (۱) قانون علیت کی تعریف: | 53 |
| (۳) قانون علیت کی وسعت وکارگزاری: | 53 |
| (۳) قانون علیت کی شناخت کا سرچشمہ: | 54 |

| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|
| (۴) علت کی قسمیں: | 55 |
| برہان علیت کی وضاحت: | 56 |
| (۴) برہان صدیقین | 58 |
| مفردات کی تشریح: | 59 |
| تفسیر اور آیات کے مطالب پر ایک نظر | 61 |
| قرآن اور برہان صدیقین | 61 |
| سورج اپنے وجود کی دلیل بن کر آیا: | 62 |
| خدا کا احاطہ وجودی: | 63 |
| ابتداء بھی تو اور انتہاء بھی تو: | 64 |
| وہ کائنات کو روشنی دینے والا ہے: | 65 |
| توضیحات | 68 |
| (۱) اسلامی حدیثوں اور دعاؤں میں برہان صدیقین | 68 |
| (۲) توضیح برہان صدیقین | 70 |
| خدا کی پہچان کا باطنی راستہ فطری خداشناسی | 72 |
| مفردات کی تشریح: | 75 |
| جمع آوری آیات وتفسیر | 76 |
| خلقت ثابت و پائیدار | 76 |
| جب طوفان حوادث کا شکار ہوتے ہیں: | 77 |
| وہ لوگ بھی اعتراف کرتے ہیں: | 80 |
| عالم ذر میں عہد و پیمان: | 82 |
| (۱) محدثین واہلِ ظاہر کا مسلک | 83 |

| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|
| (۲) عالم ذر | 83 |
| ۳۔ عالم ذر سے مراد عالم ارواح ہے | 84 |
| ۴۔ سوال و جواب بوسیلہ پیغمبران: | 84 |
| (۵) یہ سوال و جواب بزبان حال ہوا | 84 |
| (۶) المیزان میں منقول تفسیر | 85 |
| قول اوّل: | 86 |
| قول دوم | 87 |
| قولِ سوم: | 87 |
| قول چہارم: | 87 |
| قول پنجم | 88 |
| قول ششم | 88 |
| عالم ذر کی بحث کا نتیجہ: | 88 |
| توضیحات | 89 |
| (۱) اسلامی روایات میں عالمِ ذر'' | 89 |
| ۲۔ کونسی فطرت؟ فطرت عقل یا قلب | 91 |
| ایمان بہ خدا کے فطری ہونے کی زندہ دلیلیں: | 92 |
| تاریخی واقعات: | 92 |
| (۲) آثار قدیمہ کے شواہد: | 93 |
| (۳) ماہرین نفسیات کے مطالعات واکتشافات: | 93 |
| (۴) مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کی ناکامی: | 94 |

| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|
| ۵۔شدید زندگی میں شخصی تجربے: | 95 |
| ٦۔فطرت مذہبی پر دانشوروں کی گواہی: | 96 |
| (۴) اسلامی روایات میں فطرت کا ذکر | 98 |
| ذاتِ خدا کی یکتائی معفرتِ خدا میں اہم ترین اصل | 100 |
| مفردات کی تشریح: | 104 |
| جمع آوری آیات اور تفسیر | 105 |
| گناہِ ناقابل بخشش | 105 |
| سب سے بڑا ظلم: | 107 |
| خوفناک سقوط: | 108 |
| مشرکین پر بہشت حرام ہے: | 109 |
| اللہ تعالیٰ مشرکوں سے بیزار ہے: | 109 |
| شرک کا مقابلہ کرنا حضرت ابراہیمؑ سے سیکھیں: | 112 |
| توضیحات | 113 |
| مسئلہ توحید وشرک کی اتنی اہمیت کیوں؟ | 113 |
| دلائل توحید | 115 |
| (۱) توحیدِ خدا پر فطرت کی گواہی | 116 |
| تفسیر آیات | 118 |
| نور توحید کی روشنی: | 118 |
| تمام شدائد اور سختیوں میں اس کی پناہ لیتے ہو: | 119 |
| امواج ظلمت میں نور درخشاں: | 121 |
| موجوداتِ جہاں کا باہمی ارتباط وہم آہنگی | 123 |
| مفردات کی تشریح: | 124 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 125 |
| اگر دنیا میں دو خدا ہوتے: | 126 |
| توضیحات | 128 |
| (۱)۔علوم کی رو سے آفرینش جہان کی وحدت: | 128 |
| (۲) برہان تمانع کی ایک وضاحت | 129 |
| دو سوالوں کا جواب: | 129 |
| جواب: | 130 |
| توضیح: | 130 |
| اسلامی روایات اور برہان وحدت وتمانع: | 131 |
| ۳۔دلیل صرف الوجود | 133 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 134 |
| خود خدا اپنی ذات کی وحدت کا گواہ ہے: | 134 |
| وہی ہے اوّل وآخر، ظاہر باطن: | 135 |
| توضیحات | 137 |
| (۱) خدا ایک لامتناہی حقیقت اور غیر محدود ہے: | 137 |
| (۲) وجود غیر متناہی ولامحدود یقیناً ایک ہے: | 138 |
| (۳) دلیل صرف الوجود اسلامی روایات میں | 138 |
| دلیل فیض وہدایت تمام انبیاءؑ نے توحید خدا کی دعوت دی | 140 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 141 |
| خدائے واحد کی طرف کے پیغمبروں کی عمومی دعوت | 141 |
| کیا شرک کے حق میں کوئی دلیل ہے؟ | 142 |

| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|
| توضیحات | 143 |
| فیض وہدایت اسلامی روایات میں | 143 |
| (۵) برہان ترکب | 144 |
| توحیداور الدلہ نقلی: | 145 |
| شرک کے اہم سرچشمے شرک کا پہلا سرچشمہ اوہام کی پیروی | 146 |
| مفردات کی تشریح: | 148 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 149 |
| وادی اوہام میں جا پڑنا: | 149 |
| نامہائے بے اصل: | 150 |
| اندازہ وتخمینہ پر بھروسہ | 151 |
| شرک کا دوسرا سرچشمہ، حسی میلان ورغبت | 155 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 157 |
| ہم خدا کو کیوں نہیں دیکھ سکتے: | 157 |
| یہی سوال حضرت موسیٰ سے کیا گیا: | 158 |
| مجھے آسمان پر جانے دو کہ خدا کو دیکھوں: | 158 |
| وہ منتظر ہیں کہ خدا ان کے پاس آئے: | 160 |
| توضیحات | 161 |
| صرف عالمِ محسوسات ہی پر کیوں تکیہ کرتے ہیں؟ | 161 |
| شرک کا تیسرا سرچشمہ خیالی فوائد ومنافع | 163 |
| مفردات کی تشریح: | 164 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 165 |
| بت ہمارے شفیع ہیں: | 165 |
| توضیحات | 166 |
| ۱۔مفروضہ شفاعت کا سرچشمہ | 166 |
| ۲۔عربوں میں بت پرستی کا رواج | 168 |
| (۳)......شرک وبت پرستی کے دیگر عوامل | 169 |
| شرک کا چوتھا اور پانچواں سرچشمہ تقلید واستعمار | 170 |
| مفردات کی تشریح: | 172 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 172 |
| بت پرستی ہمارے اسلاف کا دستور ہے: | 172 |
| بت پرست ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے رہے: | 175 |
| توضیحات | 177 |
| (۱) تقلید، اقوام کی ترقی یا انحطاط کا عامل: | 177 |
| (۲)......ہوائے نفس اور شیطانی وسوسے | 177 |
| (۳) بت پرستی غلامی اور استعمار کا عامل ہے: | 178 |
| (۴)۔عوامل شرک کے متعلق آخری بات: | 179 |
| اقسام توحید | 182 |
| (۱) توحید ذات (۲) توحید صفات (۳) توحید عبادت (۴) توحید افعال | 182 |
| توحید کی بنیادی اقسام: | 182 |
| توحید ذات وصفات | 184 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 185 |
| اے وہ ذاتِ جو وہم وخیال سے بلند تر ہے: | 185 |

| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|
| توضیحات | 190 |
| (۱) توحید ذات کا گہرا مفہوم: | 190 |
| (۲) توحید صفات کا مفہوم: | 190 |
| (۳) توحید صفات کی دلیل: | 191 |
| توحید در عبادت | 193 |
| مفردات کی تشریح: | 196 |
| آیات کی جمع آوری تفسیر | 197 |
| معبود فقط وہی ہے: | 197 |
| میں غیر خدا کی پرستش نہیں کرتا: | 199 |
| جس جگہ خدا کی عبادت نہ کرسکوں وہاں سے ہجرت کر جاؤ: | 201 |
| توضیحات | 205 |
| (۱) توحید عبادت کا شجر میوہ دار: | 205 |
| ۲۔رُوح عبادت اور افراط وتفریط سے پرہیز: | 206 |
| (۳)......وہابیوں کی شرک آلود توحید: | 208 |
| توضیح: | 209 |
| ۴۔توحید افعالی (۱)......توحید خالقیت | 212 |
| مفردات کی تشریح: | 213 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 214 |
| وہ عرش کا مالک ہے: | 214 |
| بُت پرست بھی خدا کو خالق جہان مانتے ہیں: | 216 |
| توضیحات | 218 |
| (۱) شرک در خالقیت کی طرف پہلا قدم: | 218 |
| (۲) راہِ شرک میں دوسرا قدم: | 219 |
| اشاعرہ: | 220 |
| معتزلہ: | 220 |
| (۲) توحید ربوبیت | 223 |
| مفردات کی تشریح: | 224 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 226 |
| اے خدا......تو سارے جہان کا پروردگار ہے | 226 |
| خدا ہی مدبر امور ہے: | 229 |
| توضیحات | 231 |
| (۱) توحید یعنی درمیانی واسطوں کو حذف کرنا: | 231 |
| (۲) تاریخ مذاہب اور بے اصل واسطے: | 232 |
| (۱)۔ رومیوں کے خدا: | 232 |
| (۲) یونانیوں کے خدا: | 232 |
| (۳) مصریوں کے خدا: | 233 |
| (۴) ایرانیوں کے خدا: | 233 |
| (۵) چینیوں کے خدا: | 234 |
| (۶) عرب کے بُت پرست: | 234 |
| (۷) مختلف ممالک کے خدا: | 235 |
| (۸) مثل افلاطونی پر اعتقاد: | 235 |
| (۳) تفویض بھی شرک ہے: | 236 |

| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|
| (۴)ایک سوال کا جواب: کیا فرستے مدبر امر ہیں؟ | 237 |
| (۵) احادیث اسلامی اور توحید ربوبیت: | 238 |
| (۳)توحیدِ مالکیت وحاکمیت تکونی | 240 |
| مفردات کی تشریح: | 242 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 242 |
| یااللہ! تو ہی مالک الملک ہے: | 242 |
| توضیحات | 246 |
| (ا) توحید مالکیت وحاکمیت پر ایمان کے تربیتی اثرات: | 246 |
| (۲) خدائی مالکیت سے غلط استفادہ: | 247 |
| (۴)توحید قانون گذار یحاکمیت تشریعی | 249 |
| مفردات کی تشریح: | 251 |
| آیات کی جمع آوری اور تفسیر | 252 |
| حکم بس اللہ ہی کا ہے: | 254 |
| اپنے اختلافات میں خداوند پیغمبرؐ کی طرف رجوع کرو: | 255 |
| توضیحات | 258 |
| (ا) خدائی حاکمّیت عقل کی روشنی میں: | 258 |
| (۲) حکومت ایک امانتِ خداوندی ہے: | 259 |
| (۳)حکومت کی تشکیل صرف خدا کی طرف سے ہے | 259 |
| (۴)توحید حاکمیت پر ایمان رکھنے کے اخلاقی اثرات | 261 |
| (۵)توحید اطاعت | 262 |
| مفردات کی تشریح: | 264 |
| آیات کی جمع آوری وتفسیر | 265 |
| خداوندا! ہم صرف تیرے فرمان کے مطیع ہیں: | 265 |
| عالموں اور رہبروں کی پرستش نہ کرو: | 268 |
| توضیحات | 270 |
| (ا) مطاعِ مطلق صرف خدا ہے | 270 |
| (۲) توحید اطاعت اور احادیث: | 271 |

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# اہداء

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زُلال سے زیادہ آب حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

# ابتدائیہ

## اللہ کی طرف......راستے

جیسا کہ آغاز کتاب میں ذکر ہوا۔ ہر دل میں خدا کی طرف ایک راستہ کھلا ہے! اور ہر انسان کی روح کا پرندہ اس کے گیت گا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانی نفوس کی کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں اور ہر شخص اس بارے میں ایک خاص قسم کا شعور اور ادراک رکھتا ہے۔ تاہم اپنی اپنی نظر کے باوجود سب کی جہت ایک اور پورا کاروان ہستی اسی کی طرف رواں دواں ہے۔ اس کی ذات وصفات کے عرفان کا شگوفہ ہر دل کی گہرائی میں مہکتا ہے اور ہر انسان کے باغِ دل میں معرفت خدا کا پھول کھلا ہوا ہے۔

انسانی دل کی 'وادیٔ ایمن' سے ''اِنّی انا اللہ'' کا آوازہ ہمیشہ سنائی دیتا ہے اور وہ انسانی نفوس کے موسیٰ کو اپنی طرف دعوت دے رہا ہے۔ وہ 'فاخلع نعلیك انك بالواد المقدس طوٰی'' کے فرمان سے انسانوں کو ہدایت دے رہا ہے، کہ وہ نہایت احتیاط اور خضوع وخشوع کے ساتھ اس مقدس و پاکیزہ وادی میں قدم رکھیں۔

جناب مریمؑ کی طرح ''وھزی الیك بجذع النخلۃ'' کے حکم سے سب بنی آدم کو یہ تاکید کی جارہی ہے کہ شجر توحید کی شاخوں کو ہلا کر ایمان معرفت کے ثمرہائے شیریں حاصل کریں۔ وہ وقت کے نمرودیوں کی آتش شرک کے شعلوں سے ہراساں نہ ہوں اور ابراہیمؑ کی طرح پورے اطمینان کے ساتھ اس میں کود پڑیں تاکہ شرک کے شعلوں کو ٹھنڈا کر کے انہیں گلستان توحید میں بدل دیں۔ نوحؑ کی طرح معرفت الٰہی کی نجات بخش کشتی پر سوار ہوں اور جو اس کے غیر کی بات کرتا ہے اس کے علاوہ کسی اور کی طرف دعوت دیتا ہے۔ خواہ وہ کوئی کنعان ہی کیوں نہ ہو۔ اسے طوفان میں غرق کر دیں۔ ہر سامری کا سر پوری قوت سے کچل دیں اس کے چمکتے دمکتے طلائی بت کو اپنے جذبہ صادق کی آگ میں جلا دیں جو دنیا پرستوں اور تشنہ ثروت میں بدمست لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔

ہاں......انبیاء الٰہی نے اپنی ''ظاہری'' تبلیغ میں......معرفت خدا کے حصول کا......جو فریضہ انجام دیا۔ ان کی راہ پر چلنے والے منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے وہی کام اپنے ''باطن'' میں انجام دیتے رہے بالآخر انہوں نے پیغمبر اسلامؐ کی حیات بخش

ندائے حق وحقیقت اور صدائے سعادت وخوش بختی......قولو لا اله الله تفلحوا... پر لبیک کہہ کرانہوں نے اپنے وجود کے ہر جز یہاں تک کہ شہ رگ اور شریانوں میں بھی اس حیات آفریں اور روح پرور ندا کو جگہ دی اور فلاح وکامیابی کے بلند مقامات تک پہنچ گئے۔

اس طرح ان لوگوں نے اس الٰہی سفرِ سعادت ......سیر وسلوک ......کی بدولت سرائے طبیعت سے نکل کر کوئے حقیقت اور مقامِ قرب الٰہی کی راہ پالی۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس راہ میں بڑے نشیب وفراز اور پیچ وخم ہیں اس کی ہر گزرگاہ میں شیطاطین جن وانس گھات لگائے بیٹھے ہیں جو اپنی ملمع سازیوں اور فریب کاریوں سے رہروان راہِ حقیقت کو منحرف کرنے میں کوشاں ہیں۔ وہ اس لیے کہ ان کے پیشوا ابلیس نے ابتداء ہی سے اولاد آدم کو گمراہ کرنے کی قسم کھالی اور جس طرح وہ خود راندہ درگاہ الٰہی ہوا...... چاہتا ہے کہ ان سب کو بھی اپنا ہمدم اور ہم رنگ بنالے۔

لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنے والے بد باطن افراد اپنے مکروہ چہرے چھپا کر......عرب کے آوارہ منش اور بدکردار اشخاص کی طرح دکھاوے کیلئے چند یوم صحیح راستے پر چلتے ہیں۔ جب ایک گروہ کو اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں تو ''صراطِ مستقیم '' سے منحرف ہو جاتے ہیں اور اپنے ساتھ والوں کو ''ضالین'' ......گمراہوں ......اور ''مغضوب علیھم'' ......خدا کے غضب کا شکار ہونے والوں ......کی ہولناک اور وحشت آور وادی میں دھکیل دیتے ہیں۔

اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

اور نجات کا راستہ کہاں ہے؟

کیا ہم اپنے عقلی قوت کا سہارا لے کر اس ......نہایت دشوار گزار ...... راستے کو طے کرسکتے ہیں؟ اگرچہ عقل ،خداداد وسیلوں میں ایک وسیلہ اور انوار الٰہی میں سے ایک نور ہے!...... یا ہمیں چاہیے کہ وحی کے رہوار پر سوار ہو کر آسمانِ معرفت کی طرف پرواز کرجائیں اور چراغ محدود کی روشنی سے آگے نکل کر تابندہ سورج کی جانب ہاتھ بڑھائیں کہ اسی ...... خدا......سے مدد طلب کرتے ہوئے اس تک پہنچیں اور اسی ذات کو اس پر دلیل قرار دیں؟ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں وارد ہوا ہے۔

من ابتغی العلم فی غیر القراٰن اضلہ اللہ

''جو شخص قرآن کے علاوہ کسی سے علم وہدایت حاصل کرنا چاہے تو خدا اسے گمراہی کے راستے پر ڈال دے گا۔''

کیا اس کا غیر، اس کی حقیقی معرفت رکھتا ہے تاکہ وہ دوسروں کو بھی اس سے بہرہ مند کر سکے...... ہرگز نہیں:

ہماری یہ کتاب......تفسیر موضوعی، پیام قرآن......کی تفسیر جلد، درحقیقت حق کی پہچان کے سلسلے کی ایک کوشش ہے اور اس کتاب کا مقصد معرفت الٰہی کے حصول کی راہ میں گوناگوں ذریعوں سے استفادہ کرنا ہے۔اس ضمن میں ہم اپنے دلائل کی پختگی کے لئے آیات وحی کا سہارا لیں گے اور مختلف آیات قرآنی سے رہنمائی حاصل کریں گے عقلی فیصلے کی تائید میں احادیث وروایات بھی پیش کریں گے۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ قم......محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی

۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی

۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی

۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی

۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی

۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی

کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ

مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ، لَا سَيَّمَا

الإمام الْمَهْدِی الْمُنْتَظَر، اَرْوَاحنا فداه۔

# معرفتِ خدا کے راستے

اگرچہ معرفت کردگار کے راستے محدُود نہیں، بلکہ بعض صاحبانِ علم وفہم کے بقول معرفتِ خدا کے راستے مخلوق کی تعداد کے برابر ہیں۔

"الطرق الی اللہ بعدد نفوس الخلائق۔"[1]

''خدا کی معرفت اور پہچان کے راستے مخلوق کی تعداد کے برابر ہیں۔''

البتہ خدا کی مقدس ذات کے اثبات کے لیے بنیادی طور پر پانچ عقلی اور ایک فطری راستہ ہے۔

معرفتِ خدا کے عقلی راستے (دلیلیں) یہ ہیں۔

۱۔ برہانِ نظم

۲۔ برہانِ حرکت

۳۔ برہان وجُوب وامکان (غنیٰ وفقر)

۴۔ برہانِ علّت ومعلول

۵۔ برہانِ صدیقین

معرفتِ خدا کا چھٹا راستہ (دلیل) فطرت، عالم باطن کا مطالعہ اور انسانی رُوح کی گہرائیوں میں خدا کی تلاش ہے!

---

[1] بعض اہلِ دانش نے اس جملے کو یوں ذکر کیا ہے: الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق، یعنی انسان کے ہر سانس میں خدا کی معرفت کا راستہ ہے، بہر حال یہ جملہ حدیث کے طور پر کسی مستند کتاب میں نہیں مل سکا۔ بلکہ یہ اربابِ علم و دانش ہی کا قول ہے۔

# (ا) برہانِ نظم

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن نے ان براہین سے کام لیا ہے، لیکن ان سب میں وسیع ترین برہان کہ جسے قرآن نے مخالفین کے سامنے پیش کیا ہے، وہ ''برہانِ نظم'' ہے۔ یہ دلیل و برہان اس لازوال سرچشمۂ فیض کے وجود اور اس کے علم وقدرت کو تخلیق کائنات کے عظیم شاہکاروں، جہانِ ہستی کے عجائبات اور اس کے دلچسپ نظام کے ذریعے ثابت کرتی ہے۔ اس دلیل (یعنی برہانِ نظم) کی وسعت و ہمہ گیری کی وجہ سے......تفسیر موضوعی، پیامِ قرآن......کی دوسری جلد اس برہانِ نظم کے بیان اور اس کے جملہ پہلوؤں کے ذکر کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔

اب ہم وجودِ خداوند متعال کے اثبات سے متعلق دیگر آیاتِ قرآن کا ذکر کرتے ہیں اور پھر قرآنی ہدایت و رہنمائی کی روشنی میں ''فطرت'' کے بارے میں بحث کریں گے۔

مذکورۂ بالا مطالب......پیامِ قرآن......کی زیرنظر تیسری جلد کے مباحث کی ایک اجمالی تصویر ہے۔

تاکید و تکرار کے طور پر ہم ایک بار پھر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا مسائل نہ فلسفی بحثوں کی طرح اور نہ ہی اعتقادی و کلامی بحثوں کی صورت میں پیش کیے جائیں گے۔ بلکہ اس کتاب کے عنوان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر بحث ''تفسیر موضوعی'' کی شکل میں ہوگی، یعنی ہر مقام پر ہمارا سفرِ بحث آیاتِ قرآن کے سائے میں ہوگا اور ہم خدا کے اس نور سے بھرپور استفادہ کریں گے۔ اگر ہم کچھ دوسرے مطالب کا بھی ذکر کریں تو وہ علیحدہ عنوان......توضیحات......کے تحت ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ ان تمام بحثوں کا مقتضائے طبع کچھ اور نہیں ہے......یعنی اگر ہم اس روش کو نہ اپنائیں تو ''تفسیر'' کے دائرے سے نکل جائیں گے۔

# (۲) برہانِ تغیر و حرکت

## اشارہ

جس دنیا میں ہم زندگی گزار رہے ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ معرضِ تغیر و تبدل میں ہے، یہاں کوئی چیز ایک حال پر نہیں رہتی بلکہ تمام موجودات شاہراہِ تغیر پر گامزن ہیں۔ ایسے عالم میں انسانوں، حیوانوں اور درختوں کی زندگی کا تغیر و تبدل و جنبش و حرکت کے ساتھ آمیختہ ہونا اس قدر واضح ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے وجود میں یا مادی دنیا کی دوسری موجودات میں اس تغیر و تبدل کا انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان شب و روز اس تغیر و تبدل کے مختلف پہلوؤں کا مشاہدہ کرتا ہے، بلکہ آنے جانے والی یہی دو چیزیں یعنی دن اور رات......اس دنیا کے تغیر و تبدل کی نہایت واضح اور روشن مثالیں ہیں۔

یہ تغیر و تبدل اور تحرک جو کائنات کے ظاہر و باطن پر حکم فرما ہے، اس حقیقت کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے کہ اس جہان میں ایک ایسا ''ثابت'' اور مضبوط واحد مرکز موجود ہے جو ان تمام تغیرات و تحرکات کا سرچشمہ ہے اور سب پرکار کی طرح اس کے گرد گھومتے ہیں۔

اصولی طور پر یہ بات ناقابل انکار ہے کہ موجودات میں تغیر و تبدل اور حرکات و تحرک کا پایا جانا ان کے ''حادث'' اور نو پید ہونے کی دلیل ہے۔ ان کا حدوث اور نو پید ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا کوئی خالق ہے، جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ خدا کے وجود پر دلیل قائم کرنے کا یہ اسلوب (جس کی وضاحت آنے والی بحثوں میں کی جائے گی) ایک خاص سادگی کے ساتھ قرآنی آیات میں اپنایا گیا ہے۔

اس اشارے کے بعد اب ہم دوبارہ قرآن کی طرف رُخ کرتے ہیں اور درج ذیل آیات پر بھرپور طریقے سے غور کرتے ہیں۔

۱۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۷۵ ﴿الأنعام:۷۵﴾

۲۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا، قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ۷۶ ﴿الأنعام:۷۶﴾

۳۔ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ، فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ۷۷ ﴿الأنعام:۷۷﴾

۴۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ، فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۷۸ ﴿الأنعام:۷۸﴾

۵۔ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿الأنعام: ۷۹﴾

۱۔ اس طرح ہم نے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت دکھائے تاکہ وہ اہلِ یقین میں سے ہو جائے۔

۲۔ جب رات...... کی تاریکی...... اس پر چھا گئی تو اس نے ایک ستارے کو دیکھا تو کہا۔ یہ میرا رب ہے، لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو کہا کہ میں غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۳۔ اور جب اس نے چاند کو دیکھا کہ وہ سینۂ افق کو چیر کر نکلا ہے...... تو اس نے کہا، یہ میرا پروردگار ہے، لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا، تو کہا، کہ اگر میرا (حقیقی) رب میری ہدایت و رہنمائی نہ کرے تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا۔

۴۔ پھر جب اس نے سورج کو دیکھا کہ وہ سرخیٔ افق سے ابھرا اور اپنی خاص چمک دمک کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے تو کہا، یہ میرا رب ہے کہ یہ تو سب سے بڑا ہے، مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا کہ اے لوگو! میں ان شریکوں سے بہت ہی بیزار ہوں جنہیں تم خدا کے لیے قرار دیتے ہو۔

۵۔ میں نے تو اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، میں اپنے ایمان میں مخلص ہوں اور میں شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں ہوں۔

## مفردات کی تشریح

۱۔ ''اَفَلَ'' اور ''اَفَلَتْ'' کا مادہ ''افول'' ہے، اہلِ لغت میں سے چند ماہرین کہتے ہیں کہ اس کے معنی ''پوشیدہ ہونا ہے، لیکن راغب اصفہانی نے ''المفردات'' میں زیادہ باریکی سے کام لیتے ہوئے کہا ہے:

''افول'' کا معنیٰ نورانی اجسام مثلاً سورج، چاند وغیرہ کا پوشیدہ ہونا ہے، صحیح بات وہی ہے جو راغب اصفہانی نے کہی ہے۔ کیونکہ جب بھی ''افول'' کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کا یہی مطلب (نورانی اجسام کا غروب ہونا) سمجھا جاتا ہے، البتہ بعض مقامات میں کنایہ کے طور پر دوسری چیزوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کسی بزرگ عالم کی وفات کو ''افول'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یوں حقیقت میں اس عالم کو سورج یا ستارے کے ساتھ تشبیہ دے کر ''افول'' کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے، ''افول'' یا غروب ہونے کے

الفاظ کا یہ استعمال صحیح ہے۔

۲۔ ''بازغ'' اور ''بازغۃ'' کا مادہ ''بزوغ'' ہے، جس کا معنی طلوع اور نور کا پھیلاؤ ہے، کتاب ''المفردات'' میں راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ ''بزوغ'' اصل میں علاج کی غرض سے خون حیوان جاری کرنے کے معنی میں آتا ہے۔لیکن بعد میں اسے ''طلوع'' کے معنی میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔

لغت کی مشہور کتاب ''لسان العرب'' میں ابن منظور نے لکھا ہے کہ لفظ ''بزوغ'' اصل میں ''چیرنے'' کے معنیٰ میں آتا ہے، لیکن بعد میں اسے انسان یا حیوان کی رگوں کو علاج کی غرض سے چیرنے اور شگافتہ کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، چونکہ طلوعِ فجر وغیرہ بھی تاریکی شب کے پردے کو چاک کرتا ہے، اس لیے وہاں بھی یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ (اس استعمال کی باریکی پر غور کیجئے)۔

۳۔ ''کوکب'' کا مادہ ''وَکَبَ'' یا ''کَوَبَ'' ہے۔اکثر اہلِ لغت نے اسے ''ستارہ'' کے معنی میں استعمال کیا ہے لیکن راغب نے ''المفردات'' میں اسے ''ستارہ بوقت طلوع'' کے لیے ذکر کیا ہے۔بعض ارباب دانش نے اس سے خاص طور پر ستارۂ زہرہ مراد لیا ہے، اس لیے کہ وہی اس کا واضح مصداق ہے، کیونکہ زہرہ ایسا ستارہ ہے جو تمام آسمانی ستاروں میں سب سے زیادہ درخشندہ اور روشن ہے۔

لفظ ''کوکب'' کبھی خوبصورت اور نوجوان افراد کے لیے یا کسی چیز کے نہایت اہم حصے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی گروہ کے سربراہ اور بزرگ شخصیت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، لیکن یہ سب استعمالات مجازی ہیں۔

۴۔ ''قمر'' اگرچہ عام طور پر چاند کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس مقام پر ایک خاص نکتہ ملحوظ رہے کہ بہت سے اہل لغت نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ لفظ ''قمر'' ہر مہینے کی تیسری رات سے پانچویں رات تک کے چاند کو کہتے ہیں۔ لہٰذا پہلی دو راتوں اور آخری دو راتوں کے چاند کو ''قمر'' نہیں کہا جاتا بلکہ ''ہلال'' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اہل لغت ''قمر'' اور ''قمار'' کو ایک ہی اصل سے سمجھتے ہیں اور معنی ہے ''غلبہ کرنا'' چھا جانا۔۔۔ چونکہ چاند کی روشنی تیسری رات کے بعد دوسرے ستاروں پر غالب آتی ہے۔ لہٰذا لفظ ''قمر'' اس کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔[1]

۵۔ ''شمس'' اگرچہ اس لفظ کا مشورہ عام معنی سورج ہے، لیکن اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ عربی زبان میں قرص آفتاب کو ''شمس'' کہتے ہیں اور اس سے پھوٹنے والی روشنی کو بھی شمس کہتے ہیں۔ چونکہ سورج آسمان میں ایک جگہ ثابت وقائم نہیں بلکہ متحرک ہے اور (اہل زمین کی نظر میں) ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ اس لیے یہ لفظ ان افراد اور حیوانات کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو ایک جگہ نہیں ٹھہرتے بلکہ ہمیشہ متحرک رہتے ہیں۔ چنانچہ سرکش اور منہ زور جانوروں کو ''شموس'' کہا جاتا ہے۔

---

[1] لسان العرب، مفردات، راغب، کتاب العین

# تفسیر اور اہم مطالب پر ایک نظر

## بت پرستوں کے مقابلے میں حضرت ابراہیم کا مضبوط استدلال

پہلی آیت میں ابراہیمؑ کو آسمان و زمین کے ملکوت دکھانے کا تذکرہ ہے کہ ان کے مشاہدے سے ان کی روحِ یقین کو زندگی ملے اور ان کے فطری ایمان میں تازگی آ جائے۔

اس سلسلے میں خداوند عالم کا فرمان ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿الأنعام: ٧٥﴾[1]

''اور اسی طرح ہم نے دکھائے ہیں ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت، تاکہ وہ اہل یقین میں سے قرار پائیں۔

آسمانوں اور زمین کے ملکوت کا مشاہدہ کروانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس جہان مادی کی تغیر پذیر موجودات کو دیکھ کر کائنات ہستی پر خدا کی حاکمیت کا نظارہ کر لیں۔ کیونکہ ''ملکوت'' عربی زبان میں ''ملک'' سے ہے جس کا معنیٰ حکمرانی اور مالک ہونا ہے الفاظ میں ''وت'' کا اضافہ تاکید کے لیے ہے۔

کائنات پر خدا کی حاکمیت مطلقہ اور مالکیت مسلمہ کا تذکرہ بعد والی آیات میں ہوا ہے۔ درحقیقت ان آیات میں اجمالی اور تفصیلی دونوں طرح سے مطالب کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز اہم مطالب کے بیان و تشریح میں قرآنی روش یہی ہے کہ پہلے اجمالی طور پر بات ہوتی ہے تاکہ سننے والا تفصیلی بیان کے گوش بر آواز ہو جائے۔ اس کے بعد کسی مطلب کی تشریح وضاحت کی جاتی ہے چنانچہ ''فلما'' کے لفظ میں ''ف''......کہ جو تفریع کے لیے ہے......اسی قرآنی طریقے اور روش کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے۔

بہرحال بعد والی آیت میں اس اجمال کا تفصیل بیان موجود ہے......اسی قرآنی طریقے اور روش کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے۔

بہرحال بعد والی آیت میں اس اجمال کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ سب سے پہلے ستاروں کا تذکرہ ہے اور ستارہ پرستوں کے مذہب و نظریے کی نفی و تردید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے استدلال کا اس طرح سے ذکر کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ﴿الأنعام: ٧٦﴾

[1] بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں تشبیہ (اسی طرح) کا مقصد یہ ہے کہ اسے ہمارے نبی (محمدؐ) جس طرح سے آپ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت دکھائے گئے اسی طرح ابراہیم کو بھی دکھائے گئے، (گویا اس آیت میں ایک جملہ مقدور پوشیدہ ہے، یعنی جس طرح سے

''جب رات۔کی تاریکی۔اس پر چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے۔''

اس آیت میں ''راکوکباً'' (ستارہ دیکھا) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ (کوکب) سے مراد نہایت روشن ستارہ ہے کہ جس نے ابراہیمؑ کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ورنہ رات کے وقت تو ان گنت ستارے اپنا جلوہ دکھا رہے ہوتے ہیں۔ان سب میں سے کسی ایک کا خصوصی طور پر مشاہدہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں ایک خاص ستارہ مقصود ہے۔اس تائید کے لیے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ''زہرہ'' ابتداءِ شب میں طلوع ہوتا ہے اور ''کوکب'' کا لفظ ''ستارہ بوقت طلوع'' کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس سے اکثر مفسرین کرام کے نظریات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ اس ستارے سے مراد ''زہرہ'' یا ''مشتری'' ہے اتفاق کی بات یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں ان دوستاروں کو بھی خدا تصور کیا جاتا تھا۔اور لوگ ان کی پوجا کرتے تھے۔جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ جس ستارے کی طرف اشارہ کر کے حضرت ابرہیمؑ نے اس کے خدا ہونے کی بات کی......وہ ستارۂ زہرہ تھا۔

بہرحال تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ ستارہ غروب ہوگیا۔اس وقت حضرت ابرہیمؑ نے کہا......جو چیز غروب ہوجائے میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتا، (عبادت کے قابل نہیں سمجھتا)۔

قرآن نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۷۶﴿الأنعام:۷۶﴾

دوسری مرتبہ ابراہیمؑ چاند کی طرف متوجہ ہوئے کہ جو پردہ افق سے نکل کر روشنی بکھیرنے لگا تھا اور اپنے خوبصورت اور دلکش نور سے آسمان وزمین کو منور کررہا تھا......اسے دیکھ کر ابراہیمؑ نے کہا یہ میرا پروردگار ہے فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ﴿الأنعام:۷۷﴾۔

لیکن زیادہ دیر نہ گزری کہ اس کا انجام بھی کوکب (ستارے) جیسا ہوا اس نے افق مغرب میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور آسمان کو ایک بار پھر گھپ اندھیرے ڈال دیا۔ابراہیمؑ جو معبود حقیقی کی تلاش میں تڑپ رہے تھے اور اسے پالینے میں پوری طرح کوشاں تھے، اس وقت انہوں نے کہا: اگر میرا پروردگار میری رہنمائی نہ کرے تو یقینا میں گمراہ لوگوں میں شامل ہوجاؤں گا۔ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ۷۷﴿الأنعام:۷۷﴾۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اس عمل سے واضح کیا کہ حق تک پہنچنے کے لیے صرف انسان کو اپنی کوشش ہی کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ خدائی توفیق اور مدد بھی شاملِ حال ہوتا کہ انسان گمراہوں کی صف میں مل جانے سے محفوظ رہے۔یہ بات ہر لحاظ سے ناقابل انکار ہے۔کہ خدائی توفیق واعانت صرف انہیں کو حاصل ہوتی ہے جو حق کی طلب سچے دل سے کرتے ہیں۔اور دل وجان سے خدا کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

بالآخر رات ڈھل گئی اور اس نے اپنے تاریک دامن کو سمیٹ کر آسمانی فضا سے فرار کی راہ اختیار کرلی، اچانک سورج نے اپنے چمکتے دمکتے چہرے کو افق مشرق سے ظاہر کیا اور اپنی سنہری کرنوں کو پہاڑوں اور میدانوں پر بکھیر دیا۔قرآن نے اسے یوں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ﴿الأنعام:۷۸﴾ [1]

''پس جب اس نے چمکتے دمکتے سورج کو دیکھا تو کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے، یہ تو سب سے بڑا ہے۔لیکن جونہی دن ختم ہوا سورج تاریکی شب میں ڈوب گیا اور اس نے اپنے چہرے پر مغرب کی نقاب ڈال لی، تو ابراہیم سے رہا نہ گیا اوہ پکار کر کہنے لگے اے لوگو! جن کو تم پروردگار حقیقی کے ساتھ شریک قرار دیتے ہو میں ان سے بری و بیزار ہوں۔فلما افلت قال یاقوم انی بری مما تشر کون۔ میں ان سب کے غروب ہونے اور مخفی ہوجانے سے اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ یہ سب مخلوق ہیں اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ ایسی مخلوق ہیں جو قوانین خلقت وآفرینش کے سامنے بے بس ہیں اور ہر لحہ تغیر اور افول وغروب کے مقررہ اصول انہیں اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ان کی حالتیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس تمام صورت حال کے پیچھے ایک ایسی عظیم قوت موجود ہے۔جس کے بارے میں افول وغروب کا تصور ہی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس پاک ذات میں کسی قسم کے تغیر وتبدل کی کوئی گنجائش ہے......پھر فرمایا:......

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۷۹﴿الأنعام:۷۹﴾

''میں نے اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کرلیا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں اپنے ایمان وعقیدے میں پختہ اور سچے دل کے ساتھ قائم ہوں اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

اب سوال یہ ہے کہ یہ تینوں واقعات (ستارے، چاند اور سورج کا دیکھنا اور ان کے بارے میں اظہار خیال) ایک ہی رات میں رونما ہوئے یا دوراتوں میں؟؟ اس سلسلے میں بعض مفسرین نے ان تینوں واقعات کے ایک ہی رات میں رونما ہونے کو اچھی طرح نہ سمجھنے کے باعث کہا کہ یہ دوراتوں میں رونما ہوئے ہیں جب کہ آیاتِ کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ سب واقعات پے درپے اور ایک ہی رات اور دن میں ہوئے ایسا ہونا ممکن بھی ہے کیونکہ مہینے کے درمیانے حصے (دنوں) میں رات کو پہلی گھڑیوں ہی میں ستارہ زہرہ افق مغرب میں واضح طور پر نظر آتا ہے پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد غروب ہوجاتا ہے۔اس کے بعد چاند اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ افق مشرق سے جلوہ گر ہوتا ہے(آیت میں چاند کے لیے بازغ''لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بدر کامل یا اس کے نزدیک تھا) ایسے میں جب چاند افق مغرب میں چھپ جاتا ہے تو اس کے تھوڑی دیر بعد سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے لہٰذا یہ تینوں واقعات ایک ہی رات دن میں وقوع پذیر ہوئے تھے۔

بہرحال یہ بات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی غور طلب بات یہ ہے کہ ابراہیم جیسی عظیم شخصیت علم وعرفان کے بلند مقام پر فائز ہونے

---

[1] اگرچہ لفظ شمس مونث مجازی ہے اور''ھذا'' کی بجائے''ھذہ'' کہنا چاہیے۔لیکن عبارت میں مذکر ومونث کی بابت کوئی مشکل درپیش نہیں آتی۔ لہٰذا اس مقام پر ممکن ہے کہ ھذا کا اشارہ''الموجود'' یا''المشاھد'' دیکھا جانے والا۔ کی طرف ہو۔

کے باوجود۔ جبکہ یہ بھی مسلم امر ہے کہ انبیاء اکرام احبشت سے پہلے ہی عصمت کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ آپ اپنی زبان پر ایسے کلمات لائے کہ جو بظاہر شرک سے بھرے ہوئے ہیں؟

اس سوال کا جواب دوطرح سے دیا جاسکتا ہے۔

(۱) آیات کے ذیل میں ابراہیمؑ کا یہ ارشاد کہ اے لوگو! جن کو تم خدا کے ساتھ شریک قرار دیتے ہو، میں ان سے بری و بیزار ہوں۔ (یاقوم انی بری مماتشرکون)۔اس بات کی دلیل ہے کہ آنجنابؑ مشرکین کے ساتھ بحث وگفتگو اور مناظرے کے ماحول میں تھے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ بابل میں ستارہ، چانداور سُورج کی پوجا کرنے والے لوگ موجود تھے،اس صورت میں ایک سمجھ دار استاد اور بحث ومباحثہ کا ماہر شخص جو متعصب اور ضدی قسم کے مخالفین کے مقابل ہوتو وہ ان کے اعتقادات کی مخالفت میں کسی قسم کی جلد بازی سے کام نہیں لیتا مقابل ہوتو وہ ان کے اعتقادات کی مخالفت میں کسی قسم کی جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ عارضی طور پر ان کے ساتھ چلتا ہے اور ظاہری طور پر ان کا ہمنوابن کر اپنے مقصد کے حصول کی خاطر قدم قدم آگے بڑھتا ہے اور پھر ان پر غلبہ پالیتا ہے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے ان کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئے اور جو کچھ وہ کہتے تھے ابراہیم نے بھی وہی کیا تا کہ ان کے عقیدے کی غلطی اور کمزوری کو ستارے، چانداور سُورج کے غروب ہونے کے وقت ظاہر کرسکیں۔ بحث ومباحثے کا یہ طریقہ نہایت موثر پائیدار اور دل موہ لینے والا ہے۔لہٰذا اسے کسی صورت میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے بلند مقام ومرتبہ اور توحید ومعرفت میں ان کے پختہ اعتقاد کے منافی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس سلسلے میں ایک روایت بھی موجود ہے۔

مامون الرشید عباسی کو جو ان آیات کو انبیاء کی عصمت کے منافی سمجھتا تھا۔ امام علی رضا علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا......حضرت ابراہیمؑ کا مقابلہ تین قسم کے مشرکین سے تھا،ایک گروہ ستارۂ زہرہ کی پوجا کرتا تھا۔ دوسرا اگروہ چاند کو اپنا خدا مانتا تھا اور تیسرا اگروہ سورج کو پرستش کرتا تھا لہٰذا ابراہیمؑ نے ان سب کے ساتھ ایسی گفتگو کی جس کا مقصد استفہام واستخبار کے سوا کچھ نہ تھا (انہیں سمجھانا مقصود تھا)[1]

(۲) حضرت ابراہیمؑ نے یہ سب باتیں (ستارے، چانداور سورج کی خدائی کے) ایک مفروضے کے تحت کی ہیں اور یہ محققین کا عام طریقہ ہے یعنی جب کوئی کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں میں تحقیق کرنے لگتا ہے تو وہ ہر پہلو کو فرض کرکے غور کرتا ہے۔ چنانچہ کوئی شخص کسی بات سے وجدانی دلائل اور فطری شواہد کی بنیاد پر آگاہ ہوتو وہ ایک امر سے مطلع تو ہوجاتا ہے لیکن اس کے دل میں اس عقلی دلیل قائم کرنے کا جذبہ موجزن رہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ اسے معلوم ہو چکا ہے۔ اسے عقل کے آئینے میں بھی دیکھ لے۔ لہٰذا وہ اس امر کی بابت ہر طرح کا تصور کرتا ہے۔ ہر پہلو پر غور کرتا ہے۔ اور ہر پہلو کی بنیاد پر تحقیق کرتا ہے۔ پھر اس تحقیق وتدقیق کے نتیجے میں عقلی دلائل مرتب کرلیتا ہے۔ مثلاً جو محقق وجدانی کے طور پر رُوح کی اصل کو سمجھ لیتا ہے کہ یہ مادی چیز نہیں ہے تاہم وہ اس سلسلے

---

[1] عیون اخبار الرضا (خلاصہ بمطابق تفسیر المیز ان جلد ۷ صفحہ ۲۱۴۔

میں عقل دلیل بھی قائم کرنا چاہتا ہے لہٰذا وہ سب سے پہلے یہ فرض کرتا ہے کہ روح ایک مادی چیز اس میں مادہ یا اس میں مادہ کے خواص پائے جاتے ہیں۔ پھر مادہ اور اس کے خواص والوازم کے بارے میں سے مبرا ایک (مجرد) حقیقت ہے۔ اسی اصول اور طریقہ تحقیق کے مطابق حضرت ابراہیم بھی توحید اور خدا کی یکتائی کو عقلی و منطقی طور پر ثابت کرنے کے لیے (جب کہ ان کا دل توحید کی پاکیزہ روشنی سے بھرا تھا) مختلف پہلوؤں کو فرض اور تصور کرنے کے طریقے سے کام لیا اور...... ھذا ربی...... ھذا ربی کہتے رہے۔ تاکہ ان (ستارے چاند اور سورج) کے افول وغروب کو بنیاد قرار دے کر ان کے بارے میں خدائی کے اعتقاد کی نفی کر سکیں یہاں تک کہ انہوں نے ''اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ'' کہہ کر عقلی و منطقی طور پر توحید کو ثابت کر [1] د

بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہوا ہے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ کہ آپ نے فرمایا: انبیاء کی بعثت سے پہلے لوگ ہدایت کی راہ پر گامزن نہ تھے اگرچہ وہ فطری طور پر توحید سے آشنا تھے۔ لیکن اس فطری حقیقت کی پہچان کرائیں اور ہدایت کی منزل پر فائز کریں۔ (پھر فرمایا) کیا تم نے حضرت ابرہیمؑ کا یہ قول نہیں سنا کہ اگر خدا مجھے ہدایت نہ کرے تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا۔ یعنی فطری عہد و پیمان کو بھول جاؤں گا (لئن لم یہدنی ربی لا کونن من القوم الضالین) [2]

بہر حال آیات کریمہ اور قول امام رضا علیہ السلام کی روشنی میں پہلا جواب زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

## افول اور حدوث کا باہمی تعلق:

حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں، چاند اور سُورج کے افول وغروب کے ذریعے ان کی خدائی کی نفی کی اور کہا: اس قسم کے موجودات کا خدا ہونا ہرگز ممکن نہیں اور یہ کائنات کے پروردگار نہیں بن سکتے۔

سوال یہ ہے کہ افول وغروب اور عدمِ الوہیت (خدا نہ ہونے) میں کیا ربط و تعلق ہے؟

اس سوال کا جواب مختلف پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے۔

''افول'' اور غروب تغیر و تبدیلی کی علامت ہے بلکہ یہ خود ایک قسم کی تغیر ہے...... کسی چیز میں تغیر و تبدیلی اس کے ناقص ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ کیونکہ جو چیز ہر لحاظ سے کامل اور ہر پہلو سے مکمل ہو اس میں نہ تو کسی قسم کی تبدیلی اور نہ ہی حرکت کا تصور ہو سکتا ہے۔ (فلسفی اصطلاح میں حرکت کا مطلب ایک حالت سے دوسری حالت اختیار کرنا ہے) اس لیے کہ وہ (کامل) نہ کسی چیز سے محروم ہوتا ہے اور نہ ہی کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود کمال مطلق ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تمام متغیر اور متحرک موجودات ناقص ہیں،

---

[1] ان آیات کی تفسیر میں کئی دیگر احتمالات بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو استفہام انکاری یا استفہام استہزائی پر مبنی تھی۔ چنانچہ تفسیر تبیان اور تفسیر رازی میں کئی ایک احتمالات ذکر کیے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی آیت کے انداز سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۷۳۶ حدیث ۱۴۸۔

وہ یا تو کسی کمال سے محروم ہوتے ہیں، یا کسی نئے کمال کے حصول میں کوشاں ہوتے ہیں، بنابریں کوئی ناقص شے واجب الوجود نہیں ہوسکتی۔

(۲) جو چیز افول وغروب رکھتی ہو۔ وہ ہمیشہ حوادث کی زد میں ہوتی ہے، یعنی اس پر نت نئے حوادث عارض ہو سکتے ہیں، جو چیز اس طرح کی ہو وہ قدیم، ازلی اور واجب الوجود نہیں ہوسکتی...... کیونکہ اس سے "حدوث" اور "ازلیت" کا یک جا ہونا لازم آئے گا کہ جو ممکن نہیں جب کہ حدوث اور ازلیت کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے (غور کریں)

(۳) ہر حرکت کسی محرک کی محتاج ہوتی ہے اگر وہ محرک (حرکت دینے والا) خود متحرک ہو تو پھر کسی اور محرک کی ضرورت ہوگی کہ جو متحرک نہ ہو، اسی طرح محرک کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس محرک کے وجود کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ جس میں مطلقاً حرکت نہ پائی جائے۔

(۴) ہر حرکت اور خاص طور پر افول کی طرف جانے والی حرکت اس بات کی علامت ہے کہ مادی دنیا کی طرف رواں دواں ہے (اس کا ذکر بعد میں ہوگا)...... جو چیز رو بہ فنا ہو وہ ہرگز ابدی نہیں ہوسکتی اور ایسی چیز ازلی بھی نہیں ہوتی، لہٰذا وہ واجب الوجود بھی نہیں ہوسکتی۔

مذکورہ بالا چاروں پہلو حضرت ابراہیمؑ کے استدلال کی بنیاد قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بیانات ان سب کی طرف لطیف اشارہ کے طور پر ہوں۔

فخر الدین رازی نے بعض محققین کا یہ قول نقل کیا ہے: "حضرت ابراہیمؑ کا استدلال اس قدر بلند پایہ اور جامع ہے کہ اس سے خواص، متوسط اور عوام سبھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

خواص (دانش منداور صاحب فکر افراد) "افول" سے "امکان" کی حقیقت کو سمجھیں گے...... پھر یہ کہ ہر ممکن الوجود چیز خالق کی محتاج ہوتی ہے، اگر وہ خالق بھی ممکن الوجود ہو تو اس کے لیے کسی اور خالق کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح یہ سلسلہ وہاں تک جا پہنچے گا جہاں "امکان" (ممکن الوجود ہونا) نہ پایا جائے جیسا کہ سورۂ نجم کی آیت ۴۲ میں ارشاد ہوا: وان الی ربک المنتھی۔ یعنی آخر کار تیرے پروردگار تک پہنچنا ہے۔"

متوسط طبقہ کے افراد اس استدلال سے اس طرح استفادہ کریں گے کہ "افول" اور غروب مطلق حرکت کی نشاندہی کرتا ہے، ہر متحرک حادث ہوتا ہے اور ہر حادث اپنے وجود میں ایک قدیم وازلی ذات کا محتاج ہوتا ہے۔

عوام الناس اس بیان سے یوں استفادہ کریں گے کہ وہ "افول" کا معنی "غروب" قرار دیں گے اور پھر اس بات کا مشاہدہ کریں گے کہ سورج اور چاند اور ستارے غروب ہونے کے وقت مدہم پڑ جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ محو ہوجاتے ہیں، پھر ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا، کائنات پر ان کی حکمرانی کا دور ختم ہوجاتا ہے اور جو چیز ایسی ہو وہ الوہیت اور خدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ لہٰذا ابراہیم کے استدلال وبیان میں "لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ" ایسا جامع جملہ ہے کہ جس سے مقربین، اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال...... سبھی استفادہ کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ نہایت بلند پایہ اور مکمل دلیل وبرہان ہے [1]

---

[1] فخر الدین رازی، تفسیر کبیر جلد ۱۳ صفحہ ۵۲۔

اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے ان ستاروں کے ''طلوع'' کو اپنے استدلال کی بنیاد کیوں قرار نہیں دیا جبکہ طلوع وغروب دونوں ہی حرکت کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''زوال وفنا'' نیستی ونابودی اور فیض وبرکت کا منقطع ہونا...... ''غروب'' میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جب کہ ''طلوع'' میں یہ بات ہرگز نظر نہیں آتی...... لہٰذا فصاحت اور بلاغت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ''غروب'' ہی کو استدلال کی بنیاد قرار دیا جائے اور اسی کے ذریعے استدلال قائم کیا جائے تاکہ مسئلہ پورے طور پر واضح ہوسکے اور سب کے لیے قابل قبول ہو، اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ حرکت کی کئی قسمیں ہیں (جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا) ان تمام قسموں میں سب سے واضح مکانی حرکت (ایک سے دوسری جگہ منتقل ہونا) ہے اور آیت میں اسی سے استدلال کیا گیا ہے (البتہ اس مقام پر مکانی حرکت اور کیفی حرکت دونوں آپس میں ملی ہوئی ہیں، کیونکہ ان اجرام (سورج، چاند اور زہرہ) کے نور کی کیفیت، حرکت کے ساتھ بدل جاتی ہے، چنانچہ غروب کے وقت ان کی روشنی کم ہوتی ہے، پھر اس سے بھی کم ہوجاتی ہے، یہاں تک کہ دکھائی ہی نہیں دیتی۔)

بعض فلاسفہ کے نزدیک سورۂ نمل کی آیت ۸۸ بھی ''برہانِ حرکت'' کی طرف ایک اشارہ ہے، جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۸۸ (النمل: ۸۸)

''تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کرتے ہو کہ وہ ایک جگہ پر کھڑے ہیں۔ حالانکہ وہ بادلوں کی طرح متحرک ہیں یہ خدائی تخلیق ہے کہ اس نے ہر شے کو نہایت مضبوط طریقے پر بنایا ہے، بہ تحقیق وہ تمہارے کاموں سے آگاہ ہے۔

اس آیت کی بابت بعض فلاسفہ کا خیال ہے کہ اس سے ''جوہری حرکت'' مراد ہے۔ یعنی وہ حرکت اشیاء کی ذات میں اور ان کے اندر موجود ہے۔ ایسی حرکت جو مادی دُنیا کے حادث ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اور اس بات کی ثابت کرتی ہے کہ یہ دنیا ایک خالق کی محتاج ہے۔ (اس کی وضاحت جلد ہی ہوگی)۔

بہرحال اگر یہ مان لیا جائے کہ آیت ''جوہری حرکت'' کے سلسلہ میں ہے تو بھی اس سے توحید پر استدلال اور حرکت کے ذریعے خدا کے وجود کا اثبات ہرگز نہیں ہوتا۔ (غور کریں)

اکثر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ آیت ''اشراط الساعۃ'' سے متعلق ہے (جن سے وہ خوفناک حوادث مراد ہیں) جو قیامت کے وقت رونما ہوں گے۔ خصوصاً یہ کہ پہاڑ چل پڑیں گے اور اس قدر متحرک ہوں گے کہ ریزہ ریزہ ہوکر دھواں بن جائیں گے جیسا کہ اس سلسلے میں قرآن مجید کی متعدد آیات میں بیان ہوا ہے [1]۔

ہاں تو جس طرح ہم نے تفسیر نمونہ میں بھی بیان کیا ہے کہ یہ چیز (اشراط الساعۃ) آیت کے ظاہری لب ولہجہ سے مطابقت نہیں رکھتی

[1] اس سلسلے میں مزید تفصیلات تفسیر نمونہ جلد ۱۳، سورۂ طٰہٰ آیت ۱۰۵ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

کیونکہ آغازِ قیامت میں پہاڑوں کا پھٹنا اس طرح خوفناک ہوگا کہ انسان کو نہایت وحشت زدہ کردیگا۔ جب کہ اس آیت میں یہ ذکر ہوا ہے کہ کیا تم پہاڑوں کی حرکت (آگے پیچھے ہونے) سے آگاہ نہیں ہوتے۔

لہٰذا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ بیان کررہی ہے کہ جس طرح زمین متحرک ہے اسی طرح پہاڑ بھی متحرک ہیں چنانچہ اس آیت میں ''تریٰ'' (تم دیکھتے ہو) کا جملہ ہے جس میں پہاڑوں کی حرکت کو بادلوں کی حرکت کے ساتھ تشبیہ دینا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا تعلق اسی دنیا سے ہے...... پھر یہ کہنا: صنع اللہ الذی اتقن کل شیئٍ یہ خدائی تخلیق ہے کہ اس نے ہر چیز کو نہایت مضبوط اور حکمت کے ساتھ بنایا ہے...... اس کے بعد یہ کہنا 'انہ خبیرٌ بما تفعلون۔'' خدا تمہارے کاموں سے آگاہ ہے، یہ جملے اس امر کا ثبوت ہیں کہ یہ آیت مبارکہ اسی دنیا میں پہاڑوں کے متحرک ہونے کو بیان کررہی ہے[1]

سورۂ رحمٰن کی آیت ۲۹ میں ہے۔ ''یسئلہ من فی السمٰوٰت والارض کل یوم ھو فی شان'' آسمانوں اور زمین میں رہنے والے سب اس کے بارے میں پوچھتے ہیں، وہ ہر روز ایک (نئے) کام میں ہے۔ بعض مفسرین اس کو ''جوہری حرکت'' کی دلیل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے (برہان حرکت کے ذریعے) خالق کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔

لیکن یہ آیت بھی مذکورہ بالا دعوے کی دلیل نہیں بن سکتی بلکہ اس کا ظاہری لب ولہجہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر روز نئی مخلوق پیدا کرتا ہے اور اس کا ایسا کرنا دائمی اور باقاعدہ طور پر جاری ہے۔ وہ نت نئی چیز ایجاد کرتا ہے۔ ہر روز ایک نئی نعمت عطا کرتا ہے اور اس کا کام سائلین (مانگنے والوں کی) حاجت روائی ہے۔

آیت کے ظاہری کلمات اور انداز بیان، اسی طرح وہ روایات جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ ان سب سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے جو ہم نے جو بیان کیا ہے ۱۲ (تفسیر نمونہ میں ہم نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے)[2]

مذکورہ بالا تمام مطالب و بیانات سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ''برہان حرکت'' کے اثبات کے لیے سب سے بہتر اور عمدہ آیات وہ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ذکر کی جا چکی ہیں۔ ان میں ستاروں کے افول وغروب کو ان کے خدا نہ ہونے اور اپنے وجود میں خالق کے محتاج ہونے کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] اس کی مزید وضاحت تفسیر نمونہ جلد ۱۵۔ سورۂ نمل آیت ۸۸ کے ذیل میں دیکھیں۔

[2] تفسیر نمونہ جلد ۲۳ صفحہ ۱۳۷ (فارسی)

# توضیحات

## (۱)...... برہان حرکت اور اس کے مقدمات:

برہان حرکت کو اچھی طرح سمجھنے اور یہ جاننے کے لیے کہ اس سے خدا کے وجود پر کس طرح دلیل قائم کی جاسکتی ہے، ذیل میں چند اُمور پیش کیے جاتے ہیں، جن سے اجمالی واقفیت ضروری ہے۔

ا۔ حرکت کی تعریف

ب۔ حرکت کا وجود

ج۔ حرکت کے ارکان

د۔ وہ چیزیں جن میں حرکت واقع ہوتی ہے

## ا۔ حرکت کی تعریف:

حرکت کی تعریف کئی طرح سے بیان کی گئی ہے، لیکن ان تمام تعریفوں میں واضح اور بہتر یہ دو ہیں۔

ا۔ کسی چیز کا قوت کے دائرے سے نکل کر فعل کی طرف تدریجی طور پر آنا۔

۲۔ زوال وحدوث مستمر (ہمیشہ کی تبدیلی)۔

جب بارش کے قطرے آسمان کی طرف سے گرتے ہیں یا گھاس اُگتی ہے یا کوئی میوہ تدریجی طور پر پکتا ہے، ان تمام موارد میں جسم ایک خاص حالت میں ہوتا ہے جسے (فلسفی اصطلاح میں) فعلیت کہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ جسم اس بات کی استعداد و صلاحیت رکھتا ہے کہ اس حالت سے دوسری حالت اختیار کرے۔ جب وہ اپنی موجودہ حالت کو تدریجی طور پر چھوڑ کر دوسری حالت اختیار کرتا ہے (جس چیز کی اس میں قوت تھی وہ فعلیت میں آجاتی ہے) تو گویا وہ جسم زوال وحدوث کے باقاعدہ نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو چکا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ''حرکت'' ایسے اجزاء سے مرکب ہے جنہیں ''سکون'' کہتے ہیں یا یہ وہ کوئی ایک ''وجود'' یا کوئی ایک ''عدم'' سے مل کر بنی ہے۔ بلکہ ''حرکت'' ایک ہی حقیقت ہے جو ظاہری استمرار رکھتی ہے۔ اور عقلی تجزیہ وتخلیل میں اس کے اجزاء فرض کیے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ جو چیز کامل ''فعلیت'' اور ''وجودِ مطلق'' رکھتی ہو اس میں ''حرکت'' کا تصور ہی نہیں ہوسکتا بلکہ اس پر ثبات کامل کی حکمرانی ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہیں گے کہ ''حرکت'' ہمیشہ وہاں قابل تصور ہے جہاں کسی چیز کی کمی ہو، لہٰذا خدا کی ذات میں ''حرکت'' کا تصور ہی نہیں پایا جاتا۔

## ب۔حرکت کا وجود

حرکت کے وجود کا ثابت کرنا کوئی مشکل امر نہیں، یہ ایک بدیہی امر ہے اور ہم روز وشب اپنی آنکھوں اور دوسرے حواس کے ذریعے عالم خارج میں ''حرکات'' کے وجود کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ دلائل جو ''حرکت'' کے وجود کا انکار کرنے والے حضرات (مثلا یونانی فلسفی)''ذنون'' اور اس کے پیروکار) نے پیش کیے ہیں۔ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور وہ ایک بدیہی امر کی مخالفت کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں کیونکہ ہم یہ بات کسی صورت میں تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ پانی جو کسی ندی یا نہر میں چل رہا ہے یا سیب کا وہ پھل جو درخت کی شاخوں پر تدریجی طور پر پک رہا ہے جب ہم گاڑی میں سوار ہو کر ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہیں تو یہ سب خیالی چیزیں ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ صرف ذہن کی دنیا میں گھومنے والے امور ہیں کہ جو عالم خارج میں عملی جامہ پہنتے ہیں۔ہم یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے۔کیونکہ یہ تو بدیہیات کا انکار ہے اور بدیہی امور تو ایسی حقیقتیں ہیں کہ جن کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔البتہ اس بات کا انکار ممکن نہیں کہ ''حرکت'' کے وجود کا ادراک اور اسے اچھی طرح سمجھنا قوت حافظہ کو بروئے کار لائے بغیر ناممکن ہے کیونکہ حرکت پل بھر کے احساس سے درک نہیں کی جاسکتی۔اس لیے کہ وہ ایک تدریجی امر ہے (یعنی تدریجی وتحقیق پذیر ہوتی ہے)۔

## ج......حرکت کے ارکان

فلاسفہ نے ''حرکت'' کے چھ رُکن ذکر کیے ہیں:

(۱)مبداء (۲)منتہا (۳)محرک(۴)متحرک(۵)وہ موضوع جس میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

(۶)وہ وقت جس میں حرکت رونما ہوتی ہے۔

(البتہ ہم اس بات کو بعد میں بیان کریں گے کہ وقت''زمان'' مقدارِ حرکت کا دوسرا نام ہے) پھر یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ چھ ارکان قدیم فلاسفہ کے نظریئے کے مطابق ہیں۔ورنہ اگر''حرکت جوہری'' کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تو''موضوع حرکت'' کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

## د......وہ امور جن میں ''حرکت'' واقع ہوتی ہے:

پہلے زمانے کے فلاسفہ کا نظریہ تھا نو مقولات (مقولات عرضیہ)[1] میں سے صرف چار مقولات میں ''حرکت'' واقع ہوتی ہے۔

ا۔ حرکت در''مکان'': مثلا بارش کے قطروں کی حرکت، سڑک پر گاڑی کی حرکت۔

---

[1] نو مقولات عرضیہ ہیں: کم، کیف، وضع، متی، این، ان یفعل، ان ینفعل، ملک، اضافہ ان سب کی تفصیلات مناسب مقامات پر بیان کی جاچکی ہیں۔

ب۔ کمیت (مقدار) میں حرکت: جیسے نشو ونما کی حالت میں گھاس کے حجم کا بڑھنا۔

ج۔ وضع میں حرکت: جیسے کرہ زمین کی گردش۔

د۔ کیفیت میں حرکت: جیسے درخت پر کسی پھل کے رنگ، بواور ذائقہ تدریجی تبدیلی۔

وہ حضرات! قدیم فلاسفی) اس بات کے قائل تھے کہ ان چار موضوعات کے علاوہ کسی چیز میں ''حرکت'' نہیں پائی جاتی (اگر ایسا ہوتو جوہر اشیاء میں حرکت ناممکن ہونا بطریق اولیٰ ثابت ہوگا) یونان کے فلاسفہ مثلاً ''ارسطو'' اور اس کے ہم خیال مسلم فلاسفہ جیسے ''ابن سینا'' اور دیگر بزرگ محققین بھی ''حرکتِ جوہری'' کو ناممکن ومحال سمجھتے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ حضرات ''متحرک'' کو حرکت کے ارکان میں شمار کرتے تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ جب تک کوئی ثابت (غیر متحرک) موضوع موجود نہ ہو کہ جس پر حرکت واقع ہو، اس وقت تک ''حرکت'' کے وجود کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ (حرکت نہیں پائی جائے گی)۔

لیکن مشہور معروف فیلسوف اسلام ''صدرالمتالہین'' (ملاصدرا) نے ایک جدید نظریہ پیش کیا، انہوں نے کہا: جو ہر اشیاء میں ''حرکت'' نہ صرف یہ کہ محال نہیں بلکہ جب تک ''جوہر'' میں نہ ہو ''عوارض'' میں حرکت کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں یا یوں کہیں کہ ''عرضی حرکات'' کا سرچشمہ جوہر'' میں پائی جانے والی حرکت'' ہے اور اس کے بغیر ''حرکت'' ممکن ہی نہیں ہے۔

صدرالمتالہین کہتے: اس بات کی ضرورت ہی کیا ہے کہ کسی ''امر ثابت'' (غیر متحرک چیز) کے وجود کو فرض کریں؟ ہاں اس بات کو تسلیم کر لینے میں کیا حرج ہے کہ ''جوہر'' اپنے آپ ہی میں مصروف حرکت ہے؟ یعنی ہمیشہ اس حالت میں ہے کہ اپنی پہلی حالت کو چھوڑ کر نئی حالت اپنا لے۔

البتہ ہادی النظر یہ موضوع (جوہر کا اپنے آپ میں حرکت کرتے رہنا) عجیب محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ''متحرک'' اور ''حرکت'' ایک ہی شے ہو، نیز یہ کہ شے خود ہی اپنے لیے محور حرکت ہو لیکن ملاصدار یہ کہتے ہیں۔ کہ اگر ہم کچھ غور کریں تو معلوم ہوجائے گا کہ یہ بات عجیب نہیں بلکہ ایک لازمی وضروری چیز ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ عمدہ اور دلکش بھی محسوس ہوگی۔

صدرالمتالہین شیرازی نہایت تاکید کے ساتھ کہتے ہیں: ''حرکت جوہری'' کا بنیادی نظریہ قدیم فلاسفہ کے بیانات میں موجود ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اس نظریئے کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیات کو بطور دلیل پیش کیا ہے (مبادا کہ اسے جدید نظریہ سمجھ کر مخالفین کو ہنگامہ آرائی کا موقع نہ مل جائے۔ کیونکہ عموماً جدید نظریات کے بارے میں ایسا ہی ہوتا ہے)۔

لیکن اگر ہم یہ بات تسلیم بھی کر لیں کہ یہ کوئی جدید نظریہ نہیں ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں اس قدر وسعت ضرور ایک نئی چیز ہے۔

## جوہر میں پائی جانے والی حرکت کے دلائل

صدرالمتالہین کا نظریہ ہے کہ وجود کی دو قسمیں ہیں:

(۱)......وہ وجود جس میں ثبات وقرار پایا جاتا ہے۔اس میں مطلقاً حرکت نہیں پائی جاتی، نہ اس کی ذات میں اور نہ ہی اس کی صفات میں!

(۲)......وہ وجود جو ذاتاً سیال ہے، یعنی سیلان اور تحرک اس کی ذات کا جزء سمجھا جاتا ہے اور کسی صورت میں اس میں ثبات وقرار نہیں پایا جاتا، اس کا یہ ذاتی عدم قرار اور بے قرار اور بے ثباتی کبھی تو اس کے عوارض میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے اور کبھی وہ تبدیلی ظاہر بظاہر نظر نہیں آتی۔ جب کہ وہ باطنی واندرونی طور پر ہمیشہ ''نیا'' ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ سیال (ہمیشہ حرکت میں رہنے والی) موجودات لحہ بہ لحہ ایک نئے وجود میں آتی ہیں اور ''نئی'' ہوتی ہیں۔لیکن چونکہ ان کے درمیان ایک طرح کا اتصال وارتباط بھی ہے، اس لیے وہ ایک ہی وجود شمار ہوتا ہے۔

''جوہری حرکت'' کے قائل حضرات نے اپنے نظریے اور مدعا کے اثبات کے لیے دلائل ذکر کیے ہیں۔ اگرچہ یہاں ان مسائل کی تفصیلات ذکر نہیں کی جاسکتیں لیکن ہم ان کی تین بنیادی اور اہم دلیلوں اور اہم دلیلوں کو اجمالی طور پر ذکر کرتے ہیں:

(۱) ایک قاعدہ کلیہ ہے: **کل ما بالعرض ینتھی الی ما بالذاتِ**، یعنی ہر وہ شے (موجود) جس نے کسی سے کوئی صفت حاصل کی ہو، ضروری ہے کہ اس منبع اور سرچشمہ تک پہنچے کہ جہاں سے وہ صفت نکلی ہو، ورنہ ''تسلسل'' لازم آئے گا۔ مثلاً گرم پانی کی حرارت کہ جو اس کی اپنی نہیں بلکہ کسی سے لی ہوئی ہے۔ بالآخر آ گ'' تک پہنچنی چاہیے کہ جس کی حرارت ذاتی ہے۔ اور حرارت کا سرچشمہ بھی وہی ہے۔

اس قاعدے کے ملحوظ رکھتے ہوئے جسم کے عوارض (کمیت وکیفیت وغیرہ) میں پائی جانے والی حرکت کو دیکھیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ''حرکت'' اصل میں جسم کی ذات میں پائی جانے والی بے ثباتی اور عدم قرار سے نکلی ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے مثال کے طور پر اگر سیب میں ذاتی طور پر ثبات وقرار پایا جائے تو اس کے عوارض میں تبدیلی کیونکر آ سکتی ہے؟ پس اس سے معلوم ہوجائے گا کہ ظاہری حرکت سے باطنی حرکت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یعنی ظاہری حرکت کو دیکھ کر باطن میں پائی جانے والی حرکت کا پتہ چلتا ہے۔ (ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ باطن میں حرکت موجود نہ ہو لیکن ظاہر میں حرکت پائی جائے)۔

(۲) ہر متغیر ''معلول'' کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ایک متغیر علت ہونی چاہیے یعنی کوئی متغیر چیز اپنی متغیر علت وسبب کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ اگر ہم کسی باغ میں درخت کے سایے میں بیٹھے ہوں اور دیکھ رہے ہوں کہ درخت کا سایہ باقاعدہ حرکت میں ہے (تبدیل ہورہا ہے) تو اس سے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس سائے کی علت وسبب یعنی سُورج کی گرمی میں ''حرکت'' پائی جاتی ہے اور وہ مصروف حرکت ہے...... بناء بریں ہم جسم کے عوارض کی حرکت وتبدیلی سے اصل جسم (ذات جسم) میں حرکت وتبدیلی سے آ گاہ ہوجائیں گے۔

(۳) مسئلہ زمان (وقت۔زمانہ) حرکت جوہری کی ایک اہم دلیل ہے۔ کیونکہ واضح طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ حوادثاتِ زمانہ ایک ساتھ رونما نہیں ہوتے۔ ''آج'' کے حوادث گزرے ہوئے کل کے بعد......اور آنے والے کل سے پہلے ہیں، یہ ایک حقیقت اور امر واقع ہے...... یہ فرق وہی چیز ہے، جسے ہم وقت کا فرق کہتے ہیں۔

حسب الظاہر اور سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ''زمان'' (وقت، زمانہ) موجودات سے الگ ایک مستقل حقیقت کا نام ہے اور حوادث کے لیے ایک ظرف اور بستر کی مانند ہے، لیکن اگر ایک لمحہ کے لیے یہ فرض کر لیں کہ ان تمام مادی موجودات میں سے کوئی بھی موجود نہیں پایا جاتا، اس بات کو واضح الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''زمان'' مادہ کی اولاد ہے اور اس سے پیدا ہوا ہے یا پھر یوں کہیں کہ ''زمان'' مقدارِ حرکت کا دوسرا نام ہے۔

جن موضوعات میں ''حرکت'' واقع ہوتی ہے، اگر ہم ان کو مذکورہ چار موضوعات میں منحصر سمجھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی ''موجود'' چیزان'' حرکات'' سے محروم ہو اور اس میں کوئی ظاہری حرکت دکھائی نہ دے تو وہ چیز ''زمان'' سے بھی محروم ہوگی یعنی اس کے لیے کوئی زمان و وقت بھی فرض نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ ''وجدان'' کا فیصلہ ہے کہ اگر یہ چاروں حرکات نہ ہوں تو بھی ہم ''زمان'' (وقت۔زمانہ) کا احساس کرتے ہیں...... یہ صرف اس لیے ہے کہ ''مادہ'' ذات کے لحاظ سے حرکت رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں زمان اور نظم اوقات قبل تصور ہے۔ (غور کریں)

یہ تھیں ''حرکتِ جوہری'' کے قائل دانش وروں کی دلیلیں جو ہم نے نہایت ہی اختصار کے ساتھ ذکر کر دی ہیں۔

لیکن ابھی کچھ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال باقی ہے کہ یہ تصور کرنا کہ ''متحرک' خود ہی' ''حرکت'' ہے اور اس کے سوا ''حرکت'' کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں...... کیونکر ممکن ہے؟ پھر جس چیز کا تصور ہی سوالیہ نشان رکھتا ہے۔ اس کی تصدیق کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اس کے علاوہ عجیب بات یہ ہے کہ ''حرکت جوہری'' کا جدید نظریہ پیش کرنے والا خود بھی اس پیچیدگی کا شکار ہو کر اسے حل کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے، چنانچہ اس کے مختلف اقوال سے اس بات کا پتہ چلتا ہے، کہ خود اس کے لیے بھی یہ موضوع کچھ ایسا آسان نہیں تھا۔ [1]

خلاصہ کلام یہ کہ حرکت جوہری کی ساری بحث اس موضوع کی فرع ہے کہ ''حرکت'' کسی موضوع کے بغیر بھی قابلِ تصور ہونا معقول ہی نہیں ہے۔ لیکن کچھ اور دانش ور یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اس بات کا تصور درحقیقت ان مفاہیم کو ذہن سے نکال دینے پر موقوف ہے جن سے حرکت کی بابت انسان مانوس ہے...... تاکہ موجود کا تصور کیا جا سکے جو عین حرکت ہے۔ اور متحرک و حرکت اس مقام پر ایک ہیں۔

یہ تھا حرکت سے مربوط مسائل کا خلاصہ!

## (۲)...... برہان حرکت کے ذریعے وجودِ خدا کی پہچان:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ''حرکت'' صرف'' حرکت جوہری'' میں منحصر نہیں یہی وجہ ہے کہ ذات واجب الوجود کے اثبات کیلئے ''برہان حرکت'' محض ''حرکت جوہری کی بحث تک محدود نہیں۔۔۔ اگر ''حرکت جوہری'' کو تسلیم کر لینے سے خداشناسی کے بارے میں ''برہان حرکت'' نہایت واضح و آشکار ہو جاتی ہے۔

---

[1] اس بارے میں مزید معلومات کے لیے کتاب ''اسفا'' میں بحث ''حرکت'' اور ''ورسہائے شہید مطہری'' میں اسفار'' کی بحث حرکت کے باب کا مطالعہ کریں۔

اس کی وضاحت اس طرح ہوتی ''حرکت جوہری سے ثابت ہوتا ہے کہ سارا ''جہان مادہ'' ہی حرکت میں ہے یعنی ہمیشہ حادث اور نیا ہے ہر ایک لحہ میں اس کا ایک نیا وجود ہے۔ یہ حدوث مستمر (لگاتار نئے وجود میں آنا) اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس کائنات اور مادی جہان کا باقاعدہ اور مسلسل رابطہ اس ذات سے ہے جو ''حادث'' نہیں بلکہ واجب الوجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ جہان ہمیشہ ''بدلتے رہنے کی حالت میں ہے نہ کہ ''ایک سا رہنے کی حالت میں......اور ایسا ہونا اس کے عوارض ہی میں نہیں بلکہ اس کی اصل ذات کی گہرائی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔لہٰذا وہ ہمیشہ ایک ''مبداء'' کا محتاج رہتا ہے جو اسے ہر لحہ نئی آفرینش عطا کرے۔

اس بارے میں کسی فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

دائماً نومی شود عالم وما

بے خبرازنوشد اندر بقاء

شد مبدل آب ایں جو چند بار

عکس ماہ وعکس اختر برقرار

''یہ جہاں ہمیشہ بدلتا اور نیا بنتا رہتا ہے۔لیکن ہم اس کے نئے ہونے سے بے خبر ہیں۔ندی کا پانی کئی بار تبدیل ہو چکا ہے۔مگر چاند تاروں کا عکس اسی طرح برقرار ہے۔''

اس بیان سے ایک یہ دلچسپ نتیجہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے کہ جہان کی تخلیق صرف ابتداء ہی میں نہیں۔ بلکہ ہر لحہ اس کی ایک نئی تخلیق وآفرینش ہے جب ایسا ہے تو کائنات کا ایک ازلی وابدی میں نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے۔کیونکہ اس کی خلقت استمراری ہے اور وہ ہر لحہ تخلیق کے مرحلے میں ہے، اس لیے کہ یہ بات مفہوم حرکت کی گہرائی میں موجود ہے اور اس کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔''لہٰذا'' حرکت جوہری'' کو تسلیم کر لینے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ یہ جہان جس طرح آغازِ خلقت میں واجب الوجود کا محتاج تھا......اسی طرح اپنی بقاء میں بھی اس کا محتاج ہے اور یہ احتیاج اس میں ہر وقت موجود ہے۔ بلکہ ''حرکت جوہری'' کے نظریے کی روشنی میں ''بقا'' کا کوئی مفہوم ہی نہیں کہ ہمیشہ حدوث ہی ہے۔ البتہ یہ ایسا حدوث ہے جس میں باہم اتصال پایا جاتا ہے۔اور یہ پورے وجود پر طاری ہے، پس لفظ ''بقاء'' کا استعمال بھی ''حدوث'' کے متصلاً اور لگاتار واقع ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اس مقام پر ''مبداء ازلی'' کے ساتھ اس جہان کی تمام اشیاء کے رابطے کو سمجھنے کے لیے ایک نہایت ناقص اور کم مایہ مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کہ تمام موجودات عالم کی برقی قمقمے کی طرح تصور کریں کہ جو برقی مرکز سے رابطہ رکھنے کے باعث روشن رہتا ہے چونکہ یہ روشنی ہر لحظہ اس قمقمے تک پہنچتی رہتی ہے اس لئے وہ اپنی روشنی قائم رکھنے کی خاطر روشنی دینے والی اس علت وسبب کا محتاج ہے۔ان برقی قمقموں کے روشن ہونے کی کیفیت اس بات کو سمجھنے میں مدد دیتی کہ وہ دائمی طور پر برقی مرکز سے رابطہ رکھنے حاجت مند ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ''برہان حرکت'' کی بازگشت ''برہان وجوب وامکان'' کی طرف ہے لیکن چونکہ اس کی پہچان ایک نئے رنگ میں ہوئی اور اس پر نئے عنوان سے بحث ہوئی ہے اس لیے اس ایک مستقل حیثیت حاصل ہوگئی ہے......(غور کریں)

# (۳) تمام جہان متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہے

اکثر متکلمین (علماءِ عقائد) نے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے اسی (دلیل تغییر) کا سہارا لیا ہے، انہیں ''حرکت جوہری'' سے کوئی سروکار نہیں اور موجودات عالم میں ظاہر بظاہر نظر آنے والی ہمیشہ کی تبدیلیاں ان کے نقطہ نظر کے اثبات کے لیے کافی ہیں۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ ''جہاں مادہ'' کی کوئی چیز کسی وقت بھی ایک حالت پر باقی نہیں رہتی۔ بلکہ بلا استثناء تمام اشیاء تغیر و تبدیل کی حالت میں ہیں۔ یہ امر بھی واضح ہے کہ تبدیلی'' اور حرکت'' ایک ''حادث'' چیز ہے چونکہ ''مادہ'' ہمیشہ تغیرات اور تبدیلیوں کا شکار رہتا ہے لہٰذا وہ بھی ''حادث'' ہوگا کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ''مادہ'' ازلی ہو اور ازل سے حوادث کا شکار ہو، اگر ایسا ہو تو ''حدوث'' اور ''ازلیت'' کا یکجا ہونا لازم آئے گا جو محال ہے......اس لیے کہ ان دونوں کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے (غور کریں)

مادہ کے بارے میں آج کل کے جدید نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ استدلال مزید واضح ہوجاتا ہے۔ کیونکہ طبیعات کے نئے نظریوں کے مطابق ہر مادہ کئی ایک ایٹموں سے تشکیل پاتا ہے اور ہر ایٹم ''حرکات'' کا مجموعہ ہے چونکہ ہر ''حرکت'' حادث ہے لہٰذا مادہ کہ جو متعدد والیکٹرون (ELECTRON) اور پروٹون (PROTON) کی ''حرکت'' کا مجموعہ ہے وہ کس طرح ازلی ہوسکتا ہے؟ دوسرے الفاظ میں ہر حرکت کا آغاز اور ایک انجام ہے......جس چیز کا آغاز و انجام ہو وہ کیونکر ازلی ہوسکتی ہے؟

یہ مسئلہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس بیان میں نہایت لطیف انداز ہی میں مذکور ہے جو آپ نے ''مادہ'' کی ازلیت کے قائل ایک دانش ور ''ابن ابی العوجائ'' کے لیے ارشاد فرمایا تھا۔

امامؑ نے فرمایا: اسئل عما شئت ......یعنی جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، پوچھو!

ابن ابی العوجاء نے کہا: ما الدلیل علی حدث الاجسام ......اجسام کے حدوث کی دلیل کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: میں نے کوئی چھوٹی یا بڑی چیز نہیں دیکھی، مگر یہ کہ جب بھی اس کے ساتھ اسی جیسی کوئی چیز ملائی جائے تو وہ بڑی ہوجاتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دوسری چیز کے ملنے سے وہ ایک سے دوسری حالت میں تبدیل ہوئی ہے یہ زوال اور تبدیلی اس بات کی دلیل ہے کہ اگر وہ شئے قدیم اور ازلی ہوتی تو کبھی ایک سے دوسری حالت میں تبدیل نہ ہوتی کیونکہ جو چیز زائل اور تبدیل ہوتی ہے۔ یعنی ایک سے دوسری حالت میں داخل ہوسکتی ہے......اس میں وجود عدم دونوں آ سکتے ہیں۔ یعنی وہ موجود بھی ہوسکتی ہے اور معدوم بھی ہوسکتی ہے۔ پس وہ ''عدم'' سے وجود میں آنے کی وجہ سے ''حادث'' چیزوں سے ہوجائے گی......اور اگر ''ازل'' میں ہو تو پھر ''حادث'' نہیں بلکہ ''قدیم'' ہوگی......جب کہ ''ازلیت'' اور ''حدوث''......یعنی ''قدم'' اور عدم'' ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے ان دونوں کا ایک شئے میں یک جا ہونا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے [1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۴۶۔ اصولِ کافی جلد ۱ صفحہ ۷۷ باب حدوث العالم

## (۴) عصر حاضر کے علمی قوانین اور جہان کا حادث ہونا:

آج کی علمی بحثوں (خاص طور پر THERMODY NANIC اور ENTHROPY) میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ گرم اجسام سے سرد اجسام کی طرف سرایت حرارت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، یہ عمل خود بخود نہیں ہوسکتا بلکہ ایسا ہونا ایک نا قابل استفادہ قوت کا ایک قابلِ استفادہ قوت کی طرف مخصوص زاویے کے ساتھ منتقل ہونا ہے۔ یہ امر بھی واضح ہے کہ یہ سلسلہ جسے (ENTHROPY) کہا جاتا ہے اس کا اثر ساری دنیا میں بڑھ رہا ہے۔ پس اگر یہ جہاں ازلی ہوتا تو تمام اجسام کی حرارت کب سے ہی ایک جیسی ہوچکی ہوتی اور کوئی قابلِ استفادہ قوت باقی نہ رہتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پوری دنیا میں کیمیائی اثرات ختم ہوکر رہ جاتے اور روئے زمین پر زندگی ممکن ہی نہ رہتی۔ جب کہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کیمیاوی فعل وانفعالات با قاعدگی کے ساتھ جاری ہیں اور روئے زمین پر زندگی امکان پذیر ہے۔ پس موجود علوم اگر چہ اس طرف متوجہ نہیں لیکن اس حقیقت کو ثابت کررہے ہیں کہ اس جہاں کی کوئی ''ابتدائ'' تھی (یعنی وہ نہیں تھا اور پھر ہوگیا)......اس طرح وہ (علوم) خدا کے وجود کے ضروری ہونے کو بھی ثابت کررہے ہیں۔ کیونکہ کوئی ''حادث'' چیز خود بخود وجود میں نہیں آسکتی بلکہ اس کے ''حادث'' ہونے اور وجود میں آنے کے لیے محرک اوّل کا ہونا ضروری ہے [1]

''دُنیا کے ''حادث'' ہونے کو ثابت کرنے کے لیے جو دوسرا راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ ریڈیو ایکٹو اجسام کے بارے میں تحقیق کا عمل ہے (یہ وہ اجسام ہیں جو ایسے نا پائدار ذرات رکھتے ہیں جو بکھرتے رہتے ہیں، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہی رہتا ہے جب تک وہ نا پائدار ایٹمی ذرّے......مضبوط و پائدار ایٹمی ذروں میں......تبدیل نہ ہوجائیں یہ ایسے ایٹم ہیں کہ عام طور پر ایٹمی لحاظ سے ۸۰ سے زیادہ ہیں اور وہ ایسے بھاری اور ناپائیدار اجسام کی طرح ہیں جو ہمیشہ ایٹمی شعاعیں بکھیرنے میں مصروف رہتے ہیں، گو یا وہ اپنے اضافات وزوائد کو نکال باہر کرتے ہیں تاکہ ایک پائیدار عنصر میں تبدیل ہوسکیں) اس جہان طبیعت میں ایسے اجسام کا پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ جہان ''حادث'' ہے اور اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ مشہور معروف دانش ور'' جیوکیمسٹری کے ماہر اور کتاب......زمین کی عمر کی تعیین، قدرتی ریڈیو ایکٹو کاربن کے ذریعے......کے مولف کے بقول: (DONAL DRERTMR) اگر یہ دُنیا ازلی وابدی ہوتی تو یہاں کوئی ریڈیو ایکٹو عنصر پایا ہی نہ جاتا (کیونکہ وہ سب پائیدار اجسام میں تبدیل ہوچکے ہوتے) [2]

مذکورہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ جدید علوم نے اپنے تجربات کی روشنی میں مختلف طریقوں سے اس کائنات کے حدوث کو ثابت کیا ہے اور یہیں سے جہان ہستی کی تخلیق کے لیے ایک ازلی وابدی خالق کی ضرورت کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے۔

اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس چیز کا ثبوت ہے کہ اس دنیا کی اپنی ایک تاریخ ہے کہ جس سے اس کے حادث ہونے اور اس کے آغاز وابتداء کا پتہ چلتا ہے، پھر اگر یہ مادی دُنیا ازلی ہوتی تو اب تک اتنا طولانی زمانہ گزرنے کے باعث حرارت

---

[1] کتاب ''اثبات''وجودِ خدا، صفحہ ۵۵ (سے تلخیص)

[2] کتاب ''اثبات وجودِ خدا، صفحہ ۱۵۵

پوری کائنات میں پھیل چکی ہوتی، اس کی فعالیت وکار آرائی باقی نہ رہتی اور اب تک اس پوری دنیا پر موت کے سائے پھیل چکے ہوتے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر ہم گرم پانی سے بھرے ہوئے ایک برتن کو ایک کمرے میں رکھ دیں تو جب تک اس پانی کی حرارت اردگرد کی فضاء سے مختلف ہوگی، اس وقت تک برتن کے اردگرد کی ہوا مسلسل حرکت میں ہوگی۔ یعنی اپنی گرمی کی حالت میں اوپر جارہی ہوگی اور اس کے نزدیک کی ہوا اس کی جگہ لے رہی ہوگی۔ یہی عمل اردگرد کی ہوا کے مسلسل حرکت میں آنے کا سبب ہے۔

لیکن جب حرارت اور گرمی کی یہ قوت کمرے کی فضاء میں برابر طور پر پھیل جائے تو پھر کوئی حرکت باقی ہی نہ رہے گی اور پانی کا کھولنا ختم ہوجائے گا) اس مثال کی روشنی میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اس جہان کی انتہا بھی اس طرح سے ہوگی۔ اگر اب بھی کوئی حرکت باقی ہے تو وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی اس دنیا پر اتنا زمانہ نہیں گزرا کہ وہ اپنے اختتام کو پہنچ جائے یعنی ابھی اس کے حدوث کی مدت باقی ہے اس کے لیے یہ مثال بھی دی جاسکتی ہے کہ باہم ملے ہوئے کئی ایک برتن ایک جگہ رکھے ہوں ہم ان میں سے ایک میں پانی ڈالیں تو وہ اان تمام برتنوں میں ''حرکت'' کرتا ہوا نظر آئے گا، یعنی سب میں پہنچ جائے گا۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ پانی ایک ہی سطح پر نہ پہنچ جائے۔ جب پانی سب برتنوں میں ایک سطح پر پہنچ جائے گا تو پھر ان میں سکوت اور ٹھہراؤ پیدا ہوجائے گا۔ علم فلکیات کے ماہر دانش ور اسٹونٹر'' (ASTONTER) کا کہنا ہے کہ جدید علوم نے اب تک بہت سی چیزوں کی عمر کا سراغ لگایا ہے، مثلاً زمین، چمکیلے پتھر چاند، سورج کہکشاں ...... یہاں تک کہ اس دُنیا کی عمر اور مختلف عناصر کی ترکیب کے لیے ضروری مدت کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی تخلیق پر چھ کروڑ سال گزرے ہیں (یعنی جہان کی ابتداء کو اتنے سال ہوگئے ہیں)[1]

اس مقالے کے آخر میں ہم ایک بار پھر اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ مذکورہ آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیان خدا کے وجود کے اثبات کی بابت اس عقلی دلیل کے پیش نظر ہے کہ کوئی متغیر چیز ابدی اور ہمیشہ رہنے والی نہیں ہوسکتی۔ البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیان میں حرکت کی دیگر دلیلیں بھی پوشیدہ ہیں۔ (غور کریں)

---

[1] کتاب ''اثباتِ وجودِ خدا'' صفحہ ۱۶۰۔

# (۳) برہان وجوب وامکان
# (غنیٰ وفقیر)

## اشارہ:

علم عقائد کے ماہر علماء اور فلاسفہ نے وجودِ خدا کے اثبات کے لیے گوناگوں دلائل ذکر کیے ہیں کہ جن میں سے بعض بنیادی طور پر ایک جیسے ہیں۔ ایسے ہی دلائل میں سے ''برہان وجوب وامکان'' اور ''برہان علت ومعلول'' ہے......عنقریب ان دونوں کی تشریح کی جائے گی۔ ان شاءاللہ!

چونکہ ان دلائل کو مختلف طریقے اور مختلف پیرایہ میں پیش کیا ہے اور ان میں ہر ایک کی مستقل صورت ہے۔ لہٰذا ہم بھی انہیں الگ الگ بیان کریں گے البتہ ان کی مشترکہ بنیاد کو بھی بیان کیا جائے گا۔

''برہان وجوب وامکان'' یا ''غنیٰ وفقر'' کی بنیاد یہ ہے کہ جب ہم اپنے آپ اور اس جہان کے دیگر موجودات کو دیکھتے ہیں تو وہ سب سراپا احتیاج نظر آتے ہیں۔......ایسی احتیاج جو ان کے وجود سے باہر کی طرف ہے، یہ بات بدیہی اور واضح (نا قابلِ انکار) ہے تو نہیں مانا جا سکتا کہ سارے کا سارا جہانِ ہستی فقر واحتیاج رکھتا ہے۔ (اور یہاں کوئی بھی بے نیاز نہیں)......ہاں سارے جہان کی حاجت مندی اس امر کی دلیل ہے کہ غنیٰ وبے نیازی کا ایک سرچشمہ موجود ہے اور ہم اس سرچشمے کو ''خدا'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس جہان کی تمام موجودات کو کسی سے مربوط اور وابستہ پاتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یہ وابستگی کوئی انتہا ہی نہ رکھتی ہو۔ جہان ہی وابستہ ہو اور یہ وابستگی پورے جہان پر چھائی ہوئی ہو۔ یہ وابستگی ہی اس بات کی دلیل ہے کہ جہانِ ہستی میں ایک ایسی ذات موجود ہے جو مستقل بالذات وجود رکھتی ہے اور اس سے وابستہ یہ تمام موجودات اس کے سہارے پر قائم ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم قرآنی آیات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اور درج ذیل آیات پر غور کرتے ہیں۔

(۱) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۱۵

﴿ فاطر: ۱۵ ﴾[1]

(۲) وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ﴿محمد: ۳۸﴾

---

[1] ان اللہ غنی حمید'' (اس قسم کی تعبیر پورے قرآن میں دس مقامات پر ذکر ہوئی ہے۔ (بقرہ۔ ۲۶۷، ابراہیم۔ ۸ حج۔ ۱۶۴ لقمان ۱۲۰۔ ۲۶ حدید ۲۴، ممتحنہ ۶، تغابن۔ ۶ نساء۔ ۱۳۱ فاطر۔ ۱۵) خدا کی صفت غنیٰ کا ذکر متعدد آیات میں موجود ہے۔ ان تاکیدی وتکراری بیانات سے اس موضوع کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

(۳)يَسۡئَلُهٗ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِيۡ شَاۡنٍ ۲۹﴿الرحمن: ۲۹﴾

## ترجمہ

(۱)......اے لوگو! تم سب خدا کی طرف محتاج ہو، فقط خدا ہی بے نیاز اور حمد وثناء کے لائق ہے۔"

(۲)......"خدا بے نیاز اور تم سب محتاج ہو۔"

(۳)......آسمانوں اور زمین میں رہنے والے سب اس سے مانگتے ہیں، وہ ہر روز نئے کام (نئی شان) میں ہے۔"

## الفاظ کی تشریح

"فقرآء" "فقیر" کی جمع ہے، راغب اصفہانی نے کتاب "المفردات" میں لکھا ہے کہ "فقیر" اصل میں اسے کہتے ہیں جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو۔ چونکہ نادار و تہی دست لوگ بھی اسی کی مانند ہوتے ہیں۔ جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہو۔ اس لیے انہیں بھی "فقیر" کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ "مسکین" (جو سکون کے لفظ سے بنا ہے) اس شخص کو کہتے ہیں جو راستہ چلنے پر قادر نہ ہو، یہ لفظ بھی نادار لوگوں پر بولا جاتا ہے۔ لہٰذا "فاقرہ" اس حادثے یا بت بڑی مصیبت کو کہتے ہیں۔ گویا جس نے ہڈیاں توڑ ڈالی ہوں۔

"مجمع البیان" کے مطابق بعض حضرات کا نظریہ ہے کہ "فقرا" سے کہتے ہیں جس کی حالت "مسکین" سے بہتر ہو چنانچہ ایک بیابان کے رہنے والے عرب سے کہا گیا......کیا تو فقیر ہے؟......اس نے جواب دیا......نہیں! خدا کی قسم میں تو مسکین ہوں[1]

بہرحال لفظ "فقیر" کو چار مقامات پر استعمال کیا گیا ہے:

(۱) ایسی ضروری احتیاجات جو تمام انسانوں بلکہ تمام موجودات کو درپیش ہیں۔ اس سلسلے میں آیہ مبارکہ "یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ" (اے لوگو! تم سب خدا کی طرف احتیاج رکھتے ہو) کہ دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) وسائل زندگی کی احتیاج یعنی کم سے کم حد تک زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وسائل کی حاجت اس سلسلے میں آیہ مبارکہ "انما الصدقات الفقراء" (صدقات فقراء کے لیے مخصوص ہیں) کو ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

(۳) نفسانی احتیاج کہ جسے "طمع" کہا جاتا ہے اور مشہور حدیث میں اسے "کفر" کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ کاد الفقران یکون کفراً۔ اس کے مقابلے میں نفس کی بے نیازی ہے۔

(۴) خدا کی طرف احتیاج جیسا کہ حدیث میں ہے "اللھم اغنی بالا فتقار الیك ولا تفقرنی بالاستغناء عنك)

---

[1] بعض حضرات کا نظریہ اس کے برعکس ہے کہ مسکین......فقیر سے بہتر ہے۔

خدایا! اپنی ذات کی طرف احتیاج کے ساتھ مجھے بے نیاز بنادے اور اپنے سے بے نیازی کے احساس کے ساتھ دوسروں کا محتاج نہ بنا)[1]

کتاب ''العین'' میں ہے ''فقرہ (بروزن نقرہ) اس گڑھے کو کہا جاتا ہے جسے کوئی شخص پودا لگانے کے لیے کھودتا ہے ممکن ہے کہ لفظ ''فقیر'' کی اصل یہی ہو کیونکہ فقر کی وجہ سے اس کی زندگی میں گڑھے کی طرح) خلا پیدا ہوجاتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ اس لفظ کا استعمال (ستون فقرات) یعنی ریڑھ کی ہڈی کے جوڑوں کے لیے بھی اس وجہ سے ہو کہ ان کے درمیان گڑھوں کی طرح خلا پیدا ہوتا ہے۔

''غنی'' کا مادہ ''یعنی بے نیازی اور ''غنی'' ''فقر'' کے برعکس ہے اس لیے اس کے استعمال کے بھی چار مقامات ذکر کیے گئے ہیں:

(۱)......کسی چیز کی احتیاج نہ رکھنا (مطلق بے نیازی)، یہ معنی خدا کے لیے مخصوص ہے۔

(۲)......زندگی کے ضروری وسائل میں کمی نہ ہونا۔

(۳)......نفس کی بے نیازی یعنی قناعت۔

(۴)......خدا سے بے نیازی......اور یہ ناممکن ہے، البتہ کچھ لوگوں کے ذہنوں میں اس بے نیازی کی سوچ پیدا ہوجاتی ہے جو ان کے طغیان وسرکشی کا سبب بن جاتی ہے، چنانچہ اس کے متعلق قرآن میں آیا ہے۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴿العلق:۶۔۷﴾

ابن منظور نے ''لسان العرب'' میں لکھا ہے: ''غناء'' ......غین پر زبر کے ساتھ......کا معنی نفع ومنفعت اور......غنا''......غین کے زیر اور مد کے بغیر......کا معنی بے نیازی ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص ان سب معانی کی ایک ہی بنیاد قرار دے اور یہ کہے کہ گانے کو اس لیے ''غنا'' کہا جاتا ہے کہ اس میں انسان اپنی آواز کو بلند اور بھرپور انداز سے نکالتا ہے، وہ اس طرح ہی ہے کہ جیسے مالدار اور ثروت مند لوگ اپنے مال ودولت کی وجہ سے بے نیازی کے ساتھ بلند قامت کہلاتے ہیں۔

# آیات کی تفسیر اور اہم مطالب کا ذکر

## سب اسی کے محتاج ہیں:

پہلی آیت میں بلا استثناء سب انسانوں کو مخاطب کرکے کہا جارہا ہے: ''یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ'' (اے لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو) اس مقام پر ''فقر'' کا معنی بہت وسیع ہے اور وجود وہستی کی تمام احتیاجات اس میں آجاتی ہیں مثلاً اپنی مادی زندگی کی بقاء کے لیے سورج کی روشنی پانی ہوا اور کئی قسم کی غذاؤں، لباس اور مکان کے محتاج ہیں......نیز ہم اپنی جسمانی زندگی کے لیے بدن کے اندرونی

---

[1] راغب اصفہانی، کتاب ''المفردات'' مادہ فقر

اعضاء جیسے دل۔ رگوں اور سانس کے نظام مغز اور اعصاب کے محتاج ہیں، اسی طرح ہم اپنی معنوی زندگی میں گمراہی کے اندھیرے میں سیدھے راستے کے تلاش اور حق و باطل کے درمیان تمیز پیدا کرنے کے لیے عقل کی قوت اور اس کے علاوہ خدا کے بھیجے ہوئے رہبروں اور آسمانی کتابوں کے محتاج ہیں...... چونکہ یہ تمام امور خدا کی طرف سے ہیں...... لہٰذا ہم سب اسی کے محتاج ہیں۔

اگرچہ بعض مفسرین کرا[1] کا خیال ہے کہ درحقیقت یہ آیت ان لوگوں سے مخاطب ہے جو پیغمبرؐ کی طرف سے عبادت الٰہی کی تاکید کے جواب میں کہتے تھے کہ آیا خداوندِ عالم ہماری عبادتوں کا محتاج ہے؟ ان کے اس تعجب انگیز بیان کے جواب میں قرآن نے کہا...... تم خود ہی اس کے محتاج ہو اور اس کی عبادت کے سائے میں اپنے جسم و روح کو کمال کی منزل پر فائز کرتے ہو۔

لیکن یہ خیال بھی آیہ کریمہ کے مختلف پہلوؤں اور مفہوم میں وسعت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا، کیونکہ خدا کی بے نیازی اور ہماری احتیاج بہت سے مسائل کے حل کی واحد بنیاد ہے۔ یہ فقر و احتیاج تمام انسانوں کی ذات کی گہرائی بلکہ تمام موجودات کی اصل و بنیاد میں داخل ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ فقر و احتیاج محض اور بنیادی ضروریاتِ زندگی تک محدود ہو بلکہ ان کا اصل وجود ہستی بھی لحہ بہ لحہ اس کردگار عالم کے فیض کی محتاج ہے...... اگر ایک لحہ کے لیے بھی مخلوق میں بے نیازی کا احساس پیدا ہو تو دنیا تہہ و بالا ہو جائے اور اجسام ٹوٹ پھوٹ جائیں۔

ہاں...... اس عالم ہستی میں صرف ذاتِ الٰہی ہے جو ہر لحاظ سے بے نیاز ہے، انسان کہ جو قدرت کا عظیم شاہکار اور جہانِ خلقت کا لہلہاتا پھول ہے...... جب وہی سر سے پاؤں تک ذاتِ الٰہی کا محتاج ہے تو پھر دوسری موجودات کا حال خود بخود معلوم ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں یوں ارشاد ہوا: واللہ ھو الغنی الحمید" (صرف خدا ہی ہے جو بے نیاز اور ہر قسم کی حمد و ثناء کا مستحق ہے) چونکہ یہ جملہ ادبی اصولوں کی روشنی میں ''حصر'' پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا اس مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ مطلق غنی و بے نیاز صرف اور صرف خدا کی پاک ذات ہی ہے اگر انسانوں میں کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ غنی ہے اور وہ فقیر...... تو یہ تقسیم حقیقی نہیں نسبی ہے یعنی وہ شخص دوسرے کی نسبت غنی ہے اور فلاں شخص فلاں شخص کی نسبت فقیر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ تمام موجودات سراپا فقر و احتیاج ہیں۔ جب کہ ذات پاک الٰہی سراسر غنی و بے نیازی ہے اور یہی پہلی اور آخری بات ہے۔

بنابریں خدا کی ہرگز ہماری اطاعت و عبادت کی احتیاج نہیں اور نہ اسے ہماری مدح و ثناء کی ضرورت ہے، بلکہ روحانی تکامل کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ ہم جس قدر اس مبداء نور کے قریب تر ہوں گے اتنا ہی زیادہ نور اور روشنی پائیں گے اور جس قدر اس سرچشمۂ فیض کے نزدیک ہوں گے اتنا ہی زیادہ فائدہ اٹھائیں گے۔ اس کی ایک نہایت ناقص سی مثال یہ ہے کہ ہم اس گھاٹ پات اور درختوں کی طرح ہیں جو اپنے آپ کو سورج کی روشنی کے سامنے لاتے ہیں تا کہ روشنی پا سکیں جبکہ سورج کو ان کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اس حقیقت کا ادراک انسانوں کو توحید اور یکتا پرستی کا درس دیتا ہے کہ وہ اس کے سوا کسی کے در پر نہ جھکیں، اس کے غیر کے سامنے سر تسلیم و تعظیم خم نہ کریں اور صرف اس کے سامنے دست سوال دراز کریں کہ وہی غنی و بے نیاز، رحم و کریم اور عنایتوں اور مہربانیوں والا ہے۔

اس حقیقت پر توجہ کرنا انسان کی تربیت پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ ایک تو یہ اسے غرور اور خود پرستی کی سواری سے نیچے اتارتا

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی اور تفسیر روح المعانی میں مورد بحث آیت کے ذیل میں دیکھیں۔

ہے......دوسرے اسے ہر قسم کی وابستگیوں سے آزاد کردیتا ہے اور خدا کے علاوہ ہر ایک سے بے نیاز کر دیتا ہے۔اس ادراک کی بدولت وہ عالم اسباب میں گم اور گمراہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی نگاہیں ہمیشہ صرف اور صرف ذات کردگار ہی کو مسبب الا سباب مان کر اسی پر جمی رہتی ہیں۔

اس مقام پر دو اہم مطالب پر توجہ کرنا ضروری ہے......پہلی بات یہ کہ خداوند عالم کی صفت ''غنی'' کے بعد اس کی صفت ''حمید'' لائی گئی ہے اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ قرآن مجید میں اس صفت کا ذکر دس بار ہوا ہے، اس سے اس میں پائے جانے والے اہم نکتے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ممکن ہے وہ اہم نکتہ یہ ہو کہ عام طور پر اغنیاء و مالدار لوگوں میں مذموم صفات مثلاً تکبر، غرور، حرص اور بخل وغرہ موجود ہوتی ہیں حتیٰ کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کے بھائی کے پاس ایک بکری ہو اور خود ان کے پاس ننانوے بکریاں ہوں تو وہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک بکری بھی ان کے پاس آجائے اور ایک بکری والا اس سے بھی محروم ہو کر رہ جائے۔لہٰذا غنی و ثروت مند کا لفظ اکثر ذہنوں میں ظلم و تکبر اور بخل و کنجوسی کی علامت بن چکا ہے۔......لیکن خداوندِ عالم ''غنی'' ہونے کے ساتھ ساتھ رحیم، مہربان، عطا کرنے والا اور سخی بھی ہے۔اسی وجہ سے ہر طرح کی مدح و ستائش کے لائق ہے۔

ہاں......وہ غنی جو ہر عیب (نقص سے پاک اور فضل و کرم، لطف و عنایت اور رحمت والا ہے۔وہ صرف اور صرف خدائے قدوس ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں خطاب انسانوں سے ہو رہا ہے اور وہی اس کے مخاطب ہیں (یاایہا الناس) اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام دیگر موجودات بھی ''فقیر الی اللہ'' خدا کی محتاج ہیں تو صرف انسانوں ہی کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے؟ اس کے جواب میں اکثر مفسرین کرام نے کہا ہے کہ جو چیز درجہ کمال پر ہو اس کا دائرہ احتیاج بھی وسیع ہوتا ہے۔اس لیے انسان کی احتیاجات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔وہ اپنی زندگی کے سفر میں احتیاجات کا طویل راستہ طے کرتا ہے۔اس لیے اس کی ضرورتیں بھی زیادہ ہیں۔اور وہ ان ضرورتوں اور حاجتوں کا احساس بھی زیادہ کرتا ہے......جیسا کہ مادی احتیاجات میں بھی ایسا ہی ہے۔مثلاً ایک پرندہ سادہ سے آشیانے اور تھوڑی سی غذا پر قناعت کرتا ہے، جبکہ قسم قسم کے محلات و مکانات طرح طرح کے ملبوسات اور کثیر التعداد پکوان بھی انسانی روح کو سیر نہیں ک[1] رتے

دوسری آیت ''انفاق فی سبیل اللہ'' کے سلسلے میں ہے کہ جس میں کچھ لوگ بخل اور کنجوسی کرتے ہیں۔جو لوگ اس میں بخل سے کام لیتے ہیں، حقیقت میں وہ اپنے آپ سے بخل کرتے ہیں (کیونکہ وہ خدا کے فیض و رحمت سے محروم ہوجاتے ہیں) اس مقام پر ارشاد ہوتا ہے: **واللہ لغنی وانتم الفقراء** (خدا بے نیاز ہے جب کہ تم محتاج ہو) ممکن ہے کہ خدا کے غنی و بے نیاز ہونے و ہمارے فقیر و محتاج ہونے کا ذکر اس خاص انداز میں اس لیے ہو کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ''انفاق فی سبیل اللہ'' کا حکم خدا نے اس لیے دیا کہ اسے ہمارے انفاق (خرچ کرنے

---

[1] بعض مفسرین نے اس مقام پر اس نکتے کی طرف بھی توجہ کی ہے کہ آیت میں ''الفقراء'' کا لفظ معرفہ ہے۔جب کہ ادبی لحاظ سے عام طور پر خبر نکرہ ہوتی ہے کیونکہ معرفہ ہونے کی صورت میں جب کہ مخاطب کو اس آیت پہچان ہوجاتی ہے۔تو پھر خبر کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی) اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر مقصد یاد آوری اور توجہ دلانا ہے یعنی مخاطب بھی جانتا ہے کہ وہ خدا کا محتاج (فقیر الی اللہ) ہے لہٰذا اس کا ذکر صرف یاد آوری کے لیے ہے۔اور علم بلاغت میں ہے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو جانتا ہو لیکن اس پر عمل نہ کرتا ہو تو اسے یاد دلانے کے لیے اسے جاہل فرض کرنا پڑتا ہے۔تا کہ وہ عمل کرنے کی طرف مائل ہو۔(غور کریں)

) کی ضرورت وحاجت ہے یا یہ جملہ سابقہ جملے۔ ''ولا یسئلکم اموالکم'' (خدا تمہارے اموال میں سے کچھ نہیں مانگتا) ارشاد ہوا خداوندِ عالم غنی مطلق ہے اور سب اس کے محتاج ہیں اگر خدا نے لوگوں کو ''انفاق فی سبیل اللہ'' (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) کا حکم دیا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کا محتاج ہے بلکہ یہ حکم خود ان ہی کے حاجت مند ہونے کے پیش نظر دیا گیا ہے کہ لوگ اس طریقے سے حصولِ کمال کا راستہ آسانی سے طے کرسکتے ہیں اور خدائے متعال کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آیت کا آغاز ''مالی فقر وغنی'' سے متعلق ہے اور یہ ''انفاق فی سبیل اللہ'' کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کے ذیل میں آخری جملے کے مطلق ہونے کی وجہ سے پتہ چلتا ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے یہ آیت جس طرح خدا کو غنی مطلق کا نام دیتی ہے اسی طرح انسان کو سراپا احتیاج بناتی ہے ایسا محتاج کہ فقر واحتیاج اس کی ذات کی گہرائی تک پہنچ چکا ہے اس لیے اس آیت کو اس بحث میں دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے بہر حال قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ سب نعمتیں خدا نے ہی اپنے بندوں کو عطا کی ہیں اور پھر انہیں ان نعمتوں کو اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کہا ہے کہ جو ان نعمتوں میں اضافے کا ذریعہ ہے یہ مفاد صرف مسئلہ انفاق ہی میں نہیں بلکہ خدا کی طرف سے دیئے گئے تمام احکامات میں جاری وساری ہے کیونکہ ان تمام اعمال کے نتائج خود بندوں ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ چیز قرآن کی متعدد آیات میں ذکر ہوئی ہے۔ جیسے سورۂ سبا کی آیت ۴۷ میں ہے: ''قل ماسالتکم من اجر فھو لکم ان اجری الا علی اللہ'' کہہ دیجئے کہ میں نے جو اجر تم سے مانگا ہے۔ وہ خود تمہارے ہی لیے ہے میرا اجر تو خداوند عالم کے پاس ہے) سورۂ عنکبوت کی آیت ۶ میں آتا ہے: ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ ان اللہ لغنی عن العالمین, جو شخص جہاد کرے وہ اپنے ہی لی جہاد کرتا ہے، بے شک خدا تو کائنات سے بے نیاز ہے)۔

اس بحث کی تیسری اور آخری آیت میں موجودات کی احتیاج اور خدا کا غنی مطلق ہونا ایک نہایت عمدہ اور نئے انداز میں بیان کیا گیا ہے......ارشاد ہوتا ہے۔ :یسئلہ من فی السمٰوٰت والارض'' (آسمانوں اور زمین میں رہنے والے سبھی اس سے مانگتے ہیں) اور وہ بھی ہر روز نئی عنایتوں اور نئی شان کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے (کل یوم ھو فی شان) چونکہ آیت میں ''یسئل'' فعل مضارع کے ساتھ آیا ہے جو استمرار اور ہمیشگی کو ثابت کرتا ہے لہٰذا یہ آیت وسیع معنی رکھتی ہے اور تمام انسانوں، فرشتوں اور آسمان وزمین کے رہنے والوں کو شامل ہے (بلکہ قوی امکان یہ ہے کہ تمام موجودات عالم (عاقل وغیرہ عاقل) اس میں آجاتے ہیں۔ لفظ ''من'' کا استعمال جو صرف عاقل افراد کے لیے مخصوص ہے وہ غلبہ کی بنیاد پر ہے) چونکہ اس آیت میں مانگنے کا موضوع (مانگی جانے والی چیز) بھی مذکور نہیں......اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مفہوم وسیع ہے وہ یوں کہ جہان خلقت کی تمام موجودات زبان سے زبانِ حال سے ہمیشہ اور مسلسل اس چشمۂ فیض سے وجود وہستی کا فیض اور اس سے متعلق امور کا فیض طلب کرتے ہیں کیونکہ ممکن الوجود مخلوق کی ذات ہی میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ ''حدوث'' ہی میں نہیں بلکہ اپنی بقاء میں بھی ہر لحظہ ذات واجب الوجود کی محتاج ہے اور اس سے اپنی ہستی و وجود کی طلب گار ہے۔

تفسیر روح البیان اور تفسیر روح المعانی میں قریباً ایک جیسے الفاظ وعبارت میں یہ ذکر ہوا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بسنے والی تمام مخلوق اپنی ذات اپنے حدوث وبقا اور دوسری تمام جہتوں اور پہلوؤں میں اپنی احتیاجات کو ہمیشہ کے مطالبے کی صورت میں خدا کے حضور پیش

کر رہی ہے۔ کیونکہ وہ سب ''ممکن الوجود'' ہونے کے ناطے اپنی ذات کے لحاظ سے وجود اور اس کے کمالات سے محروم ہیں وہ یوں کہ اگر عنایت الٰہیہ سے ان کا رابطہ ایک لمحہ کے لیے بھی منقطع ہو جائے تو ان میں ''وجود'' کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ لہٰذا وہ اس لحاظ سے ہر لحہ سائل اور دستِ نیاز دراز کیے ہوئے ہیں[1]

مذکورہ بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اس آیت میں مخلوق کا خالق سے مانگنا اور اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا صرف رزق وروزی یا رحمتِ خداوندی اور دین و دنیا کی احتیاجات یا اپنی عاقبت اور خوش بختی و بدبختی سے آگاہ ہونے سے تعلق رکھتا ہے......ان کا یہ خیال کسی ٹھوس دلیل کے بغیر ہے۔ اگرچہ یہ سب احتیاجات اس آیت کے وسیع مفہوم میں آجاتی ہیں......لیکن ان پر انحصار ثابت نہیں ہے۔

# توضیحات

## (۱)۔ برہان وجوب وامکان فلسفی نقطۂ نظر سے:

یہ برہان ودلیل ان دلائل میں سے ایک ہے جنہیں سب لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اسے عوام الناس کے عام انداز اور سادہ زبان نیز فلسفہ کی مخصوص اصطلاحات وتعبیرات کے ساتھ بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔

عام اور سادہ الفاظ میں اس طرح کہ......جب ہم اپنی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنے آپ کو سراپا احتیاج پاتے ہیں۔ ایسی احتیاج کہ جسے ہم اپنے وجود کی اندرونی قوت سے پورا نہیں کر سکتے۔ اس احتیاج کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے وجود سے باہر کی دنیا کی طرف دستِ سوال دراز کریں، اس سلسلے میں ایک مشہور ضرب المثل ہے جو جس قدر غنی ہوگا اسی قدر محتاج بھی ہوگا۔ پس کوئی انسان (مادی یا معنوی لحاظ سے) جس قدر طاقت ور ہوگا......اس کی احتیاجات اس قدر وسیع ہوں گی۔ ایک جنگلی پرندہ تھوڑے سے دانے پانی اور درخت کے ایک پتے کے برابر آشیانے پر راضی وخوش ہے۔ لیکن ایک مقتدر بادشاہ کی زندگی میں ہزاروں ضرورتیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک بڑے محقق کی ضرورتیں ایک عام طالب علم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں......اس مشاہدے سے انسان اپنے وجدان کے ذریعے اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ اس کائنات میں غنیٰ وبے نیازی کا ایک ایسا سرچشمہ موجود ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں اور وہی ذاتِ والاصفات ہے جسے ہم ''خدا'' کہتے ہیں۔

علم کلام اور فلسفے ی رو سے اس مسئلے کا اس طرح ذکر کیا جا سکتا ہے کہ......''وجود'' کی دو قسمیں ہیں، ایک ''ممکن'' اور دوسری ''واجب''......واجب الوجود اسے کہتے ہیں جس کا وجود ذاتی ہو اور اس کی ہستی خود اس کی ذات ہی سے ہو اور اس کی ذات میں کسی قسم کی کوئی احتیاج نہ ہو جب کہ ممکن الوجود وہ جو خود کچھ نہیں رکھتا بلکہ سراپا احتیاج اور حاجت مند ہے یہی وجہ ہے ممکن الوجود کا علت کی طرف محتاج ہونا ایسے بدیہی اور واضح امور میں سے شمار کیا گیا ہے جس کے لیے کسی قسم کی دلیل و برہان قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور کوئی شخص اس سلسلے میں

[1] تفسیر روح البیان جلد ۹ صفحہ ۲۹۹ تفسیر روح المعانی، جلد ۲۷ صفحہ ۹۵

شک کا شکار ہوتو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''ممکن'' ''الوجود'' کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکا ہے۔
اب سوال ہے کہ ممکن الوجود کیوں علت کا محتاج ہے اور اس کی احتیاج کی اصلی وجہ کیا ہے؟ آیا اس کی موجودیت یعنی اس کا موجود ہونا اس کی وجہ سے یا اس کا ''حدوث'' اور نو پید ہونا اس کا سبب ہے؟ یعنی اشیاء ''حادث'' ہیں، اس لیے علت کی محتاج ہیں۔ نہ اس لیے کہ موجود'' ہیں یا یہ کہ اصل وجہ نہ ان کا وجود ہے اور نہ ہی ان کا حدوث...... بلکہ اصل وجہ صرف امکان ''یعنی ان کا ممکن الوجود ہونا ہے کہ جس سبب سے وہ علت کے محتاج ہیں۔ لہٰذا ان کے محتاج ہونے کی علت وسبب کو ان کے اصل وجود یا ان کے حدوث میں نہیں ڈھونڈ نا چاہیے۔ بلکہ ان کے احتیاج کی اصل وجہ وعلت ان کا ''امکان'' ''ممکن الوجود'' ہونا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تین جوابات میں سے صحیح جواب تیسرا ہے۔ کیونکہ اگر ہم امکان کے معنی کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور اس کی اصل بنیاد کو درک کر لیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں ''علت کی حاجت'' پوشیدہ ہے۔ یعنی ''ممکن الوجود'' اسے کہتے ہیں جسے فلاسفہ نے اپنی اصطلاح میں ''لا اقتضاء'' سے تعبیر کیا ہے کہ اس کی ذات نہ تو ''وجود'' کی طلب واقتضاء ہے اور نہ ہی ''عدم'' کی...... تو اس کے اپنی ذات میں بے حقیقت ہونے کے سبب اس کے وجود وعدم کے لیے کسی عامل کی ضرورت ہے...... اس لیے فلاسفہ کہتے ہیں ''حاجة الممكن اولية'' یعنی ممکن الوجود کا محتاج علت ہونا ایک بدیہی امر ہے۔
مذکورہ بیان سے ایک اور نتیجہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ممکن الوجود کا واجب الوجود کی طرف محتاج ہونا صرف ابتداء وجود میں نہیں بلکہ اس کی بقاء کے تمام مراحل میں یہ احتیاج باقی ہے اور یہ احتیاج رہے گا گویا امکان اور احتیاج ہر دو لازم وملزوم ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ جب ہم قلم ہاتھ میں لے کر کاغذ پر کچھ لکھنے کے لیے اسے حرکت دیتے ہیں تو اس قلم کا چلنا اپنے سے باہر کی قوت کا محتاج ہے اور وہ ہماری انگلیاں ہیں جب ہمارا ہاتھ اور انگلیاں حرکت میں ہیں تو قلم بھی چل رہا ہے پھر جونہی ہاتھ اور انگلیاں رک گئیں تو قلم بھی رک گیا۔ اس سے بھی واضح مثال ہماری رُوح کے افعال ہیں۔ مثلاً ہم ارادہ کرتے ہیں کہ فلاں کام کو بجا لائیں...... یہ ارادہ ہماری رُوح کا ایک فعل ہے اور اسی سے وابستہ ہیں اور ہمارا یہ وجود اپنی وابستگی کے پیش نظر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا ہماری اس وابستگی اور ہر لمحہ ذاتِ حق تعالیٰ سے احتیاج کو ایک فارسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے:ـ

نے زنالہ واماندچوں زلب جدا ماند

وای اگر دل خودرا ازخدا جدا داری

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ جب کوئی معمار ہمارا مکان بناتا اور پھر کسی وقت اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو ہمارا مکان اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ امکان موجود ہے کہ کوئی ''فعل'' اپنی بقاء میں ''فاعل'' کا محتاج نہ ہو۔ اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ یہ بقاء اس وجہ سے ہے کہ ایک علت کی جگہ دوسری علت نے لے لی ہے وہ یوں کہ ابتداء میں معمار کے تجربہ کار ہاتھوں نے اینٹوں کو نہایت مناسب اور موزوں طریقے سے لگایا۔ یعنی اس نے ایک اینٹ پر دوسری اینٹ اس طرح رکھی کہ اب اینٹوں کا بوجھ، ان کی قوت جاذبہ اور گارے یا سیمنٹ کی پیوستگی اس مکان کو باقی رکھے ہوئے ہے۔

خلاصہ یہ کہ ممکن الوجود کا ''ایک ''ربطی'' وجود ہے یعنی کسی کے ساتھ مرتبط ہے جب اس کا ربط کسی مستقل اور ہمشہ پابر جا وجود سے نہیں ہوگا تو وہ قائم نہیں رہ سکے گا۔ بنابریں ایک ''ربطی وجود'' کو اچھی طرح سمجھ لینا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ اس سے ہم ایک ''مستقل وجود'' کا سراغ لگا سکیں۔ اگر ایسا ہوجائے تو پھر طویل بحثوں اور ''دور و تسلسل'' کی گہرائیوں میں جانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ (غور کریں)

## (۲)......اسلامی روایات میں دلیل غنیٰ وفقر کا ذکر:

امام حسین علیہ السلام کی مشہور و معروف دعاء روز عرفہ جو معصومین علیہم السلام کی ان بلند پایہ دعاؤں میں سے ہے کہ جن خصوصاً مسائل توحید نہایت عمیق اور عظیم مطالب کے ساتھ مذکور ہیں۔

اس دعا میں امام علیہ السلام یوں فرماتے ہیں۔

''کیف یستدل علیك بما هو فی وجودہٖ مفتقر الیك؟ ایکون لغیرك من الظهور مالیس لك حتیٰ یکون هو المظهر لك۔ [۱]

''جو موجودات اپنے وجود ہی میں تیرے محتاج ہیں ان کے ذریعے تیری ذات پر کیونکر استدلال کیا جاسکتا ہے؟ کیا کوئی تجھ سے زیادہ ظاہر و جلوہ نما ہے۔ کہ وہ تیری ذات کی پہچان کروائے؟''

اسی دعا میں ایک اور مقام پر اس طرح ارشاد فرمایا:

''الٰهی انا الفقیر فی غنای فکیف لا کون فقیراً فی فقیری''۔

خدایا! میں اپنی غنا و تونگری کی حالت میں تیرا محتاج ہوں تو اپنے فقر و ناداری میں کیسے تیرا محتاج نہ ہوں گا۔

ایک مشہور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے۔

''الفقر فخری وبهٖ افتخرُ'' [۲]

''فقر میرا فخر ہے اور میں اس پر ناز کرتا ہوں۔

اس روایت کی ایک مشہور توضیح اس طرح کی گئی ہے کہ آنحضرتؐ نے فقر کو اپنے لیے فخر و مباہات کا سبب اس لیے قرار دیا کہ خدا کے حضور اپنی ذات میں فقر کا احساس ہی سرمایہ افتخار ہے۔ یہاں فقر کا مطلب تنگ دستی اور مخلوق کی طرف احتیاج نہیں ہے۔ کیونکہ روایات میں اس

---

[۱] اس جملے سے ''برہان صدیقین'' میں بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ مذکورہ برہان میں اسے وضاحت سے بیان کیا جائے گا۔

[۲] بحار الانوار جلد ۶۹ صفحہ ۵۵ (بیروت) تفسیر روح البیان، جلد ۷ صفحہ ۳۳۴۔

کی مذمت آ چکی ہے:

"كَادَ الفقران يكون كفرًا۔ [۱]

''قریب ہے کہ فقر و تنگدستی کفر قرار پائے۔''

یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض کیا:

"اللهم اغنى بالافتقارِ اليك ولا تفقرنى بالاستغناء عنك۔ [۲]

''خدایا! اپنی طرف احتیاج کی بدولت مجھے (اپنے غیر سے) بے نیاز فرما اور اپنی ذات سے استغناء و بے نیازی کے احساس سے مجھے (کسی کا) فقیر و محتاج نہ بنا۔''

ہر چہ جز عشق حقیقی شد، وبال!
ہر چہ جز معشوق باقی شد، خیال
ہست درد صلت غنا اندر غنا!
ہست درہجرت غم وفقر وعنا!

عشق حقیقی کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ وبال اور مصیبت ہے، معشوق کے سوا جو کچھ باقی ہے اور خیال ہی خیال ہے، تیرے وصل میں غنا اور غیروں سے بے نیازی ہے، تیرے ہجر میں غم فقر و تنگی اور مشکلات ہیں۔

---

[۱] بحارالانوار، جلد ۶۹ صفحہ ۳۰۔

[۲] سفینۃ البحار، جلد ۲ صفحہ ۳۷۸، تفسیر روح البیان، جلد ۷، صفحہ ۳۲۴۔

# برہانِ علت و معلول

## اشارہ:

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جس دنیا میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہ علت و معلول کا ایک مجموعہ ہے......اور''علیت'' اس دنیا جہان کا ایک نہایت واضح اصول وقانون ہے۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ ہم یہ کرہ ارض کہ جس پر ہم زندگی گزار رہے ہیں...... ہمیشہ سے نہیں تھے بلکہ کسی علت کا معلول ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آیا ''علت و معلول'' کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے...... یہ یونہی چلتا رہے گا اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے؟ اگر ایسا ہو تو اس سے تسلسل لازم آئے گا یعنی ہر علت، اپنے مقام پر کسی اور ''علت'' کی معلول ہوگی اور یہ سلسلہ کہیں بھی ختم نہیں ہوگا یعنی کوئی ایسی انتہا نہیں ہوگی کہ پھر ''علت'' کی ضرورت نہ ہو۔

یہ ایسی بات ہے کہ جسے وجدان تسلیم نہیں کرسکتا...... یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم صفر (۵) کو لامتناہی صورت میں یک جا کریں، ایک دوسرے کے ساتھ رکھیں اور وہ ''ایک'' کا عدد بن جائیں؟ (اس مثال میں صفر سے مراد وہ شئے ہے جو اپنی ذات میں اپنا کوئی وجود ہستی نہیں رکھتی......اس کا وجود خود سے نہیں...... بلکہ ''علت'' کی وجہ سے وجود میں آتی ہے) تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ سب فقیر و محتاج لامتناہی صورت میں یکجا ہو جائیں اور ان کے اکٹھے ہونے سے ایک غنی و بے نیاز کا وجود تحقیق پذیر ہو جائے۔

بنابریں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ ''علت و معلول'' کا یہ سلسلہ بالآخر ایک ایسے مقام پر جا کر رک جائے گا کہ جہاں صرف علت ہی ہو اور معلول نہ ہو......یعنی اس کا وجود خود سے ہو، اگر اس بات کی گہرائی میں جائیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ آخری علت، خود سے موجود، لامتناہی ہستی اور واجب الوجود ہے۔

خداوند عالم کے ازلی وابدی ہونے کی یہ نہایت واضح دلیل ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وجود خدا کے اثبات کے لیے قائم کی جانے والی تمام دلیلوں کی بازگشت اسی ''برہان علت و معلول'' کی طرف ہوتی ہے اور اس سے استفادہ کیے بغیر ہر دلیل و برہان ناممکن اور ناقص رہتی ہے۔اس مختصر اشارے کی روشنی میں ہم چند آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

(۱) اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ اَمۡ ہُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾ (الطور: ۳۵)

(۲) اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۳۶﴾ (الطور: ۳۶)

(۳) اَمۡ لَہُمۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۴۳﴾ (الطور: ۴۳)

(۱) ''کیا وہ کسی سبب کے بغیر ہی پیدا ہو گئے یا پھر خود ہی اپنے خالق ہیں؟''

(۲) ''کیا آسمانوں اور زمین کو انہوں نے پیدا کیا ہے، بلکہ وہ یقین سے محروم ہیں۔''

(۳) ''کیا خدا کے علاوہ ان کا کوئی معبود ہے؟ خدا اس سے پاک ہے جسے وہ اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔''

## الفاظ کی تشریح:

''خلقوا'' کا مادہ ''خلق'' ہے...... اس کا معنی صحیح طور پر اندازہ گیری کرنا ہے کسی اصل و مادہ اور کسی سابقہ مثال کے بغیر ایک چیز کا ایجاد کرنا اور بنانا بھی ایک طرح کی اندازہ گیری ہی تصور کی جاتی ہے جو اس کے تمام پہلوؤں سے متعلق ہو...... اسی طرح یہ لفظ (خلق) ''ابداع'' بغیر نمونے کے بنانے اور نئی تخلیق کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہ لفظ ایک چیز سے دوسری چیز بنانے کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۂ نحل آیت (۴) میں ارشاد ہوا: خلق الانسان من نطفةٍ (خدا نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا)۔

یہ ایک واضح امر ہے کہ ''خلقت'' ابداع اور عدم سے وجود میں لانے کے معنی میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا...... لہٰذا اس طرح کی خلقت اور تخلیق کی خدا کے علاوہ ہر ایک سے نفی کی گئی ہے چنانچہ ارشاد فرماتا ہے۔

اَفَمَنۡ یَّخۡلُقُ کَمَنۡ لَّا یَخۡلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۱۷﴾ ﴿النحل: ۱۷﴾

''کیا وہ جو ابداع و ایجاد کرتا ہے اور وہ جو ایسا نہیں کرتا دونوں برابر ہیں؟ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے ہو۔'' البتہ دوسرا معنی یعنی کسی چیز کا کسی اور چیز سے تخلیق کرنا اور اس کی اندازہ گیری کرنا...... خدا کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس مفہوم کو سورۂ مومنون کی آیت (۱۴) میں یوں بیان کیا گیا ہے:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ﴿۱۴﴾ ﴿المؤمنون: ۱۴﴾

''بابرکت ہے وہ خدا جو سب تخلیق کرنے والوں میں احسن اور بہتر ہے۔''

یہ لفظ ''خلق''، کبھی جھوٹ کے معنی میں بھی آتا ہے شاید یہ اس لیے ہو کہ جب کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو گویا ایک ایسی چیز ایجاد کرتا ہے جو موجود نہیں ہوتی اور وہ اسے زبان سے بول کر خلق کرتا ہے۔

کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں لفظ ''خلق'' کے دو بنیادی معنی ذکر ہوئے ہیں ایک اندازہ گیری (ناپ تول) اور دوسرے صاف و نرم ہونا...... یہی وجہ ہے کہ ایک صاف اور نرم پتھر کو ''صخرۂ خلقاء'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ پرانی چیزیں جو کافی عرصہ گزر جانے کے باعث صاف

اور نرم ہوجاتی ہیں۔ان پر بھی لفظ ''بروزن''شفق''استعمال کیا جاتا ہے نیز لفظ ''اخلاق'' جس کا معنیٰ ''اچھی اور پسندیدہ عادات'' ہے......وہ پہلے معنی یعنی اندازہ گیری سے لیا گیا ہے۔( کیونکہ وہ انسان کی شخصیت اور روحانی قدروں کی صحیح اندازہ گیری کرتی ہے )۔

# تفسیر آیات

## ایک عجیب سوال:

مذکورہ آیات سورۂ طور کی نو آیات میں سے ہیں......اس مقام پر مجموعی طور پر گیارہ سوالات ہیں جو استفہام انکاری کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ آیات انسان کو ملے جلے سوالات کے عجیب سے موڑ پر لا کھڑا کرتی ہیں اور پھر اسے اپنی ہی عقل کے سامنے اس طرح لاجواب کر دیتی ہیں کہ وہ حق کو تسلیم کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔

یہ گیارہ تین مقاصد سے متعلق ہیں......ایک توحید کا اثبات، دوسرے قیامت اور تیسرے نبی اکرمؐ کی رسالت......لیکن ان میں سے اہم اور بنیادی مسئلہ خالق کی توحید اور اس کی معبودیت ہے۔

مذکورۂ آیتوں (طور۔۳۵-۳۶،۴۳) میں سے پہلی آیت میں یوں ارشاد ہوا: **ام خلقوا من غیر شيءٍ ام هم الخالقونَ** (کیا وہ کسی سبب کے بغیر پیدا ہوئے یا وہ اپنے خالق خود ہی ہیں)

دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر انسان مخلوق اور حادث ہے اور وہ تین حالتوں سے خالی نہیں یعنی وہ کسی علت وسبب کے بغیر پیدا ہوا خود ہی اپنے وجود کی علت ہے یا اس کے وجود کی علت وسبب ایک ازلی وابدی وجود (خدا) ہے چونکہ پہلا اور دوسرا احتمال کسی طرح بھی عقل ووجدان کے مطابق نہیں ہے لہٰذا صحیح جواب وہی تیسرا احتمال ہے یہی وجہ ہے کہ آیات میں پہلے اور دوسرے احتمال کو ''استفہام انکاری'' کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے......جب یہ دونوں احتمال بھی سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ ہر انسان کسی اور علت کا معلول ہو وہ علت بھی اپنے مقام پر کسی اور علت کی معلول ہو اسی طرح یہ سلسلہ لا متناہی طور پر چلتا رہے......لیکن اس قسم کا احتمال عام طور پر فلاسفہ ہی دیتے ہیں اور عوام الناس اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں شاید اسی وجہ سے مذکورہ بالا آیت میں اس کا تذکرہ نہیں ہوا پھر بھی اس احتمال کا بطلان اور نادرست ہونا واضح ہے کیونکہ علت ومعلول کا تسلسل عقل ومنطق اور وجدان کی روشنی میں محال ہے اس سلسلے میں مزید وضاحت اور تفصیل ''توضیحات'' کے زیر عنوان بیان کی جائے گی۔

اس مقام پر اکثر مفسرین نے اس آیت کی کئی دیگر تفسیریں بھی ذکر کی ہیں لیکن الفاظ وعبارات کے مختلف ہونے کے باوجود سب کا ہدف ومقصد آفرینش اور مسئلہ تخلیق کسی ہدف ومقصد فرائض ووظائف امر ونہی جزا وسزا اور ثواب وعقاب کے بغیر نہیں ہوئی ہے......اس مفہوم کو سورۂ مومنوں کی آیت ۱۱۵ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا ﴿المؤمنون: ۱۱۵﴾ [1]

”کیا تمہارا خیال ہے کہ ہم نے تمہیں عبث اور بے مقصد پیدا کیا ہے:۔

لیکن آیت کے ذیل کو ملاحظہ کریں تو اس احتمال کی سرے ہی سے نفی ہوجاتی ہے کیونکہ اس میں آیا ہے۔ ام هم الخالقون (یا وہ خود خالق ہیں) اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا جملہ بھی انسان کی تخلیق کی علت وسبب کے بارے میں ہے نہ کہ اس کی تخلیق کے ہدف کے بارے میں دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس آیت کا تعلق اور توجہ علت فاعلی کی طرف ہےنہ کہ علت غائی کی طرف!

دوسری آیت میں آسمانوں کی خلقت کا تذکرہ ہے اور اس دلیل یعنی علت ومعلول کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں بھی پیش کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ام خلقو السمٰوٰت والارض (کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟) یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ آسمان اور زمین حادث اور نو پیدا ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ تغیرات وحوادث کا شکار ہوکرنت نئی حالت میں آتے ہیں جو چیز اس طرح کی ہو کہ اس میں ہر قسم کی تبدیلی آسکتی ہو وہ کبھی حادث ہونے سے بچ نہیں سکتی، اس صورت میں ان کے خالق کی بات سامنے آئے گی کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ آیا وہ آپ اپنے خالق ہیں یا ان کا کوئی خالق نہیں اور وہ یونہی پیدا ہوگئے یا انہیں انسانوں نے خلق کیا ہے؟

چونکہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے لہٰذا معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کا کوئی خالق ہے اور وہ ایسا ہے جو خود مخلوق نہیں بلکہ ازلی وابدی ہے اس مقام پر نہایت قابلِ توجہ اور دلچسپ بات ی ہے کہ اس آیت میں صرف انسانوں کے خالق کی بابت سوال ہوا ہے یعنی انسانوں کے خالق کے بارے میں استفہام انکاری کی صورت میں سوال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے احتمالات کے بارے میں پہلی دو آیات میں واضح بیان گزر چکا ہے۔ اس لیے فصاحت وبلاغت کا تقاضا ہے کہ اس کا دوبارہ ذکر نہ کیا جائے اور تکرار سے پرہیز کیا جائے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا دو آیتیں برہان علت ومعلول کو ”آفاق“ اور ”نفس“ دونوں کے لیے ذکر کررہی ہیں نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ دوسری آیت اس حقیقت پر گواہ ہے کہ بات علت فاعلی کی ہے نہ کہ علت غائی اور تخلیق کے ہدف کی بات ہوئی ہے۔

اس آیت کے آخر میں حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس موضوع کی بابت تمام مسائل واضح ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ لوگ خود ایمان ویقین کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے (بل لا یوقنون)

یقیناً حق واضح ہے لیکن لوگ حق کے دشمن اور جھگڑالو ہیں......درحقیقت یہ جملہ (بل لا یوقنون) اسی مفہوم کو بیان کرتا ہے جو سورۂ جاثیہ کی آیت ۴ میں آچکا ہے: (وفی خلقکم وما یبث من دآبۃٍ اٰیاتٌ لقومٍ یوقنون) (تمہاری تخلیق اور جو چلتے پھرتے حیوان زمین میں پھیلے ہوئے ہیں، ان سب میں ان لوگوں کے لیے واضح نشانیاں ہیں جو اہلِ یقین ہیں......اسی طرح سورۂ ذاریات کی آیت ۲۰ ہے کہ جس میں کہا گیا ہے: وفی الارض اٰیاتٌ للموقنین (زمین میں ان لوگوں کے نشانیاں موجود ہیں جو اہلِ یقین ہیں)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر المیزان، تفسیر روح المعانی اور تفسیر روح البیان میں اس مطلب کو آیت کے اصل معنی یا ایک احتمال کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اس بیان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں نے یقین پیدا کرلیا ہوتا اور اہل یقین بن چکے ہوتے تو نشانیوں کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ لہٰذا یہ بات ان لوگوں کے بارے میں ہے کہ جو یقین کی دولت سے محروم ہیں لیکن اسے حاصل کرنے اور حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ وتیار ہیں۔

چند مفسرین نے اس جملے کی تفسیر اس طرح کی ہے......انہیں یقین نہیں ہے کہ وہ خود آسمانوں اور زمین کے خالق ہیں بلکہ وہ خدا ہی کو ان کا خالق مانتے ہیں، جیسا کہ سورۂ لقمان آیت ۲۵ میں آیا ہے:

﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ﴾(لقمان:۲۵) [۱]

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا ہے۔

لیکن اس طرح تفسیر کرنا بظاہر کرنا بظاہر درست نظر نہیں آتا، اس سے بھی کمزور اور ناپختہ بات ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ آیت کا معنی یہ ہے: وہ لوگ اپنے اس قول پر پختہ یقین نہیں رکھتے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے......انہیں ایسا یقین نہیں ہے جو ان کو خدا کی اطاعت وبندگی کی طرف لے جائے۔ اس نظریے کا نادرست ہونا اسی سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان آیات میں خدا کا آسمانوں اور زمین کا خالق ہونا موضوع کلام ہی نہیں تو پھر اس جملہ میں کیونکر اس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

بالآخر تیسری آیت میں گذشتہ استدلال سے نتیجہ گیری کے طور پر اس طرح ارشاد ہوا: کیا خدا کے علاوہ ان کا کوئی معبود ہے؟ (ام لهم اله غیر الله) پاک ہے خدا اس سے کہ جو شرک وہ کرتے ہیں!

(سبحان الله عما یشر کون)

درحقیت یہ خدا کی توحید وحدانیت کی ایک دلیل ہے، یعنی جب وہ کائنات کا خالق ہے تو عبادت بھی صرف اسی کی ہونی چاہیے، نہ کہ بتوں کی، نہ سورج، چاند اور ستاروں کی اور نہ ہی ان کے علاوہ کسی مخلوق کی عبادت ہونی چاہیے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ان تین آیات میں جو تین سوالات ''استفہام انکاری'' کی صورت میں پیش کیے گئے ان کے علاوہ مزید سات سوالات بھی ان کے ساتھ ذکر کیے جاتے ہیں کہ جن کا تعلق نبوت اور دیگر موضوعات سے ہے......لہٰذا یہ بحث کہ جس کا تعلق توحید سے ہے، اس میں ان سوالات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے [۲]

---

[۱] تفسیر کشاف میں زمخشری نے اس مطلب کو تسلیم کیا ہے البتہ فخر رازی اور کچھ دیگر مفسرین نے سے ایک احتمال کے طور پر ذکر کیا ہے۔

[۲] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ فارسی، جلد ۲۲ صفحہ ۴۵۲ سے آگے دیکھیں۔

# توضیحات

## برہان علت و معلول فلسفہ و علم کلام میں

برہان علت ومعلول وجودِ خدا کے اثبات کے سلسلے میں قدیم ترین اور مشہور ترین دلیل ہے کہ جسے اس موضوع میں پیش کیا جاتا ہے، یونان کے قدیم فلاسفہ میں سے ''ارسطو'' جو میلادِ مسیح سے پہلے قرن چہارم میں ہو گزرا ہے......اس کے بعد سے آج تک سب فلاسفہ نے اسی دلیل کا سہارا لیا ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ توحید کے اثبات کے سلسلے میں جتنے دلائل پیش کئے گئے ہیں ''وہ برہان علیت'' کے بغیر نامکمل رہتے ہیں۔

اس دلیل واستدلال کی اصل بنیاد اساس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے درج ذیل امور سے آگاہی حاصل ہو۔

## (۱) قانون علیت کی تعریف:

علیت دو چیزوں کے درمیان ایسے وجودی رابطے کا نام ہے کہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو، یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ''علیت سے مراد (حوادث کا پے در پے ظاہر ہونا ہے۔علیت کی یہ تعریف ناقص ہے اصل بات یہ ہے کہ ہر ''معلول'' اپنی علت کے بعد ہی حادث ہوتا (وجود میں آتا) ہے لیکن علیت کے مفہوم کے لیے اتنا کہنا کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ وہ رابطہ اس طرح کا ہو کہ ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر وجود ہی میں نہ آسکے (صرف بعد میں آنا کافی نہیں ہے)۔

## (۲) قانون علیت کی وسعت وکارگزاری:

بعض محققین کے بقول، فلسفی مسائل میں قانون علت ومعلول سب سے پہلا اور قدیم ترین مسئلہ ہے کہ جس نے انسانی سوچ کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور اسے اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے وجود وہستی کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ جو شخص عظیم فکری صلاحیت کا مالک ہو اس کے لیے قانونِ علت ومعلول کی کلیت اور ہمہ گیری کا ادراک ہی اہم ترین فکری عمل ہے، کیونکہ یہ قانون انسان کے لیے اس امر کو واضح کرتا ہے کہ ہر ''حادث'' کے لیے علت'' ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ اس قانون کی روشنی میں انسان کے ذہن میں ''کیوں'' کا مفہوم جنم لیتا ہے......اگر انسان علت ومعلول کے کلی مفہوم کو نہ سمجھتا اور قانون علیت کو تسلیم نہ کرتا تو اس کے ذہن میں ''کیوں'' کا مفہوم کبھی پیدا نہ ہوتا[1]

حقیقت یہ ہے کہ وہ ''کیوں'' ہی ہے جو تمام انسانی علوم کے وجود میں آنے کا سبب ہے اسی نے انسان کو اس جہان ہستی کی موجودات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے حوادث وواقعات کے اسباب کو سمجھنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

---

[1] کتاب ''اصول فلسفہ جلد ۳ ص ۱۷۵ کے حاشیے سے اقتباس وتلخیص

دوسرے الفاظ میں تمام علوم کی اصل بنیادیہی قانون علیت ہے اور سب علوم اس کے آثار شمار کیے جاتے ہیں۔لہٰذا اگر یہ قانون ان علوم سے الگ کرلیا جائے تو ان کی اپنی کوئی حقیقت باقی نہیں رہے گی اسی طرح اگر علیت کا قانون ختم ہوجائے تو فلسفے کی بلند وبالا عمارت گر کر پاش پاش ہوجائے گی۔اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام علوم وافکار اور فلسفہ کی اصل بنیاد اور سہارا یہی قانون ہے۔

## (۳) قانون علیت کی شناخت کا سرچشمہ:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا کہ انسان نے قانون علیت کو کہاں سے پہچانا؟ یقینی بات ہے کہ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں بہت پیچھے جانا ہوگا اور اپنے بچپن کے حالات کی اس وقت سے چھان بین کرنا ہوگی۔کہ جب ہمیں عقل وشعور حاصل ہوا تھا۔

بچہ جب آگ کو چھوتا ہے تو جلن محسوس کرتا ہے،جب دوبارہ ایسا کرتا ہے تو اسے وہی احساس ہوتا ہے اور بار بار ایسا کرنے سے اس کو یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ ان دوچیزوں (آگ میں ہاتھ ڈالنے اور سوزش کا احساس کرنے کے درمیان ایک رابطہ اور تعلق ہے،اسی طرح جب وہ پیاسا ہوتا ہے اور پانی پیتا ہے تو پیاس کے ختم ہونے اور سکون حاصل ہونے کا احساس کرتا ہے پھر بار بار ایسا کرنے سے ان دو امور کے درمیان رابطے وہ تعلق کا یقین حاصل کر لیتا ہے جب وہ اس طرح کا تجربہ دوسرے موارد اور موضوعات میں کرے اور مختلف امور میں اس تجربے کو انجام دے تو اسے یہ یقین حاصل ہوجائے گا کہ ہر حادث اور نو پید چیز کی کوئی نہ کوئی علت ہے اس طرح وہ قانون علیت سے اجمالی طور پر آگاہ ہوجائے گا۔

پھر جوں جوں عمر گزرے گی اور وہ زندگی کے مختلف مراحل،روز مرہ کے معمولات ومعارف میں تجربات حاصل کرلے گا تو اس قانون (قانون علیت) کی وسعت کو مزید درک کرے گا (اور اس کے بعد فلسفی دلائل سے بھی اس قانون کو سمجھ لے گا) ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ دو حوادث کا پے در پے رونما ہونا اور وجود میں آنا ہی علت ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ کام (دوحوادث کا پے در پے ہونا) اس تکرار سے اور بار بار ہو کہ ان دونوں کے درمیان پایا جانیوالا رابطہ اور دوسرے کا پہلے سے وابستہ ہونا معلوم وواضح ہوجائے جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ قانون علیت کا تعلق تجربے سے ہے۔ان کی مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہر چیز کی اصل وبنیاد کو تجربے سے سمجھتا اور پھر عقلی تجزیہ وتحلیل کے ذریعے علیت کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔درحقیقت وہ ایک مقدمہ حس وتجربے سے اور دوسرا عقل وخرد سے حاصل کرتا ہے کیونکہ کلی قانون کا مقام ''عقل'' ہے اور وہ ہمیشہ عقل ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے......حس وتجربے کا کام مختلف موضوعات کو سمجھنا ہے،پھر عقل ان سب کو یک جا کر کے نتیجہ اخذ کر لیتی ہے۔

بعض دانشوروں کا نظریہ ہے کہ قانون علیت جو ایک علم حصول ہے وہ نفس کے علم حضوری سے حاصل ہوا ہے کہ جو نفس ہی کے افعال سے تعلق رکھتا ہے وہ اپنے اس خیال کی وضاحت میں کہتے ہیں کہ انسانی رُوح اپنے اندر کچھ ایسے امور کو محسوس کرتی ہے جو خود اسی سے وابستہ ہیں مثلاً ہر قسم کے تصورات،فکر وارادہ اور تصمیم یہ سب انسانی روح کے افعال اور اسی کے معلول ہیں ان افعال اور رُوح کے درمیان جو رابطہ ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے ہم قانون علیت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔انہوں نے اپنے اس نظریئے کی تصدیق میں ''بوعلی سینا'' کا یہ قول پیش کیا ہے: اگر

کوئی شخص یہ گمان کرے کہ علیت کے رابطے کو ''حس'' سے کشف کیا جاسکتا ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے کیونکہ قوت ''حس'' ہمیں دو چیزوں کے درمیان مقارنت کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھا سکتی[1]

لیکن یہ نظریہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے...... یہ بات بھی صحیح نظر نہیں آتی کہ ''بوعلی سینا'' کے بیان کا وہی مطلب ہو جوان دانشوروں نے لیا ہے۔ کیونکہ رُوح اور اس کے افعال کے بارے میں تجزیہ وتحلیل فلاسفہ کا کام ہے نہ کہ عام لوگوں کا...... جب کہ قانون علیت کو عام لوگ حتیٰ کہ بچے بھی سمجھتے ہیں اور اس کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں اس امر میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کہ انہوں نے یہ سب کچھ اپنے ''حسی'' وخارجی تجربات سے حاصل کیا ہے جس کی وضاحت ہم نے پہلے کردی ہے۔ البتہ جب تک عقل ان تجربات کا تجزیہ وتحلیل نہ کرے اور جزئی امور کو ایک کلیہ کی صورت میں پیش نہ کرے تو ہمارے پاس ''قانون علیت'' نام کی کوئی چیز موجود نہ ہوسکتی تھی۔ پس واضح ہوا کہ اس قانون کو جاننے پہچاننے کی بنیاد تجربہ ہے اور عقل بھی اس میں مدد دیتی ہے۔ شاید بوعلی سینا کا مدعاء بھی یہی ہے اور اس کے علاوہ مذکورہ نظریہ قابل قبول نہیں ہے تاہم اس امر سے ہمیں کوئی انکار نہیں کہ فلاسفروروں کے لیے قانونِ علیت کا پہچاننا جس طرح حس وحواس کے ذریعے امکان پذیر ہے۔ اسی طرح اسے افعال نفس کے ذریعے بھی اچھی طرح پہچانا جاسکتا ہے۔

ان کے علاوہ اس سلسلے میں ایک اور واضح دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ اگر ہم قانون علیت کا انکار کریں تو دنیا میں کوئی چیز کسی دوسری چیز کے وجود میں آنے کی شرط نہ ہوگی اور سب چیزیں اس طرح ہونگی کہ ہر چیز ہر دوسری چیز سے وجود میں آسکے۔ اس صورت میں ہمیں ہر قسم کے عقلی استدلالات کا بھی انکار کرنا ہوگا اور پھر کوئی منطقی نتیجہ حاصل کرنے کے لیے خاص دلائل سے استفادہ نہیں کیا جاسکے گا جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا اور کوئی عقل مند اسے قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ عقلی وخارجی تمام اُمور میں علیت کا رابطہ پایا جاتا ہے۔

## (۴) علت کی قسمیں:

علت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس کی بہت زیادہ قسمیں ہیں۔

علت تامہ: یعنی وہ چیز کہ جب بھی وہ وجود میں آئے تو بلا فاصلہ اس کا معلول بھی وجود میں آجائیگا۔ علت ناقصہ: یعنی اسی چیز جو اپنے معلول تک پہنچنے کے لیے کئی دیگر اُمور کی محتاج ہو۔

اسی طرح علت کی چار قسمیں ہیں کہ جو نہایت معروف ہیں۔ علت مادی، علت صوری، علت فاعلی اور علت غائی......انہیں ایک نہایت سادہ اور عام فہم مثال کے ذریعے بیان کیا جاسکتا ہے جو لباس ہم نے پہنا ہوا ہے اس پر غور کریں تو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی تیاری کے لیے سب سے پہلے ایک مواد (مثلاً روئی یا پشم کے کپڑے) کی ضرورت ہوتی ہے، پھر یہ ضرورت ہوتی ہے، کہ وہ مواد ایسی صورت میں تبدیل ہوجائے کہ جسے لباس کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔

---

[1] کتاب ''الشفاء فصل اول، پہلا مقالہ از الٰہیات صفحہ ۸۔

پس ایک ماہر درزی اسے لباس کی شکل دینے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کرے، ظاہر ہے کہ اس درزی نے اسے ایک خاص مقصد (پہننے) کے لیے بنایا ہے۔ اس طرح ایک لباس میں یہ چاروں علتیں وجود میں آ گئیں، یعنی ایک مواد ہے، جسے ''علت مادی'' کہتے ہیں، جو شکل وصورت اسے دی گئی ہے وہ ''علت صوری'' جس نے اسے لباس کی شکل دی ہے وہ ''علت فاعلی'' اور جس غرض کے تحت اسے بنایا گیا ہے اسے ''علت غائی کہتے ہیں یہ بات واضح ہے کہ ''برہان علت ومعلول'' جس کی بابت ہم یہ سب مطالب بیان کررہے ہیں۔ اس میں ہماری بنیادی توجہ ''علت فاعلی'' کی طرف ہے اور اسی پر ہماری تمام تر کاوش مرکوز ہے۔

## برہان علیت کی وضاحت:

مذکورہ مقدمات اور تمہیدی بیانات کے بعد اب ہم اصل ''برہان علیت'' کو بیان کرتے ہیں۔

برہان علت ومعلول درحقیقت چند بنیادوں پر استوار ہے:

(۱) یہ جہان جس میں ہم زندگی بسر کررہے ہیں ''حادث'' اور ''ممکن الوجود'' ہے۔

(۲) ہر ''حادث'' اور ''ممکن الوجود'' چیز کی بازگشت ''واجب الوجود'' کی طرف ہونی ضروری ہے...... دوسرے لفظوں میں تمام وابستہ وجود ایک مستقل وجود تک پہنچنے چاہئیں۔

پہلے مقدمے یعنی اس جہان کے ''حادث'' (نوپید) ہونے کی بابت ہم اس سے پہلے بہت کچھ بیان کرچکے ہیں اب ہم دوسرے مقدمے کے اثبات کی طرف توجہ کرتے ہیں:

یہ مقدمہ اس قدر واضح ہے کہ مادیین اور خدا کے وجود کا انکار کرنے والوں نے بھی اسے تسلیم کیا ہے، البتہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ''مادہ'' (MATTER) ہی ازلی، ابدی اور مستقل بالذات وجود ہے لیکن اس سلسلے میں اس سے پہلے جو دلائل ذکر کیے جاچکے ہیں ان کی روشنی میں ثابت ہوچکا ہے کہ ''مادہ'' ہرگز ازلی وابدی نہیں ہوسکتا اور اسے ''مستقل بالذات'' تسلیم کرنا غلط ہے اس کی مزید وضاحت کے لیے اس کی مزید وضاحت کے لیے اس سے بہتر کوئی دلیل نہیں ہوسکتی کہ جب ہم اس جہان کو ''حادث'' مان لیں تو درج ذیل پانچ صورتوں کے علاوہ کوئی چھٹی صورت نہیں ہوگی:

(۱) یہ جہان کسی علت کے بغیر وجود میں آیا۔

(۲) یہ جہان خود ہی اپنے وجود کی علت ہے۔

(۳) اس کا معلول ہی اس کی علت ہے۔

(۴) یہ خود ایک علت کا معلول ہے اور وہ علت ایک اور علت کی معلول ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی صورت میں چل رہا ہے۔

(۵) اس جہان ہستی کی تمام حادث موجودات ایک ایسے ازلی وابدی ''موجود'' سے وابستہ اور اس کے ساتھ قائم ومربوط ہیں جو ''ماوراء مادہ'' ایک حقیقت ہے یہ سب موجودات اس سے فیض پارہی ہیں اور علت ومعلول کا یہ سلسلہ بالآخر اس ''واجب الوجود'' تک جاپہنچا ہے

کہ جس کے بعد کوئی علت قابلِ تصور نہیں ہے۔

پہلی ''شق اور فرضیہ'' کہ جسے ''صدفۃ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ واضح طور پر نادرست اور باطل ہے کیونکہ اگر کوئی حادث چیز علت کی محتاج نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ''موجود'' (وجود رکھنے والا) ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے تحت وجود میں آ جائے جب کہ ایسا ہرگز نہیں بلکہ ہر حادث اور وجود میں آنے والی چیز کے لیے خاص حالات اور مناسب اسباب ضروری ہیں۔

اسی طرح دوسری شق اور فرضیہ یعنی یہ جہان اپنی علت خود ہی ہو، اس کا باطل اور نادرست ہونا بھی ایک بدیہی اور واضح امر ہے۔ کیونکہ یہ ضروری ہے کہ ہر علت اپنے معلول سے پہلے موجود ہو، اگر کوئی چیز خود ہی اپنے وجود کی علت ہو تو ضروری ہوگا کہ وہ اپنے آپ سے موجود ہو (اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ''وجود'' اور ''عدم'' یکجا ہو جائیں) اور یہ درست نہیں کہ اسی کو علمی اصطلاح میں ''دور'' کہتے ہیں۔

تیسری شق کا غلط اور نادرست ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں کیونکہ کسی چیز کا معلول ہی اس کی علت ہو...... یہ کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہے۔

چوتھی شق یعنی علت و معلول کے سلسلے کا لامتناہی طور پر چلنا ان امور میں سے ہے جن کے نادرست ہونے کے لیے عقلی فیصلہ ہی کافی ہے، کیونکہ عقل کا فیصلہ ہے کہ ہر معلول کے لیے علت کا وجود ضروری ہے۔ اگر یہ سلسلہ لامتناہی ہو اور ''واجب الوجود'' پر منتہی نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام حاجت مندوں کے مجموعے (جہانِ موجودات) کو غنی و بے نیاز تسلیم کیا جائے۔ جب کہ یہ امر نہایت واضح ہے کہ فقیر و حاجت مند جس قدر زیادہ ہوں۔ پھر بھی وہ فقر و حاجت مند ہی رہیں گے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بے انتہا تاریکیاں اکٹھی ہو کر بھی روشنی میں تبدیل نہیں ہو سکتیں، بے انتہا جہالت کبھی علم نہیں بن سکتی اور لاتعداد صفر () کبھی کسی عدد میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔

بنابریں ہے کہ ''علت و معلول'' کا یہ سلسلہ اس مقام تک پہنچے کہ پھر وہ کسی کا محتاج نہ ہو، وہ ایسا وجود ہو جو مستقل بالذات اور بے نیاز ہو کہ اس کا وجود ہستی اس کی اپنی ہو...... یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ عین وجود اور وجود مطلق ہو۔ اس تمام تفصیلی بیان کے بعد یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ تمام موجودات اور حوادثِ جہاں کی بازگشت اس واجب الوجود اور ازلی ذات کی طرف ہونی چاہیئے۔ جسے ہم ''خدا'' کہتے ہیں۔

# (۴) برہان صدیقین

وجود خدا کے اثبات کے لیے ”برہان صدیقین“ ان دلائل میں سے ایک ہے جسے علماء اور فلاسفہ اسلام نے آیات وروایات سے استفادہ کرتے ہوئے مورِدِ توجہ قرار دیا ہے جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ عام لوگوں کی دلیل نہیں ہے بلکہ صرف ان خواص کے لیے ہے جو عقائد وفلسفہ کے مسائل میں وسیع معلومات رکھتے ہیں اور گہری سوچ کے ساتھ ساتھ لطیف کے حامل ہیں۔

یہ دلیل کچھ پیچیدہ تو ہے، لیکن عمدہ لطیف اور رُوح پرور بھی ہے اس دلیل کی اساس وبنیاد یہ ہے کہ ہم مخلوقات کے ذریعے سے خالق کو پہچاننے کی بجائے خود اسی کی پاک ذات کے ذریعے اس کی پہچان کرتے ہیں اور ”یامن دل علی ذاتہ بذاتیہ) کی روشنی میں خود اسی کی ذات کو اس کی پہچان کرنے اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اس دلیل کی پیچیدگی اور لطافت اسی بات میں ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ”دلیل“ اور ”مدعا“ کو ایک شے قرار دیں؟ یعنی ایک چیز دلیل بھی ہو اور مدعاء بھی ہو۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس جہان میں ایک ”وجود“ ہے پھر ہم اصل وجود کے بارے میں تجزیہ وتحلیل کرتے ہیں۔ اور ایک لطیف وعمدہ تجزیہ وتحلیل کے بعد اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ اصل وجود ”واجب“ ہونا چاہیے۔

یہ ایک مختصر اشارہ ہے اور ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ مختصر اشارہ اس قدر اہم موضوع کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہم اس کی مزید وضاحت اور تشریح بعد میں کریں گے، اب ہم قرآن مجید کی چند آیات کو زیر نظر لاتے اور ان پر غور وفکر کرتے ہیں۔

(۱) اَوَلَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ﴿فصلت: ۵۳﴾

(۲) شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ ۱۸ ﴿آل عمران: ۱۸﴾

(۳) وَّاللّٰهُ مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ مُّحِیۡطٌ ۲۰ ﴿البروج: ۲۰﴾

(۴) هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۳

(حدید: ۳)

(۵) اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴿النور: ۳۵﴾ [1]

[1] اس مضمون کی متعدد آیات قرآن مجید میں ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں: حج، ۱۷۔ سبا، ۴۷۔ مجادلہ، ۶۔ بروج، ۹۔

## ترجمہ:

(۱) کیا یہ بات کافی نہیں کہ خدا ہر چیز پر شاہد و گواہ ہے۔''

(۲) ''خدا (کائنات کے موزوں نظام کو ایجاد کرکے) اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں...... فرشتے اور صاحبان علم و دانش (اپنے انداز میں) گواہی دے رہے ہیں، جب کہ خداوند عالم جہان ہستی میں عدل و انصاف قائم کیے ہوئے (یہ عدل و انصاف بھی خدا کے یکتا ہونے کا ثبوت ہے، لہٰذا تم بھی ان سب کے ساتھ ہم آواز کر کہو کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زبردست اور حکمت والا ہے۔

(۳) خداوندِ عالم سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

(۴) وہی اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے اور وہ ہر شے سے آگاہ ہے۔

(۵) خداوندِ عالم آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

## مفردات کی تشریح:

''شہید'' کا مادہ ''شہود'' ہے جیسا کہ راغب اصفہانی نے کتاب ''المفردات'' میں کہا ہے کہ اصل میں اس کا معنی ''حضور مع مشاہدہ'' ہے کہ خواہ وہ مشاہدہ ظاہری آنکھوں سے انجام پائے یا دل کی نگاہوں سے ہو کبھی اس لفظ کو صرف ''حضور'' کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کہ اس میں مشاہدے کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ لیکن لفظ ''شہود'' کا استعمال ''حضور'' کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جب کہ اس میں مشاہدے کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ لیکن لفظ ''شہود'' کا استعمال حضور اور ''شہادت'' کی بجائے ''حضور مع مشاہدہ'' میں بہتر ہے۔

کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں ہے کہ لفظ ''شہادت'' کے معنی میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ حضور علم اور دوسروں کو آگاہ کرنا...... اگر خدا کی راہ میں جان قربان کرنے والوں کو ''شہید'' کہا جاتا ہے۔ تو وہ اس لیے کہ وہ ان نعمات الٰہی کا مشاہدہ کرتے ہیں جو خدا نے ان کے لیے مہیا کی ہوئی ہیں یا پھر اس لیے وہ بارگاہ الٰہی میں حاضر ہیں۔

کتاب العین میں ہے کہ ''شہید'' اس عسل کو کہتے ہیں جو ابھی موم سے نہ لیا گا ہو۔ مصنف نے اس کو لفظ ''شہید'' کے اصلی اور بنیادی معنی کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اس کا مطلب یہ ہے، کہ لغت کے لحاظ سے اس لفظ کی اصل یہی ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر

مسئلہ ”حضور“ کے ساتھ اس کا کیا ارتباط ہے؟ اس سلسلے میں مصنف نے کوئی وضاحت نہیں کی [۱]

”محیط“ کا مادہ ”احاطہ“ ہے جس کا معنی گھیر لینا اور چھا جانا ہے............لغت کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ”احاطہ“ ہے کی دو قسمیں ہیں: ایک اجسام کا احاطہ جیسے دیوار مکان کو گھیر لیتی ہے اس لیے عربی زبان میں سے ”حائط“ کہتے ہیں......دوسرے معنوی احاطہ، جس کا معنی حفاظت و نگہبانی یا کسی چیز سے مطلع و آگاہ ہونا ہے۔

یہ لفظ کبھی کسی چیز سے ممنوع ہونے کے معنی میں آتا ہے یعنی اس سے روک دیا جاتا ہے، جیسے کسی شخص کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا جائے تاکہ وہ کہیں نہ جا سکے یا جس چیز تک پہنچنا چاہتا ہے نہ پہنچ سکے......جیسا کہ لفظ ”احتیاط“ بھی وہاں استعمال کیا جاتا ہے، جہاں کوئی انسان کچھ کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کی خواہش ہے کہ غلطی و اشتباہ یا گناہ و معصیت سے محفوظ رہے۔

کتاب ”مقاییس اللغۃ“ میں ہے کہ یہ لفظ اصل میں ”حوط“ (بروزن فوت) سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے وہ چیز جو کسی دوسرے چیز کے اردگرد محفوظ رہے۔

ممکن ہے لفظ ”محیط“ بھی احاطہ وجودی یا احاطہ قدرت یا احاطہ علم کے معنی میں ہ [۲] و

”نور“ اس شعار کو کہتے یں جو پھیل جاتی ہے اور چیزوں کو دیکھنے میں آنکھوں کی مددگار ثابت ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ مادی اور معنوی......مادی نور وہ ہے جو ظاہری نگاہوں سے دکھائی دیتا ہے اور ”معنوی“ نور وہ ہے جو چشم بصیرت سے دیکھا جاتا ہے جیسے نورِ عقل اور نور قرآن......اور اگر ”فتنۃ“ کو ”نائرۃ“ کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پھیلتا اور وسعت پیدا کرتا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ (نور) دراصل ظاہری آنکھوں سے دکھائی دینے والی روشنی ہی کے معنی میں تھا، پھر معنوی امور مثلاً ایمان، علم، عقل، قرآن......یہاں تک کہ ذاتِ الٰہی کے لیے استعمال ہوا۔

”نار“ یعنی آگ بھی اسی عنوان سے ہے اور بہت سے معانی میں دونوں یکجا طور پر مراد لیے جاتے ہیں......”منارۃ“ کو بھی اس لیے منارہ کہتے ہیں کہ وہاں چراغ جلائے جاتے ہیں یا ”اذان“ کے ذریعے اس سے نور معنویت ہر طرف پھیلتا ہے۔

”نور“ بروزنِ قول درختوں کے شگوفوں یا خاص طور پر سفید شگوفوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جب وہ نکلنے لگے ہیں تو ان میں ایک مخصوص نورانیت ہوتی ہے۔

---

[۱] المفردات۔ لسان العرب، مقاییس اللغۃ اور کتاب العین ملاحظہ ہوں۔

[۲] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، المفردات مقاییس اللغۃ اور لسان العرب ملاحظہ ہوں۔

# تفسیر اور آیات کے مطالب پر ایک نظر

## قرآن اور برہان صدیقین [۱]

اس موضوع کے سلسلے میں پیش کی جانے والی سب سے پہلی آیت میں خدا کے وجود کو ثابت کرنے والی آفاقی اور نفسی نشانیوں کے ذیل میں ارشادالٰہی ہے: کیا وجودِ کے اثبات کے لیے اتنا کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ اور ہر جگہ حاضر وناظر ہے۔(اولم یکف بربك انه علی کل شیءٍ شهیدٌ)۔

ممکن ہے اس آیت میں ''شہید'' کا معنی شاہد اور گواہ یا حاضر و ناظر یا دونوں معانی کے لیے استعمال کیا گیا ہو کیونکہ یہ دونوں معنی خدا کی ذات پر صادق آتے ہیں نیز مذکورہ آیت مطلق ہے (یعنی کسی ایک معنی کے ساتھ مختص نہیں کی گئی [۲])

اس تفسیر کی روشنی میں، خدا کی مقدس ذات کے اثبات کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا حضور وشہود ہر جگہ ہے اور جس بھی ممکن الوجود کو دیکھیں۔ اس کے ساتھ واجب الوجود نظر آتا ہے۔، جدھر بھی دیکھتے ہیں اس کا وجود مطلق نمایاں ہے۔ جس شے پر نظر ڈالیں اس کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اور بڑے بڑے لوگوں کے سر اس کے حضور جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس بات کو حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ما رأیتُ شیئاً الا ورأیتُ الله قبله وبعدهٗ ومعهٗ۔

''میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر یہ خدا کو اس سے پہلے، اس سے پہلے، اس کے بعد اور اس کے ساتھ دیکھا۔

تفسیرلمیزان میں اس مقام پر ''شہید'' کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اس کے پیش نظر آیت کا مفہوم یہ ہوگا، کیا اس قدر کافی نہیں ہے کہ تیرا پروردگار ہر چیز کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔، کیونکہ تمام موجودات اپنی تمام جہات اور پہلوؤں میں اس کے محتاج ہیں [۳]

اس تفسیر کی رُو سے بھی مذکورہ آیت کے ذریعے وجودِ خدا کا اثبات ہوتا ہے۔ لیکن یہ ''برہان غنیٰ وفقر'' کے تحت آتا ہے۔

فخر رازی کے بقول، مذکورہ آیت سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے اس کائنات کی تمام چیزوں میں ایسے دلائل اور نشانیاں پیدا کی

---

[۱] بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کو ''برہان صدیقین'' اس لیے کہا گیا ہے کہ ''صدیق'' صیغہ مبالغہ ہے جس کا معنی ہے بہت زیادہ سچا، یہ صحیح ہے وجود خدا کے اثبات کے لیے جو دلائل پہلے ذکر کیے گئے ہیں وہ سب صداقت پر مبنی ہیں لیکن یہ برہان زیادہ سچائی کی حامل ہے کیونکہ اس میں ہم ذاتِ خدا کے ذریعے ذات خدا تک پہنچتے ہیں اور کسی کو درمیان میں نہیں لاتے۔

[۲] کئی ایک مفسرین نے کہا ہے کہ ''بربك'' میں ''ب'' زاید اور تاکید کے لیے آئی ہے اور موقع کے لحاظ سے ''ربک'' فاعل ہے اور جملہ علی کل شیءٍ شهی د، اس کا بدل ہے اس کا معنی یہ ہے۔ اولم یکفهم ان ربك علی کل شیء شهید،

[۳] تفسیر المیزان جلد ۱۷ صفحہ ۴۳۱۔

ہیں جو اس کے وجود کی گواہی دیتی ہے[1]

(تاہم اس قول کی روشنی میں یہ آیت ''برہان نظم'' کے ذریعے خدا کے وجود کا اثبات کرے گی)۔

بعض مفسرین کرام نے کہا ہے کہ یہ آیت قیامت سے متعلق ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے: خداوندِ عالم تمام انسانوں کے اعمال کو گواہ اور ناظر ہے یہی بات قیامت کے دن عدالت کرنے میں کافی ہے[2]

بعض مفسرین نے اس آیت کو قرآن مجید کی حقانیت اور مسئلہ نبوت سے مربوط قرار دیا اور اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے: آیا اس قدر کافی نہیں کہ خداوند عالم قرآن کی حقانیت اور پیغمبر اکرمؐ کی دعوت حق پر گواہ ہے۔[3]

مذکورہ بالا پانچ تفسیروں میں سے پہلی تین تفسیریں کہ اس آیت کو مسئلہ توحید اور خدا کے وجود کے اثبات سے مربوط قرار دیتی ہیں وہ زیادہ مناسب اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس بناء پر یہ آیت ''برہان صدیقین'' پر گواہ بن جائے گی۔

آخر میں ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک معتبر حدیث نقل کرتے ہیں کہ امام کے ایک دانش ور صحابی نے بیان کیا: میں نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ ایک گروہ کے ساتھ مناظرہ کرتے ہوئے میں نے کہا ہے کہ خداوندِ عالم اس سے بالاتر ہے کہ اسے اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق کے ذریعے پہچانا جائے بلکہ اس کے بندے ہی اس کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں (کیا میں نے ٹھیک کیا ہے؟) امامؑ نے میری تصدیق کرتے ہوئے فرمایا: رحمك الله (خدا تم پر رحمت نازل کرے) یعنی تم نے ٹھیک بات کہی[4]

البتہ یہ بیان موجودات عالم میں خدا کی توحید عظمت کے دلائل پائے جانے اور ''برہان نظم'' سے استفادہ کے ساتھ منافات نہیں رکھتا، برہان نظم کا ایک مقام ہے۔ لیکن ''برہان صدیقین'' اس سے بلند و بالا درجے پر ہے۔

## سورج اپنے وجود کی دلیل بن کر آیا:

دوسری آیت میں خود اپنی یکتائی پر خدا کی گواہی کا ذکر ہے، پھر فرشتوں و صاحبان علم کی گواہی کا تذکرہ ہے چنانچہ ارشاد ہوا: خدا گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اسی طرح فرشتے اور صاحبان دانش بھی (اپنے اپنے انداز میں) گواہی دیتے ہیں (شهد الله انه لااله الا هو والملائكة واولوا العلم (اس کے بعد فرمایا: یہ اس حال میں ہے کہ خداوند عالم نے عدل قائم کیا ہوا ہے اور وہ اس جہان ہستی کو عدل کی بنیاد پر چلا رہا ہے'' (قآئما بالقسط) چونکہ عدل و انصاف کے قیام میں بنیادی طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک قدرت اور دوسرے علم تاکہ علم کے ذریعے عدل کے معیاروں کی پہچان کرے اور قدرت و قوت کے ساتھ ان کا نفاذ و اجرء عمل میں لائے آیت

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۱۴۰

[2] تفسیر قرطبی جلد ۸ صفحہ ۵۸۱۹۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۲۰۔

[4] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۸۶ باب ''انہ لایعرف الا بہ''، حدیث ۳۔

کے آخر میں یوں ارشاد ہوا۔کوئی معبود نہیں ہے سوائے اس کے، وہ قدرت والا اور حکمت والا ہے۔(لا اله الا هو العزيز الحكيم)

فرشتوں اور صاحبان علم کا گواہی دینا تو واضح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خداوندِ عالم کے گواہی دینے کا مطلب کیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کرام کے درمیان گفتگو ہے بعض کا نظریہ ہے کہ اس سے قولی و عملی دونوں گواہیاں مراد ہیں۔یعنی ایک طرف خداوندِ عالم نے جہان ہستی اور آفاق و موجودات میں اپنی عظمت کی واضح نشانیاں دکھائیں اور دوسری طرف کتب آسمانی میں آیات توحید نازل کر کے اپنی توحید و یکتائی کی گواہی دی ہے۔

بعض و دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے صرف قولی گواہی مراد ہے اور چند ایک مفسرین نے صرف عملی گواہی مراد لی ہے۔لیکن درحقیقت یہاں اس سے بالاتر گواہی مقصود ہے کہ جس کا ذکر آیت کے مفہوم میں موجود ہے اور وہ ''گواہی'' کا نہایت اہم مصداق ہے وہ یوں کہ اس کی ذات ہی اس کی گواہ ہے اور ''یامن دل علی ذاته (اے وہ کہ جس نے اپنی ہی ذات کے ذریعے اپنی ذات کو ظاہر اور ثابت کیا ہے) کے مطابق وہ خود ہی اپنی ذات اور وجود کی سب سے اہم دلیل ہے...... یہ وہ امر ہے جو ''برہان صدیقین) میں ملحوظ ہے ان تمام مطالب کے باوجود اس میں کوئی مانع کہ یہاں ''شہادت'' یعنی گواہی کے تینوں معنی (گواہی ذات گواہی قول اور گواہی عمل) مفہوم آیت میں یکجا ہوں۔

چند حضرات نے ''قائماً بالقسط '' کے جملے کا معنی اس طرح کیا ہے کہ اس جہان ہستی میں عدل و انصاف اور نظم و ترتیب ہی خداوندِ عالم کی طرف سے اپنی واحدانیت پر ایک قسم کی گواہی ہے۔ یہ استقلال نہایت عمدہ ہے (اور بقول المیز ان درمیان میں فرشتوں اور صاحبان علم کے ذکر کا اس معنی پر اثر نہیں ہوتا) پھر یہ کہ اس سے آیت کی وسعت اور مفہوم کی عمومیت میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔

جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عدل و انصاف کا قیام علم اور قدرت پر موقوف ہے یہ دونوں اوصاف خداوندِ عالم کی مقدس ذات میں یکجا ہیں، آخر آیت میں خدا کی صفات ''عزیز و حکیم'' (قدرت والا اور حکمت والا) اس بات کی طرف ایک نہایت لطیف اشارہ ہے۔

## خدا کا احاطہ وجودی:

تیسری آیت میں ان لوگوں کے تذکرے کے بعد کہ جنہوں نے خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء کے مقابلے میں صف آرائی کی اور ان کے ساتھ نبرد آزما ہوئے......خاص طور پر اس کی دو واضح مثالیں......ان میں ایک بہت ہی قدیم زمانے میں جیسے ''قوم ثمود'' اور دوسری نسبتاً نزدیک کے زمانے میں گزرے ہوئے جیسے ''قوم فرعون'' ان کے تذکرے کے بعد فرمایا: بلکہ کافر ہمیشہ آیات حق اور واضح نشانیوں کی تکذیب میں لگے رہتے ہیں۔(بل الذين كفروا في تكذيب) اس آیت میں لفظ ''في'' استعمال کیا گیا ہے۔جس کا تکذیب کے ساتھ نہایت لطیف تعلق ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر، تکذیب کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں یہاں کفار سے وہ جھگڑالو کفار مراد ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں تھے کہ وہ خدا کی توحید و یکتائی کا انکار کرتے تھے، آنحضرت کی نبوت کے بھی منکر تھے اور قیامت سے بھی انکاری تھے۔اس بات کا امکان ہے کہ یہ آیت ان سب طرح کے انکاروں اور تکذیبوں کو شامل ہو کیونکہ قومِ ثمود اور قوم فرعون بھی ایسا ہی کرتی تھیں، نیز تکذیب کو ''نکرہ'' کے طور پر لانا اس بات کی دوسری دلیل بن سکتا ہے جو ایسے موارد میں کسی امر کی اہمیت کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔

پھر ارشاد ہوا: خداوند عالم ان سب پر محیط ہے (واللہ من ورآئِھم محیط) اس میں ''من ورآئِھم ''اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ سب ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں اور خداوند عالم انہیں ہر طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس ''احاطہ' الٰہی'' سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کرام کے درمیان بحث ہے، بعض حضرات کا خیال ہے اس سے مراد یہ ہے کہ خدا کا علم ان کے اعمال پر محیط ہے۔ بعض صاحبان کہتے ہیں کہ اس سے خدا کی قدرت کا احاطہ مراد ہے یعنی سب کے سب خدا کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ خدا کی گرفت اور عذاب سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ کچھ حضرات نے علم وقدرت دونوں کا احاطہ مراد لیا ہے، لیکن اس آیت کا مفہوم ان سب معانی سے وسیع تر ہے اور وہ خدا کے احاطہ وجودی' احاطہ ظرف ومظروف (مکان کو دیوار کے گھیر لینے) کی طرح نہیں اور نہ ہی احاطہ کل وجزء کی مانند ہے بلکہ اس سے احاطہ قیومیت مراد ہے یعنی وہ ایسا وجود ہے جو مستقل اور قائم بالذات ہے اور باقی سب موجودات اس سے وابستہ اور اس کے ساتھ قائم ہیں یہی وہ اہم نکتہ ہے جس کے باعث اس آیت میں وجود خدا کے اثبات کے لیے ''برہان صدیقین'' کا راستہ نکلتا ہے، اس کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

## ابتداء بھی تو اور انتہاء بھی تو:

سورۂ حدید کی ابتدائی آیات کہ جن میں خدا کے اوصاف نہایت وسیع وعمیق انداز میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سے چوتھی آیت میں ارشاد الٰہی ہے: وہ آغاز ہے وہ انجام ہے وہ ظاہر ہے، وہ باطن ہے اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔ (ھوالاول والا خر والظاھر والباطن وھو بکل شیءٍ علیمٌ) یہ پانچ صفات جو اس آیہ شریفہ میں ذکر کی گئی ہیں وہ ذات الٰہی کے لامتناہی ہونے کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں۔

وہ اول ہے ''یعنی وہ ''ازلی'' ہے کہ اس کا آغاز قابلِ تصور ہی نہیں، وہ آخر یعنی ''ابدی'' ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے وہ ظاہر ہے اور کسی سے چھپا ہوا نہیں وہ باطن ہے یعنی اس کی کہنہ ذات کسی پر ظاہر نہیں (کیونکہ لامتناہی ذات کی حقیقت کو سمجھنا، محدود موجودات مثلاً انسان کے لیے ممکن نہیں) لیکن وہ اپنے بندوں سے پوشیدہ بھی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا عالم ہے، کیونکہ وہ شروع ہی سے تھا اور آخر تک باقی رہے گا اور اس جہان کے ظاہر وباطن دونوں میں جگہ حاضر وموجود ہے۔

پہلی چار صفات ''اول'' ''آخر'' ''ظاہر'' ''باطن'' کے سلسلے میں مفسرین کرام نے متعدد معانی بیان کیے ہیں۔

وہ سب ایک دوسرے سے منافات بھی نہیں رکھتے۔ اور ان سب کو آیت کے مفہوم میں داخل قرار دیا جا سکتا ہے۔

کبھی کہتے ہیں کہ وہ اول ہے ہر چیز کے وجود سے پہلے اور آخر ہر چیز کے ختم ہونے کے بعد۔ اس کے وجود کی دلیلیں ظاہر اور اس کی ذات کے باطن کا ادراک ناممکن ہے۔

کبھی کہتے ہیں کہ وہ نیکی میں ابتداء کرنے والا، کیونکہ اس نے ہمیں نیکی کی ہدایت دی اور وہی عفو وبخشش میں انتہا ہے کہ توبہ قبول کرتا

ہے، اطاعت کے وقت توفیق واحسان میں ظاہر ہے اور معصیت کے وقت بندوں کے عیوب مخفی کرنے میں باطن ہے۔

الاول ببرہٖ اذھداك والا خر بعفوہٖ اذ قبل توبتك والظاھر باحسانہٖ توفیقهٖ اذا طعته والباطن بسترہٖ اذاعصیتهُ [۱]

دعا کے سلسلے میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے۔

اللھم انت الاول فلیس قبلك شیٔ وانت الاخر فلیس بعدك شیٔ [۲]

''خدایا! تو اول ہے تجھ سے پہلے کوئی چیز نہ تھی تو آخر ہے تیرے بعد کوئی چیز نہیں، تو ظاہر ہے، تجھ سے برتر کوئی چیز نہیں اور تو باطن ہے تجھ سے الگ کچھ نہیں۔

اول او، اول بے ابتداء
آخر او، آخر بے انتہاء
بود، ونبود آنچہ بلند است وپست
باشد وایں نیز نباشد کہ ہست

وہ اوّل ہے اور ایسا اوّل جس کی کوئی ابتداء نہیں، وہ آخر ہے ایسا آخر جس کی انتہا کوئی نہیں، وہ تھا جب کوئی بلند و پست نہ تھا، وہ ہوگا اور یہ جو کچھ بھی ہے نہیں ہوگا۔

بہر حال مذکورہ آیت صوفیوں کے نظریے کو مسترد کرتے ہوئے اس جہان مخلوق سے خدا کی علیحدگی اور خالق سے مخلوق علیحدگی کو ثابت کرتی ہے اس کے ساتھ ہی یہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتی ہے کہ خدا کی پاک ذات کی کوئی انتہا نہی اور وہ مطلق ہے یعنی وہ ایک ایسی ہستی اور وجود ہے جو عدم سے آمیختہ نہیں ہے۔ اگر ہم ہستی و وجود کی حقیقت پر اچھی طرح سے غور کریں اور اسے عدم کے ساتھ آلودہ ہونے سے پاک سمجھیں تو اس کی پاک ذات تک پہنچ سکتے ہیں، یہی بات ''برہان صدیقین'' کا خلاصہ اور اس کی روح ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی ''موجود'' (وجود رکھنے والا) محدود ہو تو وہ آغاز میں یا انجام پر یا اشیاء کے ظاہر یا باطن میں ہوگا، چونکہ خداوند عالم بھی ہے اور انتہاء بھی ظاہر بھی ہے اور باطن بھی...... یہ سب اس لیے کہ اس کا وجود لا متناہی اور مطلق ہے۔ اس کی ہستی کی کوئی انتہا نہیں۔

## وہ کائنات کو روشنی دینے والا ہے:

اس بحث کی پانچویں اور آخری آیت میں ایک نہایت مختصر مگر پر معنی جملہ موجود ہے: خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے (اللہ نور

---

[۱] مجمع البیان، تفسیر المیزان تفسیر کبیر فخر رازی، روح البیان۔

[۲] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۴۰۶۔

السمٰوٰت والارض) البتہ اس جملے کے بعد "خدا کے نور" کے بارے میں نہایت عمدہ اور دلکش تشبیہ پیش کی گئی ہے۔ کہ جس میں محترم مفسرین کے لیے بحث کا وسیع میدان موجود ہے۔ لیکن ہماری اس بحث میں چونکہ پہلا جملہ ہی مورِنظر ہے، اس لیے ہم صرف اسی جملے کی تشریح اور وضاحت بیان کرتے ہیں:

یہ بات واضح ہے کہ پیچیدہ اور عظیم حقائق کی تفہیم کے لیے ایک اہم ترین طریقہ یہ ہے کہ واضح تشبیہات پیش کی جائیں تا کہ عقلی اُمور وحقائق کو حسی مثالوں کے ذریعے ذہن نشین کیا جا سکے، لہٰذا اس مقام پر اسی روش کو اپنایا گیا ہے۔ (اگرچہ خدا کے بارے میں جو مثالیں ذکر کی جاتی ہیں وہ سب ناقص ہوتی ہیں، کیونکہ خدا کی ذات بے مثال ہے) اس مثال کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم "نور" اس کی صفات وخصوصیات اور اس کی برکات پر غور کریں اور سمجھیں۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ "نور" مادی جہان کی تمام موجودات میں سے نہایت لطیف، خوبصورت اور بابرکت شے ہے اور مادی جہان کی تمام برکتیں اور خوبصورتیاں اسی سے نکلتی ہے، سورج کا نور (روشنی) تمام زندہ موجودات کی حیات اور بقاء کا سرچشمہ ہے اور پھولوں، گھاس پھونس اور تمام جانداروں کی پرورش کا بہترین ذریعہ ہے۔

یہ نور ہی ہے جو تمام انرجی (قوتوں) مثلاً ہواؤں کی حرکت، بارشوں کا برسنا اور انرجی پیدا کرنے والے مواد (مثلاً تیل کوئلہ وغیرہ) کے وجود میں آنے کی اصل بنیاد ہے۔ اگر سورج کا نور ختم ہو جائے تو ہمارے جہان میں پائی جانے والی تمام حرکات اور قوتیں ختم ہو جائیں۔

نور...... مختلف موجودات کے مشاہدے اور ان کے ظاہر ہونے کا ذریعہ ہے، یعنی وہ تمام چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اس کی رفتار ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کے برابر ہے، یعنی آنکھ جھپکنے تک سات مرتبہ سے زیادہ کرہ ارض کا چکر لگا سکتا ہے بہرحال سورج کا نور" زندگی کے لیے نہایت موثر ومفید عامل ہے اور انسانی زندگی کے راستے میں ہر قسم کے موانع ورکاوٹیں دور کرنے اور موذی میکروب (جراثیم) کو ختم کرنے والا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حسی نور میں پائی جانے والی خصوصیات کے پیش نظر ذاتِ الٰہی کو نور کے ساتھ تشبیہ دینے کا راز معلوم ہو جاتا ہے۔

یہ وجود کا نور ہی ہے جو موجودات کی زندگی کو اجاگر کرتا اور ان کی حفاظت ونگہداری کا کام انجام دیتا ہے مادی ومعنوی زندگی اسی سے ہے کائنات کی تمام حسن آرائیاں اسی سے ہیں۔ اور کمال کی طرف ہر حرکت وعمل اسی کے مقدس وجود کے فیض سے ہے۔ ہر ہدایت اسی سے وجود میں آتی ہے۔ وہی ہے جو اپنے بندوں کے راستے سے ہر طرح کی رکاوٹیں دُور کرتا ہے اور وہی ہے جو کمال کے راستے اور اپنی ذات کے تقرب کے سلسلے میں آنے والے پیچ وخم کو انسان کے لیے دور کرتا ہے۔

ان سب باتوں کا خلاصہ ایک جملے میں اس طرح ہے کہ اس کائنات میں سب کچھ اسی ذات سے ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ نور جو تمام اشیاء وموجودات کے ظہور ان کے آشکار ہونے کا سبب ہے۔ آیا وہ خود کسی ایسے (نور) کا محتاج ہے یا نہیں کہ جو اسی نور کے پرتو میں ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ اس نور سے زیادہ روشن ہیں کہ نور کے معرف قرار پائیں یا نہیں؟ مطلب یہ کہ کیا "نور" خود اس کے علاوہ کسی ذریعے سے دیکھا جا سکتا ہے؟ یہی "برہان صدیقین" کی اصل بنیاد ہے!

مفسرین کرام نے اس آیت کے ذیل میں کئی احتمالات ذکر کیے ہیں کہ جو دیگر موارد کی طرح ایک دوسرے سے منافات نہیں رکھتے

اور سب یکجا ہو سکتے ہیں یعنی ان میں سے ہر ایک کسی خاص زاویے سے آیت پر ناظر ہے۔

بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ "اللہ نور السمٰوت والارضِ، کا جملہ "منور السمٰوت والارض کے معنی میں ہے یعنی خدا آسمانوں اور زمین کی روشنی عطا کرنے والا ہے۔

بعض مفسرین نے اسے " کائنات کے ہادی ورہبر" کے معنی میں لیا ہے اور انہوں نے اس نظریئے میں حضرت امام علی رضا علی السلام کی ایک روایت کی پیروی کی ہے جس میں امامؑ نے فرمایا: ھادٍ لاھل الارض یاھادلا ھل السمٰوت وھادٍ لاھل الارض[1]

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین میں ہر عیب سے منزہ و پاک ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد آسمانوں اور زمین کی تدبیر ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد، سورج اور چاند ستاروں کے ذریعے روشنی پہچانا اور انبیاء فرشتوں اور صاحبان علم کے ذریعے نور ہدایت پہنچانا ہے۔

بعض نے کہا ہے اس سے مراد، آسمان وزمین کو نظام عطا کرنا ہے۔

بعض نے کہا ہے اس مراد دونوں جہان کو زینت عطاء کرنا ہے۔

بعض نے کہا ہے اس سے مراد آسمانوں اور زمین کا خالق ہونا ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ تمام مطالب اس جملے اللہ نور السمٰوت والارضِ" میں یکجا ہیں بلکہ یہ آیت اس سے بالاتر معنی کو بھی بیان کرتی ہے۔ چونکہ "نور" اپنی ذات کے لحاظ سے روشن ہے اور خود ہی اپنے وجود کی دلیل ہے اور کسی روشنی دینے والے کا محتاج نہیں، کیونکہ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اور اسی کی برکت سے ظاہر روشن ہے۔

زہی ناداں کہ اوخورشید تاباں
بہ نورِ شمع جوید در بیاباں!
جہاں جملہ فروغ نورحق داں
حق اندروی زپیدائی است پنہاں
اگر خورشید بریک حال بودے
شعاع اوبہ یک منوال بودے
ندانستی کہ آں پر تواداست
نبودی ہیچ فرق از مغز تابوست

[1] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۱۳۳ حدیث ۱۔ ۲ تفسیر نورالثقلین جلد ۳ صفحہ ۶۰۳۔

# توضیحات

## (۱) اسلامی حدیثوں اور دعاؤں میں برہان صدیقین:

تمام موجودات عالم کے مطالعے سے زیادہ قریب اور دقیق ترین راستہ خدا کی پاک ذات کی پہچان کے لیے خود اس کی ذات مقدس کا مطالعہ ہے۔ہمیں اس کی ذات کے ذریعے ہی اس تک پہنچنا چاہیئے، یہ چیز اسلامی حدیثوں اور معصومینؑ کی دعاؤں میں وسیع پیمانے پر پیش کی گئی ہے اور یہی امر ''برہان صدیقین'' کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

ہم اس بات کے قائل نہیں کہ اس جہان کی موجودات سے ذاتِ الٰہی کی پہچان نہیں ہوسکتی اور ہم ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ''آفاقی'' اور ''انفسی'' آیات اور نشانیاں، اس کی قدرت، عظمت اور علم کا ثبوت نہیں ہیں کیونکہ اس کی بابت قرآن مجید میں مفصل بیان موجود ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس مقام پر ایک نہایت لطیف عمیق اور عظیم راستہ موجود ہے اور وہ ہے اصل وجود کا مطالعہ...... اس کی ذاتِ مقدس سے اس کی پہچان اور اس تک رسائی...... یہ راستہ عام طور پر خواص اور حقیقی اہل عرفان کا ہوتا ہے، یہاں نمونے کے طور پر چند موارد ذکر کیے جاتے ہیں۔

(۱) مشہور و معروف دعا صباح ہے۔

"یامن دل علی ذاتہٖ بذاتہٖ وتنزہ عن مجانسۃِ مخلوقاتِہٖ"

''اے وہ کہ جس کی ذات ہی اس کی ذات کی دلیل ہے اور تو مخلوقات کے ساتھ مشابہت سے منزہ و پاک ہے۔

(۲) دعاء ابوحمزہ ثمالی میں ہے:

بك عرفتك وانت والتنی علیك۔

میں نے تجھے تیرے ہی ذریعے سے پہچانا ہے اور تو نے ہی اپنی طرف میری رہبری کی ہے۔''

(۳) دعاء عرفہ میں ہے:

کیف یستدل علیك بما ھو فی وجودہٖ مفتقرٌ الیك ایکون لغیرك من الظھورِ مالیس لك حتی یکون ھوا المظھر لك؟

''جو موجودات اپنے وجود میں تیرے محتاج ہیں وہ تیرے وجود پر کیسے دلیل بنیں گے۔کیا تیرے غیر کا ظہور کچھ زیادہ ہے کہ جو تجھ میں نہیں تا کہ وہ تیرے ظاہر ہونے کا ذریعہ بنے؟''

(۴) اسی دعا عرفہ میں ہی ہے:

متی غبت حتی تحتاج الی دلیل یدل علیك، ومتیٰ بعدت حتی تکون الاثارُ ھی التی توصل الیك عمیت عینٌ لاتراك علیھا رقیباً۔

توکب مخفی ہے کہ ایسی دلیل کی ضرورت ہو جو تیری پہچان کرنے والی بنے، توکب دور ہے کہ آثار کے ذریعے تجھ تک پہنچانا جائے، اندھی ہے وہ آنکھ جو تجھے اپنے اوپر ظاہر اور نگہبان نہیں سمجھتی۔''

(۵) ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے ایک صحابی منصور بن حازم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ ایک گروہ کے ساتھ مناظرہ کے دوران میں نے ان سے کہا۔

ان اللہ اجل واکرم من ان یعرف بخلقه بل العباد یعرفون باللہ۔

''اللہ برتر ہے اس سے کہ مخلوق کے ذریعے پہچانا جائے۔ بلکہ بندے اس کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔

امام صادقؑ نے بعنوان تصدیق فرمایا: خدا تجھ پر رحمت کرے، تونے ٹھیک کہا ہے[۱]

(۶) امیرالمومنین امام علیؑ کا فرمان ہے۔

اعرفوا اللہ باللہ، والرسول بالرسالةِ، واولیِ الامر، بالامر بالمعروفِ والعدل والاحسان[۲]

''خدا کو خدا کے ذریعے اور رسولؐ کی رسالت کے ذریعے پہچانو، اولی الامر کو امر بالمعروف اور عدل واحسان کے ذریعے پہچانو۔

(۷) ایک روایت میں آیا ہے کہ امیرالمومنینؑ امام علیؑ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اپنے پروردگار کو کس چیز سے پہچانا؟ امامؑ نے فرمایا: اس چیز سے کہ جس سے میں نے اپنے نفس کو پہچانا ہے[۳]

ہاں...... ذات پروردگار کی پہچان خود اسی کی ذات سے ہوتی ہے (آفتاب آمد دلیل آفتاب) یعنی اس کی ذات ہی اس کی معرفت اور

---

[۱] اصولِ کافی جلد ا صفحہ ۸۶ باب، انه لایعرف الابه، حدیث ا۔

[۲] اصولِ کافی جلد ا صفحہ ۸۵ باب، انه لایعرف الابه، حدیث ۲۔

[۳] اصولِ کافی جلد ا صفحہ ۸۵ باب، انه لایعرف الابه، حدیث ۳۔

پہچان کی دلیل ہے، اس کو کسی تعارف کرانے والے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ کسی کی نظر میں مخفی ہے تو اپنی شدتِ ظہور کی وجہ سے...... کیونکہ روشنی اگر حد سے زیادہ ہوتو اس میں انسان کچھ نہیں دیکھ سکتا۔

حجاب روی تو ہم روی تو است درہمہ حال
نہاں زچشم جہانی زبس کی پیدائی

## (۲) توضیح برہان صدیقین

اب موقع ہے کہ فلسفۂ اسلامی کے نقطۂ نظر سے ''برہان صدیقین'' کی تشریح کی جائے۔ اگر چہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے...... لیکن ہم تاحدامکان اس کو فلسفی اصطلاحات سے ہٹ کر عام فہم اور آسان الفاظ میں واضح کریں گے۔

ہر بات سے پہلے اس امر کی طرف توجہ رہے کہ ''برہان صدیقین'' میں وجود خدا کے اثبات کے دلائل میں ''دور و تسلسل'' موثر سے اثر کی طرف رجوع'' مخلوق سے خالق کی پہچان یا ممکن سے واجب کے تصور کا کوئی گزر نہیں ہے، بلکہ اس میں خود وجود اور حقیقت وجود کی تحلیل ہے اور ہم خدا کی ذات کا سراغ خود اس کی ذات ہی سے پاتے ہیں اور یہی ایک اہم نکتہ ہے۔ (اگر چہ بعض عبارات میں ایسا نظر آتا ہے کہ ''برہان صدیقین'' کے استدلال میں ''برہان علت و معلول'' اور ''وجوب و امکان'' کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ جن کی تشریح اس سے پہلے ہو چکی ہے [1]

''برہان صدیقین'' کے بارے میں مختلف بیان ذکر ہوئے ہیں (پہلی تقریر ''اسفار'' میں صدر المتالہین کی ہے۔ محقق سبزواری کا بیان ''حاشیہ اسفار'' میں علامہ طباطبائی کا قول ''نہایۃ الحکمہ'' میں اور دیگر حضرات نے بعض دوسری کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن سب سے واضح اور مناسب بیان جو برہان وجوب و امکان اور علت و معلول کی طرف نہیں پلٹتا اور دور و تسلسل میں بھی داخل نہیں ہوتا وہ یہ ہے:

حقیقت وجود وہی ''عینیت'' خارج میں اس کا ہونا اور بالفاظ دیگر اس کی ''واقعیت'' یعنی صفت وجود کا حامل ہونا ہے...... اس کے لیے عدم ممکن ہی نہیں کیونکہ کوئی بھی چیز اپنی ضد کو قبول نہیں کرتی، چونکہ عدم...... وجود کی ضد ہے، لہٰذا حقیقت وجود عدم کو کبھی قبول نہیں کرتی۔

اس سے ہمیں یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ''وجود'' ذاتی لحاظ سے ''واجب الوجود'' ہے یعنی وہ ازلی و ابدی ہے، دوسرے لفظوں میں مطالعہ ''حقیقتِ وجود'' ہمیں اس مقام پر پہنچاتا ہے کہ ''وجود'' میں عدم ہرگز راہ نہیں پاتا۔ وہ چیز کہ جس میں عدم کا گزر نہیں ہوتا وہی ''واجب الوجود'' ہے (غور کریں [2])

صدر المتالہین کہ جو ''برہان صدیقین'' پر لکھنے والوں میں سب کے پیش رو ہیں، ان کا خیال یہ ہے۔

معرفتِ خدا کے بہت سے طریقے اور راستے ہیں، اس لیے کہ فضلتیں اور جہتیں بہت زیادہ ہیں اور ہر شخص کسی ایک راستے سے اس تک پہنچتا ہے (ولکل وجۃ ھو مولیھا) لیکن بعض طریقے اور راستے دیگر طرائق سے اطمینان بخش باشرف اور زیادہ روشن اور واضح ہیں...... سب سے مضبوط

---

[1] نہایۃ الحکم صفحہ ۲۶۸ شرح مختصر منظومہ از شہید مطہری صفحہ ۸-۹۔

[2] یہ بیان اس تحریر کے مطابق ہے جو ''اسفار'' پر محقق سبزواری کے حاشیہ میں آئی ہے (جلد ۸ صفحہ ۱۴ طبع بیروت)

طریقہ اور دلیل وہ ہے، جس میں غیر از ذات (حق) واسطہ نہ بنے یعنی مقصود تک پہنچنے کا راستہ خود وہ مقصود ہی ہے۔ یہی ''صدیقین'' کا راستہ ہے کہ وہ خداوند متعال کے ذریعے سے اس تک رسائی حاصل کرتے ہیں، اس کے بعد اس کی ذات سے اس کی صفات پر اور صفات سے اس کے افعال پر استدلال کرتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ علماء عقائد اور ماہرین طبیعات ذاتِ الٰہی تک پہنچنے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اس کی صفات اور کچھ دیگر امور کو اپنا وسیلہ بناتے ہیں۔ جیسے حدوث موجودات اور حرکت اجسام کے مسائل کہ جو ان کے استدلال کی بنیادیں ہیں تاہم ان لوگوں کے مہیا کردہ دلائل بھی خدا کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں ایک قیمتی سرمایہ ہیں لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ برہانِ صدیقین'' خدا کی ذات سے خدا کی پہچان کا راستہ سب سے مضبوط اور محکم ہے۔ قرآن مجید میں معرفتِ خدا کے دیر راستوں کی طرف یوں اشارہ ہوا:

سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ؕ

معرفت خدا کے جس راستے کی ہم نے نشاندہی کی ہے اس کی طرف اس جملہ میں اشارہ ہوا ہے۔

اَوَلَمۡ يَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ۝٥٣

پھر فرماتے ہیں: اس کی وجہ یہ ہے کہ علما ربانی خود وجود کی طرف نظر رکھتے ہیں اسی کو مورد تحقیق قرار دیتے ہیں۔ اسی کو ہر چیز کی اصل سمجھتے اور اسی کی حقیقتِ وجود جانتے ہیں۔ وجود حقیقت میں واجب الوجود ہے باقی رہا، امکان، احتیاج اور معلولیت وغیرہ جس کا وجود کے ساتھ تعلق ہے تو یہ اصل وجود نہیں بلکہ یہ کچھ نقائص کا اثر ہے جو اصل وجود سے خارج ہوتے ہیں۔ [1]

خلاصہ یہ کہ ہم وجود حقیقی کا مشاہدہ کریں تو ظاہر ہوگا کہ ''وجود'' کبھی بھی عدم'' کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور اس کے ساتھ نیستی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کہ وجود و عدم ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ یعنی اگر عدم کو لیا جائے تو وہ وجود نہیں رہے گا۔ لہٰذا وجود ''واجب الوجود'' اور عدم ''ممتنع الوجود'' ہے۔ البتہ ایک اہم اشکال یہاں وارد ہوتا ہے اور صدر المتالین بھی ''اسفار'' میں اس کا جواب دینے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

وہ یہ ہے کہ اس استدلال کے مطابق ہر موجود کو ''واجب الوجود'' ہونا چاہیے کیونکہ یہ چیز تمام وجودوں پر صادق آتی ہے۔ جبکہ ہم جانتے کہ ممکنات ''حادث'' ہوتے ہیں۔ اور یہ ازلی وابدی یعنی واجب الوجود نہیں ہیں۔ اس کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ امکانی وجود'' اصلی اور حقیقی وجود نہیں۔ اس قسم کے وجود محدود ہیں اور عدم سے ملے ہوئے ہیں، ان کی محدودیت سے ان کا عدم سے تعلق واضح ہوتا ہے۔ لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہر وجود دو چیزوں سے مرکب ہوتا ہے تو اس کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی موجودات ممکنہ چونکہ محدود ہیں اس لیے ان میں ایک قسم کا عدم بھی ہے۔ پس تو اس کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی موجودات ممکنہ چونکہ محدود ہیں اس لیے ان میں ایک قسم کا عدم بھی ہے۔ پس وجود ممکن وجود اصلی نہیں ہے کیونکہ حقیقت وجود عین واقعیت وجود ہے۔ اور اس میں کوئی قید شرط اور نقص نہیں ہے اس دلیل سے سمجھا جاسکتا ہے کہ وجود حقیقی یقیناً واجب الوجود ہے۔ البتہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ ان تمام وضاحتوں کے باوجود استدلال کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مسلسل فکر اور وقت نظر کی ضرورت ہے (غور کریں)

---

[1] اسفار جلد ۸ صفحہ ۱۳۔ ۱۴ سے کچھ تلخیص کے ساتھ

# خدا کی پہچان کا باطنی راستہ
# فطری خداشناسی

## اشارہ:

ہمیں معلوم ہے کہ عقلی ادراکات رُوح انسانی کے عمل کا ایک جزو اس انسان تمام چیزوں کا علم عقلی دلیل سے حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کے معلومات کا بیشتر حصہ فطری چاہتوں اور باطنی ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے۔حتیٰ کہ بہت سے عقلی دلائل کی بنیاد بھی انہی پر قائم ہوتی ہے جب کہ حیوانات کی تمام خواہشیں اور یافتیں صرف فطری طریقے سے تشکیل پاتی ہیں بناء بریں جن لوگوں نے انسان کی بعد عقلی میں محدود کیا ہے درحقیقت انہوں نے وجود انسان کے تمام تر العباد کو نہیں پہچانا۔اتفاق کی بات ہے کہ ''خداشناسی'' کے بہت سے راستوں میں ایک راستہ یہی فطری اور باطنی راستہ ہے اس میں انسان اپنے ''اندر'' جھانکتا ہے ''جاننے کی بجائے'' پاتا ہے ''سوچنے'' کی بجائے دیکھتا ہے اور ''مقدمات'' قائم کرنے کی بجائے مقصد'' تک پہنچتا ہے یہ راستہ خوبصورت پُرسکون اور مسرت بخش ہے۔

بہت سی آیاتِ قرآن اس (خدا کی پہچان کے باطنی راستے) کا بڑے عمدہ طریقے سے ذکر کرتی ہیں۔اب اس اشارے کے ذیل میں ہم ان آیات پر نظر ڈالتے ہیں۔

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ‌ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ‌ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ‌ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳۰﴾

[۳۰:۳۰] (روم)

وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوۡا رَبَّهُمۡ مُّنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَهُمۡ مِّنۡهُ رَحۡمَةً اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ بِرَبِّهِمۡ يُشۡرِكُوۡنَ ۙ﴿۳۳﴾ [۳۰:۳۳] (روم)

فَاِذَا رَكِبُوۡا فِى الۡـفُلۡكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمۡ اِلَى الۡبَـرِّ اِذَا هُمۡ يُشۡرِكُوۡنَ ۙ﴿۶۵﴾ [۲۹:۶۵] (عنکبوت)

هُوَ الَّذِىۡ يُسَيِّرُكُمۡ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ‌ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنۡتُمۡ فِى الۡـفُلۡكِ‌ ۚ وَجَرَيۡنَ بِهِمۡ بِرِيۡحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوۡا بِهَا جَآءَتۡهَا رِيۡحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الۡمَوۡجُ مِنۡ كُلِّ

مَكَانٍ وَّظَنُّوٓا اَنَّهُمۡ اُحِيۡطَ بِهِمۡ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۚ لَٮِٕنۡ
اَنۡجَيۡتَنَا مِنۡ هٰذِهٖ لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيۡنَ ۝۲۲ فَلَمَّاۤ اَنۡجٰهُمۡ اِذَا هُمۡ يَبۡغُوۡنَ فِى
الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ ؕ (یونس ۲۲۔۳۲)

وَلَٮِٕنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ خَلَقَهُنَّ الۡعَزِيۡزُ
الۡعَلِيۡمُ ۝۹ [۴۳:۹] (زخرف)

وَلَٮِٕنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ ۝۸۷ (زخرف:۸۷)

وَلَٮِٕنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ
لَيَـقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ ۝۶۱ [۲۹:۶۱] (عنکبوت)

قُلۡ مَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اَمَّنۡ يَّمۡلِكُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَمَنۡ
يُّخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَيُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَىِّ وَمَنۡ يُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ؕ
فَسَيَـقُوۡلُوۡنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ۝۳۱ [۱۰:۳۱] (یونس)

قُلْ لِّمَنِ الۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝۸۴ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ ؕ قُلۡ اَفَلَا
تَذَكَّرُوۡنَ ۝۸۵ قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبۡعِ وَرَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ۝۸۶
سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ۝۸۷ قُلۡ مَنۡۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوۡتُ كُلِّ شَىۡءٍ
وَّهُوَ يُجِيۡرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيۡهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝۸۸ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ ؕ قُلۡ فَاَنّٰى
تُسۡحَرُوۡنَ ۝۸۹ (مومنون:۸۴۔۸۹)

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى
اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰى ۛۚ شَهِدۡنَا ۛۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا
كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَ ۝۱۷۲ [۷:۱۷۲] (اعراف)

## ترجمہ:

(۱) اپنے پروردگار کے خالص آئین کی طرف رُخ کرو، یہی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی آفرینش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہی محکم ومضبوط دین وآئین ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔''

(۲) ''جب لوگوں کو کوئی ضرر وتکلیف ہوتو خدا کو یاد کرتے اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، مگر پھر جب وہ انہیں اپنی رحمت کا ذائقہ چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک فریق اپنے پروردگار کی نسبت مشرک ہوجاتا ہے۔''

(۳) ''جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خلوص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں (یعنی غیر خدا کو بھول جاتے ہیں) لیکن جب خدا ان کو نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو وہ مشرک بن جاتے ہیں۔''

(۴) وہ وہی ہے جو تمہیں خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور موافق ہوائیں انہیں منزل کی طرف لے جارہی ہوں تو وہ خوش ہوجاتے ہیں۔ جب سخت آندھیاں چلنے لگتی ہیں اور دریا کی موجیں انہیں ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں، تب انہیں اپنی ہلاکت کا گمان ہوتا ہے تو وہ خدا کو خلوصِ قلب کے ساتھ پکارتے ہیں کہ اگر تو ہمیں نجات دے تو ہم شکر گزار ہوں گے (لیکن نجات پانے کے بعد کافر ہوجاتے ہیں)

(۵) ''اگر ان لوگوں سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ یقیناً کہیں گے خدا نے انہیں پیدا کیا ہے جو قادر ودانا ہے۔''

(٦) ''اگر تم ان سے پوچھو کہ خود ان (لوگوں) کو کس نے پیدا کیا؟ یقیناً کہیں گے خدا نے تو (ان سے کہو) پھر کیوں اس کی عبادت سے منحرف ہوتے ہو؟''

(۷) ''اگر تم نے پوچھا کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا، سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا۔

وہ کہیں گے اللہ نے پس پھر وہ خدا کی عبادت سے کیوں منحرف ہوتے ہیں۔"

(۸) کہو کہ کون تم کو آسمان وزمین سے روزی دیتا ہے یا تمہارے کانوں اور آنکھوں کا خالق کون ہے؟ کون مردہ کو زندہ سے اور زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے؟ کون دنیا کے اُمور کی تدبیر کرتا ہے؟ وہ جلدی سے کہیں گے "خدا" پس کہو کہ پھر کیوں تم تقویٰ اختیار کرتے؟"

(۹) کہو بھلا زمین اور اس کے رہنے والے کس کے ہیں اگر جانتے ہو، کہیں گے۔سب اللہ ہی کے ہیں، کہو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے، کہو کون سات آسمانوں اور عرشِ عظیم کا رب ہے وہ کہیں گے یہ سب خدا کے قبضے میں ہیں۔کہو کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے (اور شرک سے باز نہیں آتے) کہو اگر تم سچ کہتے ہو تو بتاؤ تمام موجودات پر کس کی حکومت ہے، کون بے سہاروں کو پناہ دیتا ہے اور خود پناہ کی حاجت نہیں رکھتا...... وہ کہیں گے (یہ سب) خدا کی ملکیت میں ہیں، کہو اس کے باوجود کیوں کہتے ہو کہ تم پر جادو کردیا گیا ہے؟"

(۱۰) اس وقت کو یاد کرو، جب خدا نے بنی آدم کو صلبوں سے ان کی ذریت کو لیا اور انہیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا، فرمایا کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ سب نے کہا ہاں ہم گواہی دیتے ہیں (خدا نے ایسا کیوں کیا) اس لیے کہ قیامت کے دن یہ عذر پیش نہ کریں کہ ہمیں اس کا علم نہیں ہوا اور ہم خدا کی پہچان کے فطری عہد سے بے خبر تھے۔

## مفردات کی تشریح:

"فطرت" کا مادہ "فطر" (بروزن سطر) ہے جب کہ ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا ہے کہ اس کا معنی کسی چیز کو طول سے شگافتہ کرنا ہے، پھر اس کا اطلاق ہر قسم کی شگافت پر ہونے لگا...... پھاڑنا کبھی تخریب اور کبھی اصلاح کے عنوان سے ہوتا ہے، اس کا اطلاق ہر دو صورتوں پر ہوتا ہے۔

چونکہ خلقت و پیدائش درحقیقت پردۂ عدم سے نکال کر وجود عطا کرنا ہے لہٰذا اس لفظ (فطرت) کا ایک معنیٰ "خلقت" بھی ہے، اسی لحاظ سے اسے ابداع و اختراع پر بھی بولا جاتا ہے۔روزہ کھولنے کے لیے بھی لفظ "استعمال ہوتا ہے، کیونکہ غذا وغیرہ کے ذریعے ایک مسلسل کیفیت کو ختم کردیا جاتا ہے۔

لفظ فطرت زمین میں نباتات کے اُگنے اور پیداوار ہونے پر بھی بولا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ نباتات زمین کے شگافتہ ہونے سے ہی باہر آتی ہے، اسی لیے دو انگلیوں سے دودھ دوہنے کے عمل پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا، گویا تھن پھٹتا ہے اور اس سے دودھ خارج ہوتا ہے۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ "فاطر السموٰت والارض" کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، حتیٰ کہ دو عرب باہمی اختلاف کرتے ہوئے میرے پاس آئے...... ان کا جھگڑا ایک کنویں کے بارے میں تھا۔ ایک نے کہا "انا فطرتھا" میں نے یہ کنواں کھودا ہے۔، اس سے میں سمجھ گیا کہ "فطرت" کا معنی آغاز و ایجاد کرنا ہے۔ جوان لڑکے لڑکیوں کے چہروں پر پہلے پہل جو دانے نکلتے ہیں ان کو "تقاطیر" یا نفاطیر" کہا جاتا ہے۔[۱]

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اہل لغت اس لفظ (فطرت) کو دین و آئین کے معنی میں لیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ دین انسان کی پیدائش و آفرینش کے وقت سے موجود چلا آ رہا ہے جیسا کہ آیندہ مباحث میں اس کا بیان آئے گا۔

# جمع آوری آیات وتفسیر

## خلقت ثابت و پائیدار

پہلی آیت کہ جس میں دین کو ایک فطری چیز شمار کیا گیا ہے، اس میں پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اپنے پروردگار کے آئین خالص کی طرف رُخ کرو (فاقم وجهك للدين حنيفاً[۲])

پھر اس حکم کی علت و سبب بیان کرنے یا ترغیب و تشویق کی غرض سے فرمایا: یہی فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ (فطرت الله التى فطر النّاس عليها[۳])

چونکہ تشریع و تکوین میں ہم آہنگی مسلم ہے لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی چیز خلقتِ انسان میں بنیادی حیثیت رکھتی ہو، مگر انسان کا عمل و کردار اس سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس تعبیر سے آپ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اصل توحید کی پیروی واجب اور ہر قسم کے شرک سے دور ہونا ضروری و لازم ہے،

اس کی تاکید مزید کے لیے ارشاد ہے: خدا کی آفرینش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی (لاتبديل لخلق الله) یعنی وہ چیز جو انسان

---

[۱] لسان العرب۔ مفردات راغب۔ نہایہ ابن اثیر مجمع البحرین۔

[۲] حنیف" کا مادہ "حنف" ہے کہ جس کا معنی ہر قسم کا میلان یا انحراف ہے اور گمراہی سے ہدایت کی طرف میلان کو بھی "حنف" کہتے ہیں اسی طرح باطل سے حق کی طرف آنے کو بھی "حنف" کہا جاتا ہے۔ وجہ" خدا کی ذات کے لیے کنایہ ہے، کیونکہ وجہ (چہرہ) تمام اعضاء بدن میں اہم ترین اور قوائے سامعہ! باصرہ اور ذائقہ کا مرکز ہے۔

[۳] فطرت اللہ۔ منصوب یعنی زبر کے ساتھ آنے کے کئی وجوہ ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اس میں "اتبع" یا الزام" مقدر ہے۔

کے باطن کی گہرائی میں موجود ہے۔ وہ ایک اصل ثابت اور باقی رہنے والی چیز کے عنوان سے موجود ہے) جیسا کہ توضیحات کے ذیل میں اس کا ذکر آ رہا ہے یہ جملہ پُر معنی اور اعجاز آمیز ہے۔ چنانچہ موجود دور کے دانش مندوں کے مطالعات وتحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی جذبہ وانگیزہ انسان کے مضبوط ترین جذبوں میں سے ہے جو تاریخ کے طویل زمانے میں موجود رہا اور آیندہ بھی موجود رہے گا۔

لیکن چونکہ جاہل و بے خبر لوگوں نے اس کو شرک کی خرابیوں سے آلودہ کر دیا تھا "لہٰذا" "حنیفاً" کہہ کر اس کو پاک وخالص رکھنے کا تذکرہ کیا ہے [۱]۔

پھر تاکید مزید کے لیے فرمان آیا: یہ آئیں مضبوط، مستحکم اور مستقیم ہے (ذلك الدين القيم) لفظ قیم کا مادہ "قیام" ہے جس کا معنی ثابت و مستقیم ہے نیز معاش ومعاد کے معاملے کو قائم کرنے والا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے [۲]

چونکہ بہت سے لوگ اس حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اسے بت پرستی سے آلودہ کر دیا ہے آیت کے آخر میں کہا گیا: لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ (ولكن اكثر الناس لا يعلمون)

یاد رہے کہ اس آیت میں جس چیز کو فطری شمار کیا گیا ہے وہ توحید پرستی نہیں بلکہ دین کامل مع اصول وفروع کے ہے خدا نے چاہا تو ہم توضیحات کے ذیل میں اس عمدہ بحث کی تفصیل بیان کریں گے۔"

## جب طوفان حوادث کا شکار ہوتے ہیں:

آیات ۲۔ ۳۔ ۴ میں (بہ اختلافِ تعبیر) ایک قاعدہ کلیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تکلیف سختی میں جب انسان کو عام ذرائع کام نہ دے رہے ہوں تو وہ اپنی اصلی فطرت کی طرف لوٹ آتا ہے اور خدا شناسی کا چھپا ہوا نور شعلہ زن ہوتا ہے اس وقت انسان کی توجہ علم وقدرت کے اسی مبداء کی طرف ہوتی ہے اور اس کی تمام مشکلات بہ آسانی حل ہو جاتی ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے: جب لوگ تکلیف میں ہوں تو اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں (واذا مس الناس ضر دعوا ربهم منيبين اليه) مگر جب طوفان ٹل جاتا ہے اور خدا انہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھاتا ہے تو ان میں ایک فریق مشرک بن جاتا ہے (ثم اذا اذاقهم منه رحمة اذا فريقٌ منهم بربهم يشركون)

ایک اور مقام پر ایک روشن مثال کے ساتھ سختیوں اور دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے اسی مضمون کو بیان کیا ہے: جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں۔ اور سمندر کی ہولناکی اور طوفان وگرداب اور بلند وبالا موجوں میں گھر جاتے ہیں تو خدائے واحد کو پکارتے ہیں جب کہ دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ انہیں ساحل پر پہنچاتا اور نجات دیتا ہے تو وہ پھر سے شرک کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ (فاذا ركبوا في

---

[۱] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ لا تبديل لخلق الله" میں "لا" نافیہ ہے لیکن نہی کا مفہوم ادا کرتا ہے (مجمع البیان۔ المیزان) تفسیر ابوالفتوح رازی) لیکن ہم نے سطور بالا میں اس آیت کو جو تفسیر کی ہے اس کے مطابق یہاں نفی کے معنی مناسب ہیں (غور کریں)

[۲] مفردات راغب و دیگر کتب لغت۔

الفلك دعو الله مخلصین له الدین فلما نجاھم الی البر اذا ھم یشر کون)

ایک اور آیت میں اسی خطرات سے دریا کے مسئلہ کو ایک اور انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا: خدا وہی ہے جو تمہیں خشکی اور دریا کی سیر کراتا ہے جب تم کشتی میں بیٹھتے ہو اور موافق ہوائیں تمہیں منزل کی طرف سے لے جارہی ہوتی ہیں تو وہ ہشاش بشاش ہوجاتے ہیں، اچانک سخت طوفان ان کو گھیر لیتا ہے۔ دریا بپھر جاتا ہے ہر طرف سے موجیں کشتی کی طرف آنے لگتی ہیں اور موت سامنے نظر آرہی ہوتی ہے۔ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا وقت آجاتا ہے اور اس وقت انہیں خدا یاد آجاتا ہے اور وہ اسے خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں وہ سب یہ عہد کرتے ہیں کہ اگر ہمیں اس مصیبت سے نجات مل جائے تو ہم اس کے شکر گزار رہوں گے (شکر با معرفت)

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۲۲﴾ [۱۰:۲۲]

لیکن جب خدا ان کو نجات عطا فرماتا ہے ساحل نجات پر پہنچ جاتے ہیں تو خدا کے ساتھ کیا ہوا عہد و پیمان بھول جاتے ہیں اور زمین میں ناحق ظلم کرتے ہیں (شرک کا راستہ اپنا لیتے ہیں جو ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ نعمتوں پر غرور کی بدولت وہ کمزور لوگوں پر ستم رانی کرتے ہیں) فلما انجھم اذا ھم یبغون فی الارض بغیر الحق)۔

یہ مفہوم و دیگر دو آیتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ ان میں سے ایک میں ارشاد ہوا: جب انسان کو رنج و تکلیف ہوتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے لیکن جب ہم اس کی مشکل حل کر دیتے ہیں تو وہ ایسا لگتا ہے کہ اس نے ہمیں حل مشکل کیلئے پکارا ہی نہ تھا (وہ ہر بات بھول جاتا ہے)

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَاۤ اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ [۱۰:۱۲]

اس کے باوجود کہ یہ پانچ آیات ایک ہی حقیقت کا ذکر کرتی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک میں نئی ادا اور نئی لطافت پائی جاتی ہے، بعض آیتوں میں نقصانات اور مشکلات کا ذکر ہے جن میں بیماریاں اور قحط وغیرہ جیسے مصائب و آفات سبھی شامل ہیں جب کہ کچھ آیات میں دریائی سمندری خطرات کا تذکرہ ہے ان میں موجیں، گرداب طوفان نیز خطرناک آبی جانور اور راستہ بھول جانا وغیرہ شامل ہے۔ لیکن بعض آیات میں فقط امواج اور طوفان کا ذکر ہے پھر چند ایک آیتوں میں مشکلوں کے حل ہوجانے، مصائب کے دور ہونے اور تکلیفوں کے ازالے کے بعد لوگوں کا شرک کی طرف پلٹ جانا مذکور ہوا کچھ آیتوں میں ظلم اور سرکشی کا ذکر ہے جو شرک کی نسبت وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔

کئی آیات میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ مشکلوں اور مصیبتوں کو خدا کی طرف سے اور نعمتوں کو اپنی کوششوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں کہیں ذکر ہے کہ وہ سب کے سب مشرک بن جاتے ہیں اور کہیں یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ شرک کی طرف پلٹ جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے باہم مختلف ہوتے ہیں، یعنی بعض پہلی قسم میں اور بعض دوسری قسم میں داخل ہیں۔

کسی آیت میں ہے کہ وہ مصیبت کے وقت، خدا سے عہد و پیمان باندھتے ہیں لیکن آرام وراحت خاص ہونے کے بعد اسے بھول جاتے ہیں لیکن بعض آیتوں میں فقط دعا کرنے اور خدا کو پکارنے کا ذکر ہے بعض مقامات پر معمولی تکلیف کا ذکر ہے (مس کی تعبیر میں اسی طرف اشارہ ہے) لیکن بعض موقعوں پر کہا ہے جس وقت ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوں تو وہ خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، یہ کیفیت شاید انسانوں کے مقامات اقسام کی وجہ سے ہے کہ کچھ پہلی قسم میں اور کچھ دوسری قسم میں ہوتے ہیں۔

ان میں سے اکثر آیات میں لفظ ''اخلاص'' آیا ہے جو خداوند عالم کے بغیر کسی اور معبود کی نفی کی طرف اشارہ ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ لوگ آرام وراحت میں بھی خدا پرست ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ شریک قرار دیتے ہیں، مگر جب بپھری ہوئی موجیں یا طوفان ان کے سامنے آتا ہے۔ تو خدا کے وہ تمام شرکاء ان کے دل و دماغ سے محو ہو جاتے ہیں اور توحید و یکتا پرستی کا نور ان کے وجود پر پھیل کر اسے روشن کر دیتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے (جیسے تفسیر روح البیان میں ہے) کہ بت پرست کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو بت بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں (یاد رہے کہ بحری سفر ہمیشہ خطرات سے پُر ہے، لیکن پہلے وقتوں میں یہ خطرات بہت زیادہ تھے اور آج کے وسائل اس زمانے میں نہیں تھے) جب طوفان میں گھر جاتے تو بتوں کو دریا میں پھینک دیتے اور یارب! یارب! کی آوازیں بلند ہوتیں عجیب تربات یہ تھی کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے تمام لطیف و منطقی دلائل سنتے رہتے۔ مگر ایمان نہیں لاتے تھے، لیکن جب طوفان کی مشکل اور مصیبت میں پھنس جاتے تو اپنے پورے جسم و جان کے ساتھ خدائے واحد کی طرف جھک پڑتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداشناسی کا فطری طریق بہت سے لوگوں کے لیے دیگر طرائق سے بڑھ کر صاف اور روشن ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو افراد مشکلات کے دورانِ فطرت کی آواز پر کان لگاتے اور تنگی و سختی کے دور ہو جانے پر اسے بھول جاتے ہیں قرآن مجید ان افراد کو خبردار کرتا ہے اور بڑے لطیف انداز میں انہیں اس شک و تردد اور غلط فہمی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمۡ جَانِبَ الۡبَرِّ اَوۡ یُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ وَکِیۡلًا ﴿۶۸﴾ [۱۷:۶۸]

کیا تم اس سے مامون ہو کہ خدا وند عالم تمہیں شدید زلزلہ سے زمین میں دھنسا دے یا تم پر سنگریزوں کا طوفان بھیج دے تو تمہیں کوئی نگہبان و مددگار نہیں ملے گا۔''

کیا بحر و بر کے دو خدا ہیں یا خداوند کریم سمندر پر قدرت رکھتا ہے اور خشک زمین پر قدرت نہیں رکھتا؟ ہوسکتا ہے کہ اس کے حکم سے زمین تمہیں تمہارے شہروں سمیت اپنے اندر لے جائے اور نگل لے، حتیٰ کہ ان کے آثار بھی باقی نہ رہیں [1]۔

نیز کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک گرد باد سے سنگریزے اور جڑی بوٹیاں بلندی پر گئے اور دوسرے مقام پر بارش کی طرح برس پڑے، کبھی ایسا بھی ہوا کہ نہ صرف ایک انسان بلکہ پورا قافلہ ہی ان کنکروں کے نیچے دفن ہو گیا پس وہ خدا جو دریا و سمندر میں موجوں اور گردابوں کو حکم دیتا ہے۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ صحرا میں آندھی اور زلزلے کو بدکاروں کی موت کا ذریعہ بنا دے!

اس کے بعد ایک اور آیت میں ان لوگوں کے جواب میں فرماتا ہے: کیا تم اس چیز سے محفوظ ہو کر وہ تمہیں پھر سے دریا میں دھکیل دے اور سخت آندھی اور طوفان کو مامور کرے کہ وہ تمہیں غرق کر دیں، جب کہ تمہارے خون کا دعویٰ کرنے والا بھی کوئی نہ رہے۔

اَمۡ اَمِنۡتُمۡ اَنۡ یُّعِیۡدَکُمۡ فِیۡهِ تَارَۃً اُخۡرٰی فَیُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیۡحِ فَیُغۡرِقَکُمۡ بِمَا کَفَرۡتُمۡ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ عَلَیۡنَا بِهٖ تَبِیۡعًا ﴿۶۹﴾ [۱۷:۶۹]

یعنی تم یہ خیال کرتے ہو کہ یہ آخری موقع ہے کہ تمہیں دریا میں سفر کرنے کی ضرورت پڑی تو یہ کتنی بڑی غلط فہمی ہے!

آری چوبہ گشتی طبیب ازخود میازار
چراغ از بہرتاریکی نگہ دار

## وہ لوگ بھی اعتراف کرتے ہیں:

موردِ بحث آیات میں پانچویں سے نویں آیت میں اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: جب ان (بت پرستوں) سے آسمان و زمین کے خالق کے متعلق سوال کریں تو وہ جھجک جواب دیتے ہیں، خداوند قادر ان کا آفریدگار ہے۔(ولئن سالتہم من خلق السموت ولارض لیقولن خلقھن العزیز العلیم) اور اگر ان سے خود ان کے خالق کے بارے میں پوچھا جائے تو کہتے ہیں: ان کا خالق خدا ہے تمہیں آسمان و زمین سے رزق بتا ہے۔ کس نے آنکھیں اور کان دیئے کون مردہ میں سے زندہ اور زندہ میں سے مردہ کو نکالتا ہے اور کون امورِ عالم کو چلانے والا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ خدائے یکتا (قل من یرز قکم من السماء والارض امن یملك السمع والا بصار ومن یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی ومن یدبرُ الامرَ فسیقولون اللہ) اسی طرح بت پرستوں سے مخلوقات کی پیدائش و تدبیر کے متعلق سوال کیا جائے تو وہ خداوند یکتا ہی کا نام لیتے ہیں۔

---

[1] چند سال قبل شمالی افریقہ میں ایسا زلزلہ آیا کہ ایک گاؤں اپنے تمام باشندوں اور عمارات سمیت کچھ اس طرح زمین میں دھنس گیا کہ اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔ جب لوگ وہاں گئے تو انہیں اس گاؤں کے کھنڈرات بھی نہ ملے۔

یہ آیات اور اسی طرح کی دیگر آیات قرآن، توحیدِ فطری کی زندہ مثالیں[1] ہیں۔ ممکن ہے ان (بت پرستوں) کا یہ جواب ''برہان نظم'' کے عنوان سے توحید پر عقلی استدلال کے مشابہ ہو، لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ عرب کے مشرک لوگ ان پڑھ علم و استدلال سے ناواقف تھے ان کے جوابات کی یہ ہم آہنگی بتائے گی کہ ان کے جوابات کا سرچشمہ فطرت ہے جس مین وہ سب برابر ہیں...... ورنہ عقلی استدلال کتنا ہی واضح و روشن کیوں نہ ہو۔ وہ لوگوں میں عمومی ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتا جب کہ وہ بت پرست علم و دانش سے کوسوں دور تھے۔

اسی بناء پر ہم کہہ رہے کہ یہ پانچوں آیات درحقیقت، توحیدفطری، کی سند بن کر آئی ہیں جیسا کہ تفسیر روح البیان میں سورۂ زخرف کی آیت ۹ کے ذیل میں ہے: اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ معرفت الٰہی انسان کی سرشت میں رکھ دی گئی ہے[2]

تفسیر فخر رازی میں بھی سورۂ زخرف کی آیت ۸۷ کے ذیل یہی بات سوال و جواب کی صورت میں مذکور ہے:

ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ یہ آیت اور اسی طرح کی دیگر آیات دلالت کر رہی ہیں کہ ''معرفت وجود خدا'' فطری یز ہے لیکن بعض علماء کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ قوم فرعون...... فرعون کے سوا کسی معبود کا تصوّر نہیں رکھتی تھی اور قوم ابراہیمؑ نے پیغمبروں سے کہا تھا۔ انا لفی شك مما تدعوننا الیه یعنی تم ہمیں خدا کی طرف جو دعوت دیتے ہو اس کے متعلق ہم شک و شبہ رکھتے ہیں۔

پھر فخر رازی نے اس کے جواب میں لکھا ہے: ہم یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں کہ قوم فرعون وجود خدا کی منکر تھی کیونکہ قرآن میں ہے: وجحدُوبها واستیقنتها انفسهم ظلماً۔ وہ آیاتِ الٰہی کا ظلماً انکار کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ وجودِ خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ نیز حضرت موسیٰؑ نے بھی اسی (توحیدفطری) سے فرعون کے سامنے استدلال کرتے ہوئے فرمایا: لقد علمت ما انزل هولاء الا رب السمٰوٰت والارض بصآئر۔ تو جانتا ہے کہ زمین اور آسمان کے پروردگار کے علاوہ کسی اور نے ان آیات کو دلوں کی روشنی کے لیے نازل نہیں کیا ہے[3] تو جانتا ہے'' ...... کے جملے میں، توحیدفطری، کی طرف اشارہ ہے...... دلچسپ بات یہ ہے کہ آیات میں سے دو آیتوں میں کفار و مشرکین اقرار کرتے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے...... اس لیے فرمایا گیا: ہے[4]

فانی یوفکون (یعنی حق کا اقرار کرنے کی صورت میں کیوں خدا کی بندگی سے منہ موڑتے ہو؟)۔[5]

اس فعل کا مجہول ہونا اسی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اپنی ذات میں وہ حق کا اقرار کرتے ہیں لیکن خارجی عوامل جن و انس کے شیاطین اور داخلی عوامل ''نفسانی خواہشات اور جاہلی تعصب، انہیں حق سے منحرف کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی فطرت کی گہرائیوں میں موجود ہے ایک اور

---

[1] جیسا کہ سورۂ عنکبوت کی آیت ۶۳، سورۂ لقمان کی آیت ۲۵، سورۂ زمر کی آیت ۳۸ میں یہی مضمون آیا ہے۔

[2] تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۳۵۳ ذیل آیت ۹ نیز اسی تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۳۹۹ ذیل آیت ۸۷ میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔

[3] تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۳۵۳ ذیل آیت ۹ نیز اسی تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۳۹۹ ذیل آیت ۸۷ میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔

[4] (تفسیر کبیر جلد ۲۷ صفحہ ۲۳۳)

[5] یوفکون از مادہ ''افک (بروزن اسم) پلٹانے اور پھرانے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے ''دروغ'' کو بھی ''افک'' کہا جاتا ہے اور مخالف ہواؤں کو بھی ''موتفکات'' کہتے ہیں۔

مقام پر ''فانی تسحرون، کی تعبیر تم پر کہاں سے جادو کیا گیا ہے میں بھی فعل مجہول آیا ہے......اس طرح سے ایسے شخص کو خطاب کیا جاتا ہے جو بلاارادہ کسی کام کے پیچھے پڑا ہو۔

البتہ ان آیات کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے......پیغمبر اکرمؐ چاہتے ہیں کہ ہمیں راہ حق سے پلٹا دیں یا یہ کہ وہ ساحر ہیں اور انہوں نے ہم پر سحر کر دیا ہے قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے اس کے باوجود کہ تم اعتراف کرتے ہو کہ خدا ہی آسمانوں، زمین، شمس و قمر اور انسانوں کا خالق اور اس جہان کی تدبیر امور کرنے والا ہے......پھر تمہیں اس شخص نے کیونکر منحرف یا مسحور کر دیا ہے جو اس کی عبادت اور اس غیر کی نفی عبادت کی دعوت دیتا ہے کونسی عقل ایسی بات سوچتی ہے؟

بہت سے مفسرین جیسے طبرسی مجمع البیان میں، علامہ طباطبائی المیزان میں فخر رازی، تفسیر کبیر میں، آلوسی روح المعانی میں اور قرطبی تفسیر قرطبی میں پہلی ہی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ دوسری تفسیر بھی مذکورہ آیت کے مفہوم سے چنداں مغائرت نہیں رکھتی۔

## عالم ذر میں عہد و پیمان:

زیر بحث آیات میں سے دسویں اور آخری آیت میں ''توحید فطری'' کی ایک ایسی صورتِ ذکر کی گئی ہے جس کی نظیر قرآن مجید کی دیگر آیات میں نہیں ہے......اس آیت کا مفہوم و مطلب کیا ہے؟ چونکہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اس لیے اس بارے میں علماء مفسرین متکلمین اور محدثین کے مابین بہت زیادہ گفتگوئیں ہوئی ہیں......اس آیت کی تفسیر کے بعد ہم ان کے مختلف نظریات اور اپنے موقف کو مختصر طور پر بیان کریں گے۔

خداوندِ عالم فرماتا ہے: اس وقت کو یاد کرو کہ جب تمہارے پروردگار فرزندانِ آدم کے صلبوں سے ان کی ''ذریت'' کو نکالا (حاضر کیا) اور انہیں خود انہی پر گواہ بنا کر ان سے پوچھا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ **واذ اخذ ربك من بنی ادم من ظهور هم ذريتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربکم۔''**

ان سب نے بھی یکبارگی کہا......ہاں! ہم گواہی دیتے ہیں۔ **قالو بلیٰ شهدنا۔**

پھر فرمایا: خدا نے یہ عمل اس لیے انجام دیا کہ وہ قیامت کے روز یہ نہ کہیں کہ ہم اس موضوع (توحید و معرفت خدا) سے غافل و بے خبر تھے۔ **انتقولو یوم القیامة انا کنا عن هذا غافلین۔** یا بجائے۔ ''غفلت'' کا عذر لانے کے ''تقلید کا بہانہ بنائیں اور کہیں کہ ہمارے آباء واجداد پہلے ہی مشرک تھے (ہم ان کی اولاد تھے اور اس کے علاوہ ہمارا کوئی چارہ نہ تھا) تو کیا ان بے راہ لوگوں کے گناہ کی سزا ہمیں دی جائے گی۔ **اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۡۢ بَعۡدِهِمۡ‌ۚ اَفَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ﴿۱۷۳﴾** (اعراف ۱۷۳)

یہ آیات اجمالی طور پر ایک سلسلہ حقائق سے پردہ اٹھا رہی ہیں۔

(۱) ایک وقت خداوند عالم نے قیامت تک آنے والے تمام فرزندانِ آدم کو ظاہر کیا۔

(۲) خداوند عالم نے ان کو خود ان کے نفسوں پر گواہ بنایا اور ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرایا۔

(۳) اس اقرار عہد کا مقصد یہ تھا ''اولاً'' قیامت کے دن مشرک لوگ غفلت و بے خبری کا دعویٰ نہ کریں۔ ثانیاً پہلے لوگوں کی تقلید کو اپنی بے گناہی کی دلیل نہ بنائیں۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اولادِ آدم کا یہ ظہور و بروز کب واقع ہوا......اس کی کیفیت کیا تھی۔ عالم ذر سے کیا مراد ہے؟ یہ کس طرح تحقیق پذیر ہوا؟

اس سوال کے جواب، عالم ذر کی تشریح اور مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں چھ قول ہیں:

## (۱) محدثین واہلِ ظاہر کا مسلک

بعض احادیث کے مطابق ان کا خیال ہے کہ فرزندانِ آدم......آدم سے قیامت تک......چھوٹے چھوٹے ذرات کی صورت میں پشتِ آدم سے نکلے اور فضا ان سے بھر گئی ان میں عقل و شعور موجود تھا اور وہ کلام بھی کر سکتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں مخاطب کیا اور فرمایا کہ میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں الست بربکم۔ سب نے ایک ساتھ جواب دیا کہ......ہاں......بلیٰ خدا نے اس ترتیب سے توحید پر عہد و پیمان لیا۔ اپنی ربوبیت پر خود انسان ہی کو گواہ بنایا۔ [۱]

## (۲) عالم ذر

عالم ذر کے حوالے سے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ انسانی وجود کے ذرات یعنی ''نطفہ'' باپ کے پشت سے ماں کے رحم میں منتقل ہوا اور درجہ بدرجہ عالم جنین میں انسانی صورت میں آیا۔ اسی حالت میں خداوند عالم نے ان میں قوت و استعداد رکھ دی ہے کہ وہ حقیقت توحید اور آئین حق کا ادراک کر سکیں گویا توحید فطری کا تصور خود انسان کے وجود میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس تفسیر کو مفسرین کے ایک گروہ جیسے المنار اور فی ظلال القرآن نے اختیار کیا اور بعض دوسرے مفسروں نے بھی اسے نقل کیا ہے [۲]

اس نظریئے کے مطابق ''عالم ذر'' یہی ''عالم جنین'' ہے اور مذکورہ سوال و جواب زبان حال سے ہے نطق و زباں سے نہیں اس مطلب کے شواہد عرب وغیرہ عرب کے کلام میں بہت ہیں۔ جیسا کہ سید مرتضیٰ نے بعض حکماء سے نقل کیا ہے: اسئل الارض من شق انھارك وغرس اشجارك وجنی ثمارك ؟ فان لم تجبك حوارًا اجابتك اعتبارًا زمین سے پوچھو کہ تیرے دریاؤں کو کس نے جاری

---

[۱] علامہ مجلسی اصولِ کافی کی شرح ''مرأۃ العقول، جلد ۷ صفحہ ۳۸ میں لکھتے ہیں: یہ محدثین اور متقین کا طریقہ ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ایمان ظاہر پر ہے اور ہم مزید غور نہیں کرتے نہ توجیہ و تاویل کی طرف جاتے ہیں۔ فخر رازی نے اس قول کو محدثین و مسرین کی طرف منسوب کیا ہے جلد ۱۵ صفحہ ۴۶۔

[۲] لمنا جلد صفحہ ۳۸۷ البتہ ان کی بعض تعبیریں قول پنجم کے مطابق معلوم ہوتی ہیں) فی ظلال القران جلد ۳ صفحہ ۶۷۱۔

کیا، درختوں کو کس نے بویا میوؤں کو کس نے چنا۔۔۔اور وہ (زمین) تجھے ظاہر کی زبان سے جواب نہ دے تو زبان حال سے جواب دے گی۔
یہ بات اس بیان کے مطابق ہے کہ جو مفسرین نے موجودات جہان کی عمومی تسبیح وتحمید حتی کہ بے جان اشیاء کی تسبیح کے ذیل میں تحریر کیا ہے۔

## ۳۔عالم ذر سے مراد عالم ارواح ہے

یعنی خدائے تعالیٰ نے اجسام سے پہلے ارواح کو پیدا کیا، انہیں مخاطب کیا اور ان سے توحید کا اقرار لیا۔۔۔یہ تفسیر بعض روایات سے لی گئی ہے جن کا ذکر بعد میں ہوگا۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اس بحث میں لفظ ''ذریت'' کا مادہ ''ذر'' بروزن ''شر'' ہے جس کا معنی غبار کے چھوٹے چھوٹے ذرات یا نطفہ کے اجزاء وذرات ہیں یا اس کا مادہ ''ذرو'' بروزن ''مرو'' ہے جس کا معنی منتشر و پراگندہ ہونا ہے یا یہ لفظ ''ذراء'' بروزن ''زرع'' سے ہے جس کا معنی خلقت و پیدائش ہے بناء بریں اس بات کو مسلم نہیں قرار دینا چاہیے کہ ''ذریت'' کا مادہ ''ذر'' ہی ہے جس کا معنی چھوٹے چھوٹے ذرات واجزاء ہیں (غور کریں)

## ۴۔ سوال وجواب بوسیلہ پیغمبران:

یہ سوال وجواب خدائے تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان پیغمبروں کے وسیلے سے ہوا جو نطق اور دربان سے ادا ہوا۔ کیونکہ انسانوں میں سے ایک گروہ نے پیدا ہونے کے بعد کمال عقل اور دلائل توحید و یکتا پرستی کو پیغمبروں کی زبان سے سنا اور اس کا مثبت جواب دیا یعنی بلیٰ (ہاں) کہہ کر اس کا اقرار کیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ''ذریت'' ذر سے ہے جس کا معنی چھوٹے چھوٹے ذرات ہیں تو یہ مطلب صحیح نظر نہیں آ تا اس قول کے طرفدار کہتے ہیں کہ ذریت کا معنی فرزند اولاد ہے خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے............پھر ذریت کا اطلاق اکثر عاقل وبالغ انسانوں پر ہوا لہٰذا یہ تشریح درست نہیں ہوگی۔ اس تفسیر کو سید مرتضیٰ نے مذکورہ آیت کے ذیل میں ایک احتمال کے طور پر درج کیا اور فخر الدین رازی نے بھی یہی اشارہ دیا ہے۔[1]

## (۵) یہ سوال وجواب بزبان حال ہوا

خداوند اور انسانوں کے درمیان یہ سوال وجواب بزبان حال ہے اور یہ بلوغ اور کمال عقل کے بعد ہوا ہے کیونکہ کمال عقل کے بعد جب انسانوں نے انفس وآفاق میں خدا کی قدرت کو دیکھا تو زبانِ حال سے اس ذاتِ واحد کے وجود کا اقرار واعتراف کیا گو یا خداوند عالم نے اپنی آیات اور نشانیاں دکھانے کے بعد ان سے سوال کیا۔ الست بربکم کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں اور وہ زبانِ حال سے جواب دیتے ہیں۔ بلیٰ (ہاں)......زبان قال سے اس گفتگو کے بہت سے شواہد ونظائر موجود ہیں۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح۔ رازی جلد ۵ صفحہ ۳۲۶

اس تفسیر کو علامہ طبرسیؒ نے تبیان میں بلخی اور رمانی سے نقل کیا ہے۔[1]

## (۶) المیزان میں منقول تفسیر

اس آیت کی تفسیر جو علامہ طباطبائی نے المیزان میں بہ صورت انتخاب نقل کی ہے، اس میں آپ نے پہلے اس بات کو محال شمار کیا ہے کہ افراد انسان ظاہری پیدائش سے قبل حیات وعقل وشعور کے ساتھ مستقل وجود رکھتے تھے، خداوندتعالیٰ نے ان سے اعتقاد بہ توحید کا پیمان لیا اور پھر انہیں پہلی حالت کی طرف پلٹا دیا، تاکہ وہ اپنی پیدائش کا طبعی راستہ طے کریں اور پھر دنیا میں آئیں۔ بعد فرماتے ہیں:

إِنَّمَآ أَمۡرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيۡـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ۞٨٢ فَسُبۡحَٰنَ ٱلَّذِي بِيَدِهِۦ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيۡءٍ (یٰس۔ ۸۲۔۸۳)

جب وہ کچھ چاہے تو فرمانِ خدا یہی ہے کہ فرماتا ہے ''ہوجا'' اور وہ ''ہوجاتا ہے پس پاک ہے وہ ذات جس کے قبضے میں ہر چیز ہے۔''

وَمَآ أَمۡرُنَآ إِلَّا وَٰحِدَةٌ كَلَمۡحِۭ بِٱلۡبَصَرِ ۞٥٠ [۵۴:۵۰]

ہمارا حکم ایک سے زیادہ مرتبہ نہیں ہوتا۔ جیسے ایک بار پلک جھپکنا۔''

ان آیات سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ اس دنیا کی چیزوں کی دو حالتیں ہیں......ایک دنیا میں آنے کی صورت......اس کا حکم یہ ہے کہ ایک چیز مرحلہ وار ''قوت'' سے ''فعل'' اور ''عدم'' سے ''وجود'' میں آتی ہے......ابتداء میں ناقص اور پھر کامل ہوجاتی ہے اس کے بعد فنا ہوکر اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جاتی ہے۔......دوسری خدا کے ہاں (وجود میں آنے کی صورت......اس میں اشیاء عالم خدا کی طرف سے امر ہیں کہ وہ فعل محض اور غیر تدریجی بجز اس کے کہ وہ قوت یا نقص کی حامل اور فعلیت کے آنے کے منتظر ہوں۔ بہ الفاظ دیگر موجودات دو طرح کا وجود رکھتے ہیں......ایک وجود جمعی نزد خدا کہ قرآن میں اسے ملکوت کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے......دوسرا وجود پراگندہ کہ جو وقت گزرنے کے ساتھ مرحلہ وار پروان چڑھتا ہے۔

اس ترتیب سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں عالم انسانیت سے پہلے ایک اور عالم انسانیت ہے کہ جس میں انسان شہود باطنی کے ذریعے ذات الٰہی کا مشاہدہ کررہا ہے اور واحدانیت کا اقرار کرتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اگر مذکورہ آیات میں غور وفکر کیا جائے تو معلوم ہوگا یہ اسی معنی ومطلب کی طرف اشارہ کررہی ہیں[2]

---

[1] تفسیر تبیان جلد ۵ صفحہ ۲۷، تفسیر المنار جلد ۹ صفحہ ۳۸۶ میں بھی یہ بیان موجود ہے۔
[2] تفسیر المیزان جلد ۸ صفحہ ۳۳۴۔

اگر چہ محولہ بالا چھ تفسیریں اجمالی طور پر آیت کا مفہوم واضح کر رہی ہیں تو بھی مناسب ہے کہ ہم کچھ تنقید و تبصرہ کریں۔

## قول اوّل:

بہت سے محققین نے پہلے قول کو سب سے ضعیف و کمزور قرار دیا ہے اور اسی پر زیادہ اشکالات بھی وارد کیے ہیں۔ علامہ طبرسی نے مجمع البیان'' اور سید مرتضٰی نے ایک کلام میں اس پر نکتہ چینی کی ہے جسے علامہ مجلسی نے امراۃ العقول'' میں ان سے نقل کیا ہے۔ فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اس قول پر بارہ اعتراضات کیے ہیں۔ ان میں سے بعض کچھ زیادہ قابل توجہ نہیں ہیں۔ بعض میں تکرار ہے اور بعض ایک دوسرے میں جمع ہو سکتے ہیں لیکن ان کا سرسری جائزہ لینے سے اس قول پر یہ پانچ اشکالات جاندار معلوم ہوتے ہیں:

الف: یہ تفسیر لفظ۔ بنی آدم'' اور جمع کی ضمیروں کے ساتھ جو آیت میں ہیں...... فرزندان آدم کے بارے میں گفتگو کرتی ہے یہ حضرت آدم ''اور جمع کی ضمیروں کے ساتھ جو آیت میں ہیں...... فرزندان آدم کے بارے میں گفتگو کرتی ہے یہ حضرت آدم کے متعلق نہیں ہے کیونکہ لفظ ظہور'' جو ''ظہر'' (پشت) کی جمع ہے اس سے مناسبت نہیں رکھتا...... خلاصہ یہ کہ آیت کہہ رہی ہے فرزندانِ آدم کی ''ذریت'' ظاہر ہوئی لیکن یہ نہیں کہا کہ حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد ظاہر ہوئی حالانکہ روایات میں اولاد آدم کے ظاہر ہونے کا ذکر ہوا ہے۔

ب: واقعتاً اگر اسی طرح کا عہد و پیمان اس جہان سے پہلے ایک جہان میں لیا گیا ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ سبھی لوگ اس کو بھول جائیں...... یہ سب کا بھول جانا اس کے عدم پر دلالت کرے گا۔ کیونکہ آیاتِ قرآن سے بخوبی واضح ہے کہ روز قیامت انسانوں کو اس دنیا کے واقعات اور مسائل یاد ہوں گے کیا اس دنیا سے عالم ذر کا فاصلہ دُنیا و آخرت کے درمیانی فاصلے سے زیادہ ہے؟

ج: بالفرض اگر ہم مان لیں کہ عمومی نسیان قابل فہم ہے تو پھر ایسے عہد و پیمان کا کیا فائدہ؟ کیونکہ یہ عہد تبھی مفید ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو یاد ہو۔ لیکن وہ عہد کہ جس کو سب بھول گئے ہوں اس کا نہ کوئی تربیتی فائدہ ہے نہ ہی یہ اتمام حجت کے لیے مفید ہے۔

د: سورۂ مومن کی آیت نمبر ۱۱............ ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین۔ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ کہ انسانوں کے لیے دو موتیں اور دو زندگیاں ہیں یعنی پہلے مردہ تھے زندہ ہوئے پھر مریں گے اور قیامت کے دن زندہ ہوں گے۔ جب کہ اس تفسیر کے مطابق دو سے زیادہ موتوں اور زندگیوں کا قائل ہونا پڑے گا۔ (یعنی ایک موت وحیات عالم ذر میں اور دو بار موت اور دو بار زندگی اس دنیا میں ماننا ہوگی)

ھ: اس تفسیر کو قبول کرنے میں مسئلہ تناسخ کو ماننا لازم ہے کیونکہ تناسخ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ایک روح مختلف اجسام میں زندگی گزرتی ہے اس تفسیر کو رُو سے قبل ازیں روح کا تعلق ان ذرات کے ساتھ تھا جو پشتِ آدم سے ظاہر ہوئے اور پھر موجودہ بدن کے ساتھ تعلق ہوا...... یہ صورت ہی تناسخ ہے اور تناسخ کا باطل ہونا دینِ اسلام کے مسلمات میں سے ہے۔ اسی لیے کتاب جواب المسائل السرویہ'' میں جب شیخ مفید اس تفسیر کو بعض روایات کے تحت ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں یہ روایات قائلین تناسخ کی ہیں جہاں انہوں

نے حق و باطل کو خلط ملط کر رکھا ہے۔[۱]

یہ گفتگو شیخ المفسرین علامہ طبرسی کے کلام میں بھی آئی ہے[۲]

## قول دوم

اس میں کہا گیا ہے کہ انسان کو سرشت توحیدی اور خداشناسی کی خاص استعداد رحم مادر ہی میں عطا کر دی گئی ہیں، اس قول پر اشکالات کی تعداد کم ہے......اس پر اہم ترین اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ آیۂ موردِ بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوال و جواب قولی ہے، زبانِ حال سے نہیں (جسے مجاز و تشبیہ کہا جاسکتا ہے) علاوہ ازیں لفظ ''اخذ'' (لیا) اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ عمل گذشتہ زمانے میں واقع ہوا حالانکہ توحید فطری دائمی طور پر جنینوں سے تعلق رکھتی ہے اور ہر زمانے میں جاری رہتی ہے۔لیکن ان ہر دو سوالات کا جواب دیا جاسکتا ہے:

قرینہ کی موجودگی میں اس سوال جواب کو زبانِ حال پر حمل کیا جاسکتا ہے اور اس میں کوئی مانع نہیں عرب وغیر عرب لوگوں کے نظم نثر میں اس کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں پہلی تفسیر پر جو اشکالات وارد ہوتے ہیں وہ بھی اس تفسیر کی صحت کا ذریعہ بن جائیں گے۔ باقی رہا استمرار'' تو فعل ماضی کبھی استمرار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ البتہ اس کے لیے قرینہ کی ضرورت ہے اور یہ قرینہ محل بحث میں موجود ہے[۳]۔

## قولِ سوم:

اس میں ارواح سے سوال و جواب کا ذکر ہے تاہم یہ آیت موردِ بحث کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ آیت میں بنی آدم کی پشتوں سے ذریت کو نکالنے اور ان سے سوال و جواب کا بیان ہے، اس کا ارواح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

## قول چہارم:

سوال و جواب اس ظاہری زبان میں ہوا اور یہ انسانوں کے اس گروہ سے متعلق ہے جس نے بلوغ کے بعد انبیاء کی دعوت کا مثبت جواب دیا ہے۔اس تفسیر پر کئی اشکالات وارد ہوتے ہیں۔لیکن مذکورہ آیت میں تمام انسانوں کا ذکر ہے نہ کہ ایک گروہ کا جو انبیاء پر ایمان لایا اور پھر کافر ہوگیا۔ جب کہ حسب ظاہر سوال و جواب خدا کی طرف سے ہے انبیاء کی طرف سے نہیں ہے۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آیت انما اشرك اٰبآئونا من قبلُ ہمارے باپ دادا پہلے ہی سے مشرک تھے دلالت کرتی ہے کہ

---

[۱] مراۃ العقول جلد ۷، صفحہ ۴۱۔

[۲] مجمع البیان جلد ۴ صفحہ ۴۹۷۔

[۳] یہ تعبیر بہت سی قرآنی آیات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ انه کان علیما قدیراً' (فاطر۔۴۴) وما کان لبشرٍ ان یکلمه الله الا وحیاً (شوریٰ۔۵۱) بل کان الله بما تعملون خبیراً (فتح۔۱۱) و کان الله عزیزاً حکیماً (فتح۔۱۹)

اس کا تعلق ایک گروہ سے ہے کہ جن کے باپ دادا پہلے ہی مشرک تھے یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ آیت میں ان کے دو عذر ہائے لنگ کا ذکر ہوا ہے ایک غفلت اور دوسرا تقلید آباء............ ممکن ہے ان میں سے ہر عذر کسی ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ کلمہ اَوْ کے ساتھ ان کو باہم ملایا گیا ہے۔

## قول پنجم

یہ قول کئی جہات سے قول دوم سے مشابہ ہے، اس معمولی تفاوت کے ساتھ قولِ دوم میں فطرت قلبی اور اس قول میں فطرتِ عقلی کا تذکرہ ہے اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ بہت سے مفسرین نے اسے قبول کیا ہے۔

## قول ششم

یہ قول تفسیر المیز ان میں آیا ہے اور اس پر دو بڑے اشکال وارد ہوتے ہیں۔

(۱) مذکورہ بالا بیانات میں اس کی جو شرح ہوئی ہے اس میں دو عوالم (عالم جمعی و عالم تفصیلی) کے وجود پر کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔

(۲) اس آیت کو ایک ایسے عالم سے متعلق تصور کرنا (اگر وہ ثابت ہو جائے تو) بہت بعید نظر آتا ہے اس صورت میں اصطلاحی طور پر اصل مسئلہ ہی میں خدشہ ہے تو اس کی فرع یعنی سوال و جواب ہونا بھی مخدوش ہو جاتا ہے۔

## عالم ذر کی بحث کا نتیجہ:

عالم ذر سے متعلق اس تمام بحث پر غور و فکر کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسرا اور پانچواں قول نسبتاً بہتر ہے ان دونوں اقوال پر بہت کم اشکالات وارد ہوتے ہیں۔ اگر چہ بعض جہات سے ظاہری تخالف نظر آتا ہے۔ لیکن قرینہ کی موجودگی اور عرب و عجم کے کلام میں اس کے نظائر کی بدولت یہ مخالفت درخورِ اعتنا نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے مفسرین اور علماء علم کلام نے اسے قبول کیا ہے۔ اور روایات میں بھی اس کے لیے اشارات موجود ہیں جو آئندہ گفتگو میں بیان ہوں گے۔

مختصر یہ کہ اکثر محققین کا نظریہ ہے کہ یہ سوال و جواب تمام انسانوں سے تھا جو زبانِ حال سے واقع ہوا نہ کہ زبانِ قال سے...... یا استعداد فطری کے ذریعے کہ جسے انسان کے نطفہ وجنین میں رکھا گیا یا استعداد عقلی کے وسیلے سے کہ انسانوں کے سن بلوغ تک پہنچنے اور کمال عقل حاصل کرنے کے بعد خدا نے یہ ان کے اندر پیدا کر دیا۔

اس سلسلے میں کہیں فطرت کا قلب کا تذکرہ ہے جس میں کسی قسم کے استدلال کی ضرورت نہیں کہیں فطرت عقل کے لحاظ سے بات ہوئی ہے جس میں معرفتِ خدا کو بدیہی و روشن امور میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ اس کے دلائل اس قدر واضح ہیں کہ ہر انسان انہیں سمجھ سکتا ہے یہ درست ہے کہ انسانوں میں بہت سے افراد اپنی زبان سے اس کا انکار کرتے ہیں اور مادیت و مادہ پرستی کی طرف مائل ہیں لیکن اگر ہم ان کی باتوں کا تجزیہ کریں تو دیکھتے ہیں وہ مادہ وفطرت کے لیے ایک طرح کے عقل وشعور کے قائل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے فطرت وطبیعت کو خدا

کا درجہ دے رکھا ہے۔ یہ چیز ہمارے اعتقاد کے مطابق فطرت دل کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ (غور کریں)

# توضیحات

## (۱) اسلامی روایات میں عالمِ ذر"

مختلف اسلامی مدارک چاہے وہ شیعہ مسلک کے یا اہل سنت کے ہوں ان میں "عالم ذر" کے بارے میں بہت سی روایات پائی جاتی ہیں۔ ظاہراً یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تواتر ہے مثلاً تفسیر نورالثقلین میں تیس تفسیر برہان میں سینتیس اور شاید (حذف مکررات کے بعد) مجموعی طور پر چالیس سے بھی زیادہ ہیں، تفسیر الدرالمنثور میں بھی اس موضوع پر بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں...... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان روایات کے مضامین کسی ایک مسلک کے ساتھ مختص نہیں ہیں۔

لیکن ان میں بہت سی روایات کسی ایک ہی روای سے نقل ہوئی ہیں جو خبر واحد کے حکم میں آتی ہیں...... ان میں بہت "سی زراہ" سے کچھ "ابوبصیر" سے ایک تعداد "جابر" سے اور پھر بعض روایتیں "عبداللہ بن سنان"

"صالح بن سہل" سے بھی ملتی ہیں۔ اس امر کی طرف توجہ دینے سے روایات کی تعداد میں خاصی کمی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان روایات کے نفس مضمون میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔

کچھ روایات قول دوم کی تائید کرتی ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ "اقرار توحید" ایک فطری عہد ہے اور اس کی بازگشت انسان کی پیدائش و آفرینش کی طرف ہے کہ معرفت خدا اس کی سرشت میں رکھی گئی ہے جیسے امام جعفر صادقؑ سے عبداللہ بن سنان نقل کرتا ہے۔ قال سئلته عن قولِ اللہ عزوجل فطرت اللہ التی فطر الناس علیها ما تلك الفطرةُ؟ قال هی الاسلامُ، فطرهم اللہ حین اخذ میثاقهم علی التوحیدِ، قال الستُ بربکم وفیه المومن والکافرُ۔ [۱]

میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا "فطرت اللہ التی فطر الناس علیها" میں فطرت سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس سے مراد اسلام ہے کہ جسے خدا نے تمام انسانوں کی سرشت میں رکھ دیا ہے۔ جس دن یہ عہد و پیمان لیا گیا خدا تعالیٰ نے فرمایا" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ جب کہ ان میں مومن و کافر سب موجود تھے۔

آپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ اس حدیث میں آیتِ فطرت اور عالم ذر میں رابطے کا ذکر کیا گیا ہے یہی مضمون زراہ نے امام جعفر صادقؑ سے دوسرے الفاظ میں نقل کیا ہے زرارہ نے امام جعفر صادقؑ سے واذ اخذربك کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے فرمایا ثبتت المعرفة فی قلوبهم ولسوا الموقفِ۔ ویذ کرونهٔ یوماً۔ ولولاذٰلك لم یدر احدٌ من خالقهٔ ومن رازقهٔ؟ [۲]

---

[۱] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۷ حدیث ۷۔ تفسیر نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۹۵ حدیث ۳۴۵۔

[۲] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۸ حدیث ۱۵۔

معرفتِ خدا ان کے دلوں میں جا گزین ہوگئی لیکن وہ اس دن کے ''موقف'' کو بھول گئے کبھی نہ کبھی یہ ان کے ذہن میں آ جائے گا۔
اگر ایسا نہ ہوتا (کہ معرفت فطری طور پر ان کے قلوب میں ودیعت کی گئی) تو کسی کو پتہ ہی نہ ہوتا کہ اس کا خالق کون اور رزاق کون ہے؟
حالانکہ روایت کا ایک دوسرا حصہ قول اوّل کے موافق ہے اور بتاتا ہے۔
فرزندانِ آدم ذرات کی شکل میں ان کی پشت سے نکلے اور خداوند تعالیٰ نے ان سے عہد زبانِ قال سے لیا جیسا کہ تفسیر برہان کے صفحات ۳۔۴۔۸۔۱۱۔۲۹ میں ذکر ہوا ہے (یہ تمام روایات زرارہ نے امام محمدؑ باقرؑ سے نقل کی ہیں اور وہ سب بطور ایک روایت کے محسوب ہوتی ہیں)۔
یہی مفہوم ومطلب تفسیر منثور میں کئی طرق سے ابن عباس سے منقول ہے کہ جس کا ذکر طول کلام کا موجب ہوگا۔ درحقیقت ان سب روایتوں کا مضمون ایک ہے اور بالآخر وہ ایک ہی روایت کہلائے گی۔ پھر وہ روایت بھی قول ابن عباس ہے نہ کہ پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے۔
یہی مفہوم دیگر کتابوں میں دوسرے طریقوں سے مذکور ہے۔
ان روایات پر ایک اہم ترین اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ یہ سب کی سب ظاہر قرآن بلکہ صریح طور پر قرآن کے خلاف میں کیونکہ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی آدم ذرات کی صورت میں پشت آدم سے برآمد ہوئے جبکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ ذرات پشت ہائے بنی آدم سے باہر آئے۔ **من بنی ادم من ظهورهم ذریتهم** ۔ ان روایتوں پر دیگر بہت سے اشکالات کے علاوہ ایک اور اشکال بھی وارد ہوتا ہے۔ جس کی طرف پہلے اشارہ ہوا ہے کتب حدیث میں ان کو ضعیف روایات کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔
روایات کا تیسرا گروہ مبہم ہے کہ ان کی ایک سے زیادہ تشریحات ہوسکتی ہیں مثال کے طور پر وہ روایت جو ابوبصیر نے امام جعفر صادقؑ سے نقل کی اور کہا ہے کہ میں نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا: **کیف اجابوا وهم ذر** انہوں نے کیونکر جواب دیا، جب کہ وہ ذرات کے سوا کچھ نہ تھے؟ امامؑ نے فرمایا: **جعل فیهم ما اذا سألهم اجابوه یعنی فی المیثاق**۔[۱]
ان میں ایسی صلاحیت رکھ دی کہ جب عہد و میثاق کا سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔
روایات کا چوتھا گروہ بتا رہا ہے کہ انسانوں سے یہ سوال جواب اس وقت ہوا جب کہ وہ ارواح کی صورت میں تھے۔ جیسا کہ مفضل بن عمر نے امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

**قال الله عزوجل لجمیع ارواح (بنی)ادم الستُ بربکم قالو بلی**[۲]

خداوندِ عالم نے بنی آدم کے تمام ارواح سے فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، سب نے کہا۔ ہاں!!
روایات کے پانچویں گروہ میں بتایا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسانی ارواح کو اس صورت میں حاضر کیا کہ جیسے وہ آج ہیں اور پھر ان

---

[۱] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۹ حدیث ۲۲۔
[۲] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۹ حدیث ۲۳۔

سے عہد و پیمان لیا۔[1]

ضعیف ہے اور ان کو ایک تصوّر کر کے ان پر بھروسہ کرنا مشکل ہے۔

بہتر یہی ہے کہ ہم بزرگ علماء کی طرح ان روایات کے بارے میں کوئی فیصلہ دینے سے باز رہیں اور ان کی حقیقت حال ان کے راویوں کے ذمے رہنے دیں[2]

لہٰذا اب ہم رہ گئے اور آیت مذکورہ۔ اس کے بارے میں جو کچھ قرائن سے سمجھا جا سکتا ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ چھ اقوال میں سے دوسرا قول بہت مناسب ہے ہم اسے اختیار کر لیں اس میں عالم ذر کو انسانی سرشت فطری طور پر خدا کی پہچان اور اسلام کے ہم آہنگ کہا گیا ہے پس اب یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب ذرات نطفہ کو پدران کی پشتوں میں سے رحم ہائے مادران میں منتقل کیا گیا ہے تو نور معرفت توحید اور آئین خدا کو ذاتی استعداد کے طور پر ان میں رکھ دیا گیا۔

## ۲۔ کونسی فطرت؟ فطرت عقل یا قلب

خداشناسی کے ایک فطری امر ہونے کے بارے میں محققین اور دانشوروں کی تعبیرات و تشریحات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس میں دو مختلف راستے اختیار کیے ہیں۔

الف: بعض علماء کے نزدیک فطرت سے مراد ''واضح استدلال عقلی'' ہے کہ انسان حد کمال عقل تک پہنچ کر جہان وجود کا مشاہدہ کرتا ہے موجودات کے اسرار و رموز اس کی سمجھ میں آتے ہیں تب وہ یک دم اس حقیقت تک پہنچ جاتا ہے کہ اس پر پیچ اور نوع بہ نوع کائنات کا نظام کسی عقل و شعور رکھنے والی ذات کے بغیر قائم ہونا اور قائم رہنا محال ہے۔

اس عقل کو ''عقل فطری'' کا نام دیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے انسان کسی استاد و معلم کے بغیر اپنے مقصود کو پا لیتا ہے، جیسے انسان کہتا ہے ''کل جزء سے بڑا ہوتا ہے'' تو یہ ایک واضح بات ہے اور اس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح جب وہ کہتا ہے کہ ''دو چیزیں جو ایک تیسری چیز کے مساوی ہوں وہ آپس میں بھی مساوی ہوں گی۔

مباحث منطق میں ایسی چیزوں کو ''بدیہیات'' کہتے ہیں علماء منطق نے انہیں چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی اولیات، مشاہدات، تجربیات، متواترات، حدسیات اور فطریات۔

فطریات یعنی عقل فقط تصوّر سے تصدیق تک نہیں پہنچتی۔ اسے ایک متوسط کی ضرورت ہے اور وہ واسطہ خود ذہن انسانی میں موجود

---

[1] تفسیر درمنثور جلد ۳ صفحہ ۱۴۲۔

[2] اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے ان کتابوں کی طرف رجوع کریں کہ جن میں عالم ذر کے بارے میں روایات موجود ہیں۔ بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۲۷۷ و مابعد مرآۃ العقول صفحہ ۳۶ و مابعد تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۱۶ و مابعد تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۹۳ و مابعد تفسیر الدر المنثور جلد ۳ صفحہ ۱۴۶ و مابعد۔

وحاضر ہے۔

(ب): فطرت کا ایک اور مفہوم بھی ہے جو ہمارے محل بحث میں زیادہ مناسب وموزوں نظر آتا ہے وہ یہ کہ انسان اس کو بغیر استدلال (استدلالِ عمیق) کے درک کر لیتا ہے جب کہ وہ چیز اس کے سامنے ہے اور وہ اسے تسلیم کر رہا ہے۔ مثلاً وہ ایک شاخ اور پھول کو دیکھتا ہے اس کی خوبصورتی اور خوشبو کا اعتراف کرتا ہے۔ اور اس کے درمیان میں کوئی دلیل بھی نہیں کیونکہ واضح ہے۔ کہ وہ پھول خوبصورت بھی ہے اور خوشبودار بھی پس یہاں دلیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔

خدا شناسی کے بارے میں فطری ادراک اسی طرح کا ہے انسان جب دل کی گہرائیوں میں نورحق دیکھتا ہے دل کے کانوں سے صدائے حق سنتا ہے جو اسے علم وقدرت کے مبداء کی طرف دعوت دیتی ہے جو کمال مطلق ہے اس وجدانی ادراک میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے پھول کی خوبصورتی اور خوشبو کو روک کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔

## ایمان بہ خدا کے فطری ہونے کی زندہ دلیلیں:

ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ ایمان بہ خدا کا فطری ہونا تو صرف ایک دعویٰ ہے اور معرفتِ خدا کا ایسا کوئی فطری راستہ موجود نہیں ہے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ وجودِ خدا کا احساس سب کے دل میں ہے لیکن اگر کوئی اسے ماننا ہی نہ چاہتا ہوں تو میں اسے کیسے منواؤں گا۔

تاہم ہمارے پاس عقیدہ توحید کے فطری ہونے کے ایسے شواہد موجود ہیں کہ اگر انہیں صحیح طریقے سے پیش کیا جائے تو منکرین خدا کے منہ بند ہو جائیں ان شواہد کا خلاصہ پانچ حصوں میں کیا جا سکتا ہے۔

## تاریخی واقعات:

وہ تاریخی واقعات جو زمانہ قدم سے مورخین کی تحقیق وجستجو کا مرکز رہے ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی قوم میں کوئی دین موجود نہ تھا بلکہ ہر قوم کے افراد کسی عنوان سے علم وقدرت کے ایک مبداء ومنبع پر اعتقاد رکھتے اور اس کی پرستش کرتے تھے۔ اگر ہم مان لیں کہ اس میں استثنائی صورتیں بھی رہی ہیں بعض کچھ لوگ تھے جو ایسا اعتقاد نہیں رکھتے تھے تو بھی یہ بات واضح ہے کہ انسانوں کی اکثریت ایک مبداء علم وقدرت کی قائل تھی اور طول تاریخ میں کچھ لوگوں کا نہ ماننا ایک استثناء ہے (ہر کلیہ میں استثناء نادر تو ہوتا ہی ہے۔

مشہور مغربی مورخ ''ویل ڈورانٹ'' اپنی کتاب'' تاریخ تمدن'' میں دنیا میں بے دینی کے مواقع کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے...... ان تمام اُمور کے باوجود کہ جن کا تذکرہ کیا گیا ہے لا دینیت ایک نادر چیز رہی ہے اور یہ پرانا اعتقاد حقیقت کے عین مطابق ہے کہ دین وہ نظریہ ہے جو عام افراد بشر کے درمیان جاری وساری رہا ہے۔

ایک فلسفی شخص کے نزدیک یہ قضیہ بنیادی واساسی قضایا میں سے ہے وہ اس بات کو ہرگز قبول نہیں کرتا کہ ادیانِ عالم میں سبھی

تصورات لغو اور بے ہودہ ہیں بلکہ اس کی توجہ اس طرف ہوتی ہے کہ دین زمانہ قدیم سے تاریخ کے ساتھ ساتھ ہمیشہ موجود رہا ہے [۱]

ایک اور تعبیر ذیل میں مزید کہتا ہے: سوچنے کی بات ہے کہ وہ تقویٰ جسے انسانی قلب سے نکالا نہیں جا سکتا ہے، آخر اس کا منبع کہاں ہے؟ [۲]

پھر یہی مورخ اپنی کتاب ''درسہائے تاریخ'' میں ایسے الفاظ کے ساتھ کہ جن سے خفگی کا اظہار ہوتا ہے لکھتا ہے...... دین کی سو جان ہے، جب بھی اسے ذبح کیا جائے گا اور وہ دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔ [۳]

اگر خدا اور مذہب پر اعتقاد صرف عادت تقلید، تلقین اور تبلیغ ہی کی بناء پر ہوتا تو یہ کبھی اتنی عمومیت حاصل نہ کرتا پس طول تاریخ میں اس کا ہمیشہ موجود رہنا اس کے فطری ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

## (۲) آثار قدیمہ کے شواہد:

زمانہ قبل از تاریخ (فن تحریر کی ایجاد اور احوال انسان کی وضاحت سے پہلے) کی جو علامات اور آثار باقی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی مذہب کا تصور موجود تھا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ خدا، روز جزاء اور موت کے بعد کی دوامی زندگی پر بھی یقین رکھتے تھے اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ ایسی اشیاء کہ جن کا ان عقائد کے ساتھ تعلق ہوا نہیں میت کے ساتھ قبر میں رکھ دیتے تا کہ بعد از مرگ کی زندگی میں وہ ان سے استفادہ کر سکے۔ وہ انسان یا حیوان کے مردہ اجسام کو مخصوص طریقے سے خشک کر کے ان کی مومیائی کرتے تا کہ وہ خراب ہونے سے بچ سکیں اور اس کی زندہ مثال اہرام مصر کے مقابر ہیں جو مردگان کی بقاء کے آئینہ دار ہیں یہ سب کچھ وہ لوگ اس لیے کرتے تھے کہ انہیں مبداء ومعاد کا یقین تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے اعتقادات میں بہت سی خرافات بھی شامل تھیں۔ لیکن اس سے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے معتقد تھے اور اس سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

## (۳) ماہرین نفسیات کے مطالعات واکتشافات:

ماہرین نفسیات نے نفس انسانی کے مختلف پہلوؤں اور اس کے رجانات کا مطالعہ کر کے جو معلومات حاصل کیے ہیں وہ عقیدہ مذہبی کے فطری ہونے کی عمدہ دلیل ہیں۔

ماہرین نفسیات نے نفسِ انسانی کے لیے چار احساس چار میلان اور چار پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ۔

---

[۱] تاریخ تمدن (ویل ڈوارنٹ) جلد ا صفحہ ۸۷ تا ۸۹۔

[۲] کتاب فطرت (شہید مطہری) صفحہ ۱۵۳۔

[۳] کتاب فطرت (شہید مطہری) صفحہ ۱۵۳۔

(۱)حسِ دانائی (۲)حسِ زیبائی (۳)حسِ نیکی (۴)حسِ مذہبی اس بات کا زندثبوت ہیں [۱]

بعض ماہرین نے ان ابعاد کی تعداد پانچ قرار دی ہے۔(۱)مقولہ حقیقت جوئی ۲۔مقولہ نیک اخلاقی ۳۔مقولہ زیبائی ۴۔مقولہ ابداع واختراع۔۵مقولہ عشق و پرستش۔[۲]

(۱) حسِ دانائی۔یہ ایک قوی جاذبہ ہے جو انسان کو علوم وفنون کے حصول اور جہانِ ہستی کے اسرار ورموز کھولنے پر آمادہ کرتا ہے وہ اُمور جن کو انسانی زندگی میں داخل حاصل ہے یا نہیں...... یہ جاذبہ ان سب کو شامل ہے مثلاً ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ایک سال قبل اس دنیا کی حالت کیا تھی۔ یا ایک ارب سال بعد اس کی حالت کیا ہوگی یا وہ کرات جو ہماری زمین سے لاکھوں نوری سال کے فاصلے پر ہیں ان میں کیا کچھ ہوتا ہے قطع نظر اس سے کہ ان کا سمجھنا ہماری انفرادی یا اجتماعی میں کوئی اثر رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔اس حس کا وجود مختلف قسم کے علوم کی پیدائش کا سبب ہے۔

(۲) حسِ زیبائی: ہر شخص اپنے وجدان میں اس حس کا احساس کرتا ہے یہی حس انسان کو مختلف قسم کی ابداع واختراع کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور یہی ہر طرح کے فن اور ہنر کا سرچشمہ ہے۔

(۳) حسِ نیکی: حسن اخلاق، اصولوں کی پابندی، عدالت آزادی اور صدق وغیرہ ایسے اوصاف کے پیدا ہونے کا سبب ہے ممکن ہے بہت سے انسان ان اصولوں پر عمل پیرا نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ان باتوں کو پسند کرتے ہیں۔

(۴) حسِ مذہبی: یہ نفس انسانی کا بعد چہارم ہے جو انسان کو کمالِ مطلق کی طرف لے جاتا ہے اسے بعد قدسی و یزدانی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی انسان کو مذہب کی دعوت دیتا ہے اور بجز اس کے کہ کسی دلیل کا محتاج ہو یہ اس مبداء بزرگ (خدا) پر ایمان رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ایمان مذہبی خرافات کی آمیزش سے خالی نہ ہو۔یعنی اس میں بت پرستی اور ستارہ پرستی شامل ہوگئی ہو لیکن یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مبداء کا تصور موجود ہے۔

## (۴) مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کی ناکامی:

ہم جانتے ہیں گذشتہ چند صدیوں میں مذہب کے خلاف کس قدر پروپیگنڈا ہوا ہے۔خصوصاً مغرب میں جدید وسائل کی مدد سے کتنی شدت کے ساتھ مذہب کے خلاف مہم چلائی گئی اور وہ مخالف مذہب فضا تیار کی گئی کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔

جب یورپ میں علمی تحریک چلی اور اس نے ان لوگوں کو علم سے مالا مال کر دیا تو انہوں نے علمی وسیاسی معاشروں کو کلیسا کے اثر سے آزاد کرنے کے لیے مذہب کے خلاف بہت شدید پروپیگنڈا ہوا البتہ یہ پروپیگنڈا دراصل مسیحیت کے خلاف تھا کیونکہ یورپ میں یہی عمومی مذہب تھا۔اور اس طرح الحاد اور انکارِ خدا کا سلسلہ چل نکلا۔ چنانچہ فلاسفہ کے نفوذ اور علماء طبیعت کے اقوال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مذہب کے

---

[۱] مقالہ کو وبتائم ترجمہ (مہندس بیانی) کتاب ''حس مذہبی یا بعد چہارم نفسِ انسانی کا ملاحظہ کریں۔

[۲] لیکن ظاہراً مقولہ حقیقت اور مقولہ ابداع واختراع ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔

خلاف فضاء تیار کی گئی جس سے کلیسا بے رونق ہو گیا اور مسیحی علماء گوشہ عزلت میں بیٹھ گئے تب وجود خدا معجزہ اور کتب آسمانی پر اعتقاد کو بے کار کی باتیں قرار دیا جانے لگا حتیٰ کہ زمانے کی فرضی تقسیم کے تحت حیات بشر کو چار ادوار میں تقسیم کر دیا گیا اور اسے سبھی نے درست تسلیم کر لیا (یعنی دور افسانہ وتوہم دور مذہب۔ دور فلسفہ دورِ علم گو یا اس تقسیم کے مطابق اب مذہب کا دور ختم ہونے کو ہے۔

تعجب ہے کہ علم معاشرت کے خدو دکمال تک پہنچ جانے کے باوجود کتب میں اس بات کو ایک مسلمہ کے طور پر اختیار کیا گیا ہے کہ مذہب کسی نہ کسی طبعی عامل کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی اس کی اساس و بنیاد جہالت خوف احتیاج اور اقتصادی مسائل وغیرہ میں سے کسی ایک پر استوار ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مذہبی حکومت (کلیساء قرون وسطیٰ) سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں مسیحی علماء کا ظلم وستم ان کی سنگدلی اور عوام کے ساتھ نیز علماء طبیع وسائنس دانوں) کے ساتھ ان کی بدسلوکی کے علاوہ ان کی مصنوعی ذاتی تکریمات اور تعیّشات میں مست رہنا اور محروم طبقے کو بھولے رہنا یہ سب کچھ ان کی بدنامی اور غیر مقبولیت کا باعث بنا...... پھر ان کو اپنے اعمال کا کفارہ دینا پڑا تاہم اس سلسلے میں سب سے بری بات یہ ہوئی کہ پوپ اور کلیسا کی چیرہ دستیوں کے ردعمل کے طور پر جو تحریک چلی اس میں عیسائیت کی بجائے نفس مذہب کے خلاف پروپیگنڈا ہونے لگا اور اس کی روز دنیا کے ہر مذہب پر پڑتی تھی۔

اسی اثناء میں کیمونسٹ بھی مذہب کو مٹانے کے لیے اپنی پوری قوت کے ساتھ میدان میں آ گئے انہوں نے اپنے تمام رسائل اور فلاسفہ کے افکار اس کام کے لیے وقف کر دیئے...... اس طرح انہوں نے اپنی تمام قوتیں، صلاحتیں اور قابلیتیں اس پر صرف کر دیں کہ مذہب معاشرہ کے لیے ''افیون'' ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ مذہب کے خلاف اتنی قوتیں صرف کرنے کے باوجود مذہب کو انسانوں کے دل کی گہرائیوں سے نکالا نہیں جا سکا۔ اور مذہبی جذبے کو ختم نہیں کیا جا سکا بلکہ اب تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ مذہبی احساسات بہت بڑھ گئے ہیں حتیٰ کہ کیمونسٹ ممالک میں بھی مذہب کے لیے وسعت قلب پیدا ہو چکی ہے۔ اور وہاں ایسی تحریکیں جنم لے چکی ہیں جو مذہب اور خصوصاً اسلام کی ترقی میں کوشاں ہیں۔

یہ حالات اس چیز کی بخوبی نشان دہی کر رہے ہیں کہ مذہب انسانوں کی فطرت کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے، اس بناء پر وہ اس قابل ہے کہ ایسے ناموافق حالات میں بھی اپنی حفاظت کرے اور باقی رہے جب کہ اس کے خلاف کئی طرفوں سے معاندانہ پروپیگنڈے ہو رہے ہوں...... پس اگر مذہب فطری وجبلی داعیہ نہ ہوتا تو کبھی کا مٹ چکا ہوتا۔

## ۵۔ شدید زندگی میں شخصی تجربے:

بہت سے لوگوں نے اس حقیقت کو آزما لیا ہے کہ جب مشکلات انسان کو گھیر لیتی ہیں، ہر طرف سے سختیوں کے طوفان ہجوم کر رہے ہوتے ہیں انسان گرداب میں گرفتار اور ہر طرف سے ناامید ہو جاتا ہے۔ ظاہری اسباب ناپید ہو جاتے ہیں۔ اب انساں جاں بلب ہوتا ہے (چھری) اس کی گردن تک پہنچی ہوتی ہے، تو ان خطرناک لمحات میں ''فطرت'' جوش مارتی ہے، انسان ''خلوص'' کے ساتھ ایسے مبداء کی طرف

توجہ کرتا ہے جو اس کی تمام مشکلات حل کر سکتا ہے...... انسان کا دل اس ذات کی طرف رجوع کرا اور اس سے طلب نصرت کرتا ہے۔

یہاں تک کہ جن لوگوں کو مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا وہ بھی اس صورتِ حال سے مستثنیٰ نہیں ہیں...... وہ بھی سختیوں، تکلیفوں اور بیماریوں میں اسی مبداء اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس حقیقت کے واضح شواہد ہیں، جس کا تذکرہ قرآن مجید نے گذشتہ آیات میں کیا ہے۔ کہ خدا شناسی ایک فطری امر ہے اور حس مذہبی خود انسان کے اندر موجود ہے۔

...... ہاں...... انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک لطیف آواز اور پُر محبت صدا سنتا ہے جو اسے ایک سب سے بڑی حقیقت، عالم وقادر مبداء کی طرف بلا رہی ہوتی ہے۔ جس کا نام ہے ''اللہ'' یا ''خدا'' ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ اسے کسی اور نام سے تعبیر کریں لیکن یہاں نام کے بارے میں گفتگو نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر ایمان کی بات ہو رہی ہے۔

بہت سے نکتہ سنج شاعروں نے بھی اپنے فصیح اور شیریں شعروں میں اس ''حقیقت'' کا ذکر کیا ہے۔

شورش عشق تو در ہیچ سرنیست کہ نیست
منظر روی تو زیب نظری نیست کہ نیست
نہ ہمیں از غم تو سینۂ ماصد چاک است
داغ تو لالہ صفت ، برجگری نیست کہ نیست

ایک اور شاعر یوں کہتا ہے:

دراندرون من خستہ دل ندانم کیست
کہ من خموشم واودرفغاں درغوغا است

## ۶۔ فطرت مذہبی پر دانشوروں کی گواہی:

معرفت خدا کا فطری ہونا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو فقط قرآن مجید اور اسلامی روایات میں ہی مذکور ہے بلکہ مفکرین، دانشور اور غیر مُسلم فلاسفہ و شعراء کے کلام میں بھی اس کا بہت زیادہ تذکرہ ہے، بطور نمونہ چند ایک دانشوروں کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں۔

o۔ آئن سٹائن اپنے ایک بیان میں کہتا ہے:

بلا استثناء ایک عقیدہ و مذہب تمام انسانوں کے باطن میں موجود ہے، میں اس کا نام ''احساس مذہبی آفرینش'' قرار دیتا ہوں...... اس مذہب میں انسان خواہشوں کو کم کرتا ہے ہے۔ انسانی عظمت وجلال کا مشاہدہ کرتا ہے جو ظاہری خلقت کے باطن میں وجود رکھتے ہیں وہ اپنے وجود کو ایک طرح کا قید خانہ سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس پنجرے سے نکل جائے اور اس کائنات کو ایک حقیقت واحدہ کی طرح دیکھ لے [1]

o۔ معروف دانش ور ''پاسکل'' کہتا ہے:

---

[1] دنیاء کہ می بینم (خلاصہ) صفحہ ۵۳۔

دل کے پاس ایسے دلائل ہوتے ہیں جو عقل کی دسترس میں نہیں ہوتے [۱]

o- ولیم جیمز کہتا ہے۔

o- میں بخوبی جانتا ہوں کہ مذہبی زندگی کا سرچشمہ ''دل'' ہے میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ترتیب وترکیب ہائے فلسفہ ایک ترجمہ کی مانند ہیں جن کا اصلی متن کسی اور زبان میں ہے۔[۲]

o- میکس مولر کہتا ہے:

ہمارے بڑے خدا کے حضور اس وقت سے جھکتے رہے ہیں۔ جب وہ اسے اس کے نام (خدا) سے پکار بھی نہ سکتے تھے۔[۳]

o- یہی دانش ور ایک اور جگہ اپنے عقیدے کا اظہار کرتا ہے:

مشہور نظریہ تو یہ ہے کہ ''دین'' ابتداء طبعی موجودات اور بت پرستی سے شروع ہوا اور پھر وجود خدا کا عقیدہ پیدا ہوا (لیکن نہیں) زمانہ قدیم کے حالات وواقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائے ازلی کی پرستش اور عبادت پرانے سے پرانے وقتوں میں بھی ہوتی تھی۔[۴]

o- مشہور مورخ پلوتارک کہتا ہے:

اس دنیا پر نظر ڈالی جائے تو بہت سے ایسے مقامات ملیں گے جہاں آبادی علم، صنعت، سیاست اور کوئی حکومت نہیں ہے لیکن پوری کوشش کے باوجود ہم کوئی ایسی جگہ نہیں پاسکتے جہاں ''خدا'' موجود نہ ہو۔[۵]

o- سموئیل کینگ کہتا ہے:

تمام انسانی معاشروں میں مذہب موجود رہا ہے اگر چہ مورخوں سیاحوں اور عیسائی مبلغوں نے ایسی قوموں کا ذکر کیا ہے جن میں مذہب موجود نہیں تھا، لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ان کا یہ کہنا درست نہیں تھا، دراصل ان کا یہ موقف اس عنوان سے تھا کہ ان قوموں کا مذہب ان لوگوں کے مذہب کے مطابق نہیں تھا (وگرنہ اصل میں مذہب کا وجود پایا جاتا تھا)[۶]۔

ہم اس بحث کو معروف مورخ ''ویل ڈوارنٹ'' کے کلام سے اختتام تک پہنچاتے ہیں جیسا کہ اس نے کہا ہے:

اگر ہم یہ تصور نہ کریں کہ مذاہب کی بنیادیں زمانہ قبل از تاریخ میں موجود تھیں تو پھر ہم طویل تاریخ میں ان کی موجودگی کو بھی

---

[۱] سیر حکمت در اروپا، جلد ۲ صفحہ ۱۴۔

[۲] سیر حکمت در اروپا، جلد ۲ صفحہ ۳۲۱۔

[۳] مقدمہ نیائش صفحہ ۳۱۔

[۴] کتاب فطرت (شہید مطہری) صفحہ ۱۴۸۔

[۵] مقدمہ نیائش صفحہ ۳۱۔

[۶] جامعہ شناسی (سموئیل کینگ، صفحہ ۱۹۱۔

نہیں جان سکتے [۱]

## (۴) اسلامی روایات میں فطرت کا ذکر

بطورِ خاص توحید پرستی اور عمومی طور پر دین ومذہب کا تذکرہ اسلامی روایات میں موجود ہے اگر چہ روایات کے الفاظ وعبارات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

بعض روایات میں توحید ویکتا پرستی کو امر فطری قرار دیا گیا ہے۔ جیسے امام جعفر صادقؑ کے معروف اصحاب میں سے علاء بن فضیل نے آنجناب سے آیہ شریفہ "فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا، کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے فرمایا، یہاں فطرت سے مراد توحید ہے [۲]

چند دیگر روایات میں معرفتِ خدا کو امر فطری کہا گیا ہے مثلاً زرارہ کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی ...... ھی الفطرت التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ۔ امام نے فرمایا: فطرت ھم اللہ علی المعرفۃِ۔ یعنی اس میں وہ فطرت مراد ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے خدا نے ان کی سرشت کو اپنی معرفت وشناخت پر قرار دیا ہے۔ [۳]

یہی مطلب ومفہوم چند دیگر روایات میں آیا ہے۔ [۴]

بعض روایات میں "تمام اصول اسلام" کو ایک فطری امر کہا گیا ہے جیسا کہ ہم پیغمبر اکرمؐ سے مروی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

کل مولودٍ یولد علی الفطرۃِ حتیّٰ یکون ابواہُما الّذانِ یھودانہ وینصّرانہ۔ [۵]

ہر نوزاد بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کے ماں باپ اسے یہودیت اور نصرانیت کی طرف لے جاتے ہیں یہ روایت بہت سی شیعہ وسنی کتب میں موجود ہے اور بڑی مشہور ہے، یہی مضمون ومطلب ان روایات میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جن میں توحید، نبوت، اور ولایتِ علیؑ کا تذکرہ ہوا ہے [۶]

ایک روایت میں ہے کہ ابوبصیر نے امام محمد باقرؑ سے آیہ زیر بحث کی تفسیر دریافت کی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ یہاں فطرت سے مراد ولایت" ہے [۷]

---

[۱] تاریخ تمدن (ویل ڈورانٹ) جلد ۱ صفحہ ۸۸۔

[۲] بحار الانوار جلد ۳ کتاب التوحید صفحہ ۲۷۷ حدیث۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۸۔ ۱۰۔

[۳] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۷۹ حدیث ۱۱۔

[۴] بحار النوار جلد ۳ صفحہ ۲۷۹ حدیث ۱۲۔ ۱۳۔

[۵] غوالی اللئالی بحوالہ بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۸۱ حدیث ۲۲۔

[۶] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۸۰۔ حدیث ۳۔ ۹۔ ۱۸۔ حدیث ۲۔

[۷] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۷۷ حدیث ۲۔

واضح رہے کہ ان تمام تفسیروں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔حقیقت میں تمام اصول اسلام بطور خلاصہ انسانی سرشت میں رکھ دیئے گئے ہیں کہ بعض روایات میں سب کی طرف اور بعض میں ایک حصے کا اشارہ ہوا ہے۔پھر فطرت توحید بقیہ اصول اعتقادی سے الگ نہیں ہوسکتی کیونکہ خداوند حکیم نے انسانوں کو عبث پیدا نہیں کیا اور یہ مسلمہ امر ہے کہ ان کے تکامل کے لیے طریقہ عمل اور فرائض وتکالیف مقرر فرمائے ہیں جو انبیاء کے توسط سے ان تک پہنچائے گئے ہیں۔ہاں تو نبی ورسول کے بعد دستور الٰہی حفاظت کرنا جانشین رسول کے ذمہ ہے۔جو ولایت وحکومت الٰہی کے قیام کے ذریعے ممکن ہوگی۔اور اس کے نتائج ساری دنیا وجہاں میں نمایاں ہوں گے مختصر یہ کہ توحید اور آئین اسلام کے فطری ہونے کی بابت بہت سی روایات آئی ہیں۔اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ فرمائیں:

(۱) تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۶ ومابعد۔

(۲) مرآۃ العقول جلد ۷ صفحہ ۵۴ ومابعد۔

(۳) تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۱۸۱۔

(۴) تفسیر درمنثور جلد ۳ صفحہ ۱۴۲ ومابعد۔

(۵) بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۱۶ ومابعد۔

# ذاتِ خدا کی یکتائی
# معرفتِ خدا میں اہم ترین اصل

## اِشارہ:

گزشتہ بحثوں میں اثبات وجودِ خدا کے مختلف طرائق پر گفتگو کی گئی اور پانچ عمدہ عقلی دلیلیں بیان کی گئیں نیز معرفت توحید کے فطری راستے کا تذکرہ بھی ہوا۔ اصل وجود پر ایمان کے بعد اب معرفتِ خدا کا مسئلہ زیر بحث ہے اور اس میں سب سے اہم مسئلہ خدا کی توحید و یکتائی ہے۔

(۱) ایک لحاظ سے یہ بحث تمام صفات الٰہی کا سرچشمہ ہے۔

(۲) دوسرے پہلو سے یہ مسئلہ تمام آسمانی مذاہب کی بنیاد اور قرآن کا مرکزی نقطہ ہے، قرآن کی اکثر ابحاث اسی محور (مسئلہ توحید) سے تعلق رکھتی ہیں حتیٰ کہ بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ قرآن نے اصل وجود خدا پر بحث کی ہی نہیں بلکہ اس کی ساری گفتگو توحید الٰہی کے بارے میں ہے، تاہم یہ قول مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔

(۳) تمام اسلامی عقائد، احکام وقوانین اور اجتماعی، اخلاقی وعبادی مسائل اسی اصل (توحید) کی طرف پلٹ آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم مسئلہ توحید وشرک کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور وہ تمام وکمال اسی مسئلہ کی طرف متوجہ ہے، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن میں کوئی اور موضوع مسئلہ توحید جتنی توجہ حاصل نہیں کرسکا۔ نہ صرف پیغمبر اکرم بلکہ تمام انبیاء وُ رسل توحید کی تبلیغ ودعوت میں مصروف رہے، اور شرک کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

اس اشارے کے بعد ہم قرآن مجید میں گناہ شرک کی اہمیت واضح کرتے ہیں، پھر کچھ قرآنی دلائل کا ذکر کریں گے، جن کا ''اثباتِ توحید اور بطلانِ شرک سے تعلق ہے......سب سے پہلے ہم آیات ذیل پر متوجہ ہوتے ہیں۔

(۱) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ [۴:۴۸] (نساء)

(۲) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ [۴:۱۱۶] (نسأ)

(۳) وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ

وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾ [۳۹:۶۵]
(۴) وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ
عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ [۳۱:۱۳]
(۵) حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ
فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾ [۲۲:۳۱]
(۶) قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا
(انعام۔۱۵۱)
(۷) اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا
لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ [۵:۷۲]
(۸) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ
بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ [۹:۲۸]
(۹) وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ (توبہ۔۳)
(۱۰) اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ
مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ [۲۴:۳] (نور۔۳)
(۱۱) قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾
[۱۳:۳۶] (رعد۔۳۶)
(۱۲) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ۫ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ [۱۱:۲۵] اَنْ لَّا

تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲﴾ [1] ۶ [۱۱:۲۶]

(۱۳) قُلۡ اِنَّمَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـهُکُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾

[۲۱:۱۰۸]

(۱۴) قَدۡ کَانَتۡ لَکُمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا
لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡکُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۫ کَفَرۡنَا بِکُمۡ وَبَدَا
بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ [۶۰:۴]

## ترجمہ

(۱) خداوندقدوس (گناہ) شرک کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ اس کے علاوہ جو مناسب سمجھے بخش دے جو کسی کو اللہ کا شریک بنائے وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا؟

(۲) خدا شرک (کا گناہ) کبھی معاف نہیں کرتا لیکن اس کے علاوہ جو چاہے بخش دے، جو خدا کے لیے کسی شریک کا قائل ہوا وہ گمراہی میں دور تک چلا گیا۔

(۳) تمہاری طرف اور تمام انبیاء جو تم سے پہلے تھے ان کی طرف ہم نے وحی کر دی کہ اگر شرک اختیار کیا تو تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

(۴) یاد کرو (وہ وقت) جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا...... بیٹے! کسی کو خدا کا شریک نہ قرار دو کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

(۵) جس نے شرک اختیار کیا گویا آسمان سے گر پڑا اور (وسط میں) پرندوں نے اسے اچک لیا یا آندھی نے اُسے کہیں دور دراز جا پھینکا۔

---

[1] یہ مضمون دیگر آیاتِ قرآنی میں بھی آیا ہے۔ جیسے سورۂ ہود آیت ۲۔ سورہ یوسف آیت ۴۰، سورۂ اسراء آیت ۲۳، سورۂ یٰسٓ آیت ۶۰ سورۂ حٰمٓ سجدہٗ آیت ۱۴۔ علاوہ ازیں اہمیت توحید اور مذمت شرک میں مختلف صورتوں اور مختلف الفاظ میں اس قدر آیات میں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے تو ایک بڑی کتاب مرتب ہو جائے جو آیات ہم نے اوپر نقل کی ہیں وہ ان میں اہم ہیں اور بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں۔

(٦) کہو کہ آؤ میں تمہیں وہ پڑھ کر سناؤں جو چیز خدا نے تمہارے لیے حرام کردی ہے...... یہ کہ خدا کا کوئی شریک قرار نہ دو۔

(٧) جس نے کسی کو خدا کا شریک ٹھہرایا تو خدا نے جنت اس کے لیے حرام کردی اور اس کا ٹھکانہ جہنم میں ہے۔

(٨) اے ایمان لانے والو کبھی مشرک نہ بنو کہ مشرک نجس ہوتے ہیں اور اس سال کے بعد وہ کبھی مسجدالحرام کے قریب نہ آئیں۔

(٩) خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تمام لوگوں کے لیے حج کے دِن یہ اعلان ہے کہ خدا اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں۔

(١٠) زانی نکاح نہ کرے، مگر زانیہ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک کے ساتھ۔

(١١) کہو...... میں مامور ہوں کہ خدا کی عبادت کروں اور مشرک نہ بنوں، اسی خدا کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

(١٢) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (تو اس نے ان سے کہا) میں تمہارے لیے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں (میری دعوت یہ ہے) کہ خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو میں تم پر دردناک عذاب آنے کے عدن کا خوف رکھتا ہوں۔

(١٣) کہو...... مجھے تو صرف یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا معبود خدائے واحد ہے، کیا اس صورت میں تم حق کے سامنے سرتسلیم خم کروگے (یعنی بتوں سے کنارہ کشی اختیار کرلوگے)

(١٤) تم لوگوں کے لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں ایک اچھا نمونہ ہے، جیسا کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا...... ہم بیزار ہیں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اور تمہارے نزدیک ہم انکار کرنے والے ہیں، ہمارے تمہارے درمیان مستقل عداوت اور دشمنی رہے، تاوقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ اور شرک کو اپنے دلوں سے نکال نہ دو۔

## مفردات کی تشریح:

’’شرک‘‘ مقاییس اللغۃ میں ’’شرک‘‘ کے دو معنی بیان ہوئے ہیں۔ معنی اوّل مقارنت اور شرکت ہے جس کا نقطہ مقابل ’’انفراد‘‘ ہے...... معنی دوم ہے طویل و مستقیم ، البتہ اس لفظ کے مشتقات میں پہلا معنی معروف ہے۔ لیکن دوسرا معنی بھی حاصل الفاظ رکھتا ہے۔ مثلاً ’’شراک‘‘ (جوتے کا تسمہ) اور ’’شرک‘‘ بروزن ’’نمک‘‘ جس کے معنی وہ چھوٹے چھوٹے سیدھے راستے ہیں جو اصل راستہ سے پھوٹتے ہیں یا اس کا معنی سیدھے راستے کا درمیانی حصہ ہے نیز یہی لفظ ’’شرک‘‘ شکاری کے جال کا معنی بھی دیتا ہے۔

بعض ارباب لغت کا اصرار کرنے کی کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے [1]

قرآن مجید میں لفظ ’’شرک‘‘ عام طور پر خدا کی ذات وصفات، خلقت و تدبیر یا عبودیت و اعبادت میں شریک قرار دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، ...... پہلا معنی شرک عظیم یعنی کسی کو خدا کا شریک قرار دیا جائے، دوسرا معنی شرک صغیر کہ اپنے کاموں میں غیر خدا کی طرف بھی نظر رکھے جس کو ریاء اور نفاق بھی کہا جاتا ہے [2]۔

’’واحد‘‘ کا مادہ ’’وحدت‘‘ ہے...... مفردات میں راغب نے کہا ہے: اس کا معنی دراصل ایک ایسی چیز ہے جس کا کوئی جز نہ ہو، پھر اس میں وسعت پیدا کی گئی اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہونے لگا جس میں کسی قسم کی یکتائی پائی جاتی ہو۔ پھر اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لفظ ’’واحد‘‘ ’’مشترک‘‘ ہے اور یہ چھ معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱)......واحد نوعی یا جنسی، جیسے انسان اور گھوڑا حیوان ہونے کے لحاظ سے ایک سے ہیں یا زید و عُمر انسان ہونے کے ناطے ایک ہیں۔

(۲) واحد اتصالی۔ جیسے ایک انسان یا ایک درخت۔

(۳) واحد...... یعنی بے نظیر و بے مثال

(۴) واحد...... جو قابل تجزیہ و تقسیم نہیں

(۵) واحد عددی...... جیسے ہم کہتے ہیں...... واحد اثنان، ثلاثۃ (ایک۔ دو۔ تین)

(۶) واحد...... کہ جو خط کا مبداء سے جیسے ہم کہتے ہیں نقطہ واحد اور جب یہ لفظ خدا کے وصف میں جائے تو اس کا مفہوم ی ہے کہ اس کے لیے جزء یا کثرت اور شمارہ عددی نہیں ہے۔

---

[1] کتاب ’’التحقیق فی کلمات القرآن‘‘ کی طرف رجوع فرمائیں...... یہ صحیح ہے کہ کلمات مشترک بعض اوقات ایک مادہ کی طرف پلٹتے ہیں لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ دو گروہ ایک لفظ کے دو مختلف معانی لیتے ہیں جب کہ وہ ایک دوسرے کے مطلب سے بے خبر ہوتے ہیں۔

[2] مفرداتِ راغب مادہ شرک، لسان العرب، التحقیق فی کلمات القرآن، مقاییس اللغۃ جرہ وغیرہ۔

''احد'' بھی اسی بنیاد و اساس سے ہے اور ''واحد'' کے معنی میں ہے، بعض کے نزدیک دونوں کا معنی ایک ہے بعض کا خیال ہے کہ دونوں میں فرق ہے احد اس ذات کو کہتے ہیں جو خارج اور ذہن میں کثرت اور تعداد کو قبول نہ کرے۔ اسی لیے یہ اعداد و تعداد میں داخل نہیں یہ خلافت واحد کہ جس کے ساتھ خارج یا ذہن میں ثانی و ثالث (دوم، سوم) ہوتا ہے...... اب اگر ہم کہیں ''احد'' نہیں آیا تو اس کا مطلب ہوگا کوئی بھی نہیں آیا اور اگر کہیں کہ واحد نہیں آیا تو ممکن ہے دو یا چند آدمی آئے ہوں [1]

بعض نے یہ احتمال دیا کہ ''احد'' مرکب کے مقابل اور ''واحد'' متعدد کے مقابل ہوتا ہے لیکن قرآن مجید میں ان دونوں الفاظ کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا معنی و مفہوم ایک ہی ہے، خدا کی دی ہوئی توفیق سے ہم آئندہ صفحات میں اس کی تشریح کریں گے۔

# جمع آوری آیات اور تفسیر

## گناہِ نا قابل بخشش

(۱)...... مورد بحث آیات میں سے پہلی آیت یہ اعلان کر رہی ہے کہ شرک وہ گناہ ہے جو بخشا نہ جائے گا...... جیسا کہ فرمایا: خدا گناہ شرک کو ہرگز نہ بخشے گا لیکن اس کے علاوہ جو کچھ چاہے بخش دے گا (ان اللّٰہ لا یغفر ان یشرك بہ ویغفرُ مادون ذٰلك لمن یشاء)

اس گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمام گناہان کبیرہ، ظلم و ستم اور بدیوں ورزشتیوں کو ایک طرف اور شرک کو دوسری طرف رکھیں تو شرک ان سب سے بڑا اور بھاری گناہ ثابت ہوگا۔ اس لیے تاکید یا دلیل کے عنوان سے ارشاد ہوا جو خدا کے لیے شریک کا قائل ہوا وہ گناہِ عظیم کا مرتکب ہوا ہے۔ (ومن یشرك باللّٰہ فقد افتریٰ اثماً عظیماً)

بعض مفسرین (آیات مابعد کے قرینہ سے) یہ خیال کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ کفار کو اپنا ساتھی بنانے کے لیے ان کے بتوں کی عزت و پاکیزگی کو تسلیم کرتے اور پھر خود کو اصلی نجات یافتہ بھی سمجھتے تھے بہر حال اگر اس کا شان نزول یہی ہو تو بھی اس آیت کا مفہوم محدود نہیں ہوگا۔

بعض یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ آیت مشرکین کے ایک گروہ (جیسے وحشی قاتل حمزہ اور اس کے ساتھیوں) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو ایک مدت کے بعد اپنے کیے پر پشیمان ہوئے تو حضور اکرمؐ کی طرف ایک عریضے میں لکھا: ہم اپنے فعل پر نادم ہیں لیکن ہم نے آپ سے سنا ہے کہ کچھ لوگ از قبیل مشرک قاتل نفس اور منافی، عفت عمل کرنے والے عفو و بخشش کے قابل نہیں...... چونکہ ہم ان جرائم کے مرتکب ہو چکے ہیں لہٰذا آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتے، اس وقت یہ آیت (الا من تاب واٰمن وعمل صالحاً...) نازل ہوئی یعنی مگر جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل انجام دے۔

پیغمبر اکرمؐ نے یہ آیت وحشی اور اس کے دوستوں کو لکھ بھیجی وہ کہنے لگے کہ معاملہ اب بھی سخت ہے اور ممکن ہے کہ ہم نیت عمل انجام نہ

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۲۰ صفحہ ۵۴۳

دے سکیں.....تب مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی کہ خدا گناہ شرک کو ہرگز نہیں بخشے گا۔اس کے علاوہ (بہ تقاضائے مصلحت) تمام گناہ بخشے جا سکتے ہیں۔اس پر بھی انہوں نے بہانے بنائے اور کہا: ہوسکتا ہے کہ ہمیں مرضی خدا نہ ہو۔اس کے جواب میں آیت (یا عبادی الذین اسرفو علی انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله، ان الله يغفر الذنوب جميعاً۔ نازل ہوئی اور رسول کریمؐ نے یہ ان کی طرف بھیج دی، ان سب نے یہ آیت پڑھی اور پھر اسلام قبول کرلیا[1]

بہر حال جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ قرآن مجید کی تمام آیات میں ایک امید بخش آیت ہے کیونکہ یہ کہتی ہے اگر ایک باایمان انسان دُنیا سے جائے تو اسے خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور اگر وہ بے ایمان اور مشرک ہو تو اس کی نجات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

(۲) دوسری آیت کا مضمون بھی پہلی آیت جیسا ہے لیکن تھوڑا سا فرق ہے یعنی "جو خدا کے ساتھ کسی شریک کا قائل ہوا اور وہ گمراہی میں بہت دُور تک چلا گیا (ومن يشرك بالله فقد ضل ضلالا بعيداً) اس سے پہلی آیت میں اثم عظیم (کا ذکر تھا اور یہاں دور کی گمراہی کی بات ہو رہی ہے یہ دونوں باتیں ایک دوسری کے ساتھ لازم وملزوم ہیں یعنی گناہ جتنا بڑا ہوگا اتنا ہی خدا سے دُور کرے گا اور گمراہی اس قدر گہری ہو جائے گی پہلی آیت میں شرک کا علمی واعتقادی پہلو مدنظر تھا اور دوسری آیت میں اس کے علمی آثار پیش نظر ہیں مسلم ہے کہ یہ آثار اسی بنیاد سے حاصل ہوں گے۔

(۳) تیسری آیت میں شرک یعنی توحید سے انحراف کے بارے میں دوٹوک حکم دیا ہے جس میں خود نبی اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا: صرف تمہاری طرف وحی نہیں کی بلکہ تمام انبیاء گذشتہ کی طرف بھی ہم نے وحی بھیجی کہ اگر شرک کرو گے تو تمہارے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے اور نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ولقد أُوحي اليك والى الذين من قبلك لئن اشركت ليحبطن عملك ولتكونن من الخاسرين)۔

یہ یقینی بات ہے کہ نہ پیغمبر اکرمؐ اور نہ دیگر انبیاءؑ میں سے کسی نے اس لیے شرک نہیں کیا کہ وہ درجہ عصمت پر فائز تھے لیکن اس بات کی اہمیت ظاہر کرنے اور دوسرے لوگوں کو اپنا حساب کرنے اور اپنے مقام پر غور کرنے کے لیے آمادہ وتیار کرنے کی خاطر یہ قطعی انداز بیان اختیار کیا اور شرک کے خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے۔

اس آیت کے مطابق اگر انسان ساری زندگی خدا کی عبادت وبندگی اور اعمال صالحہ کرتا رہے لیکن اگر وہ آخری لمحے میں مشرک ہو جائے اور اسی حال میں چل بسے تو اس کے وہ تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔یعنی شرک ایک ایسی آگ اور جلانے والی بجلی ہے کہ آنِ واحد میں زندگی کا ماحصل جل کر خاکستر ہو جائے گا جیسا کہ سورۂ ابرہیمؑ کی آیت ۱۸ میں ہے: ایسی تند وتیز ہوا کہ طرح ہے جو خاکستر کو اڑا کر لے جائے گی۔اور ہر چیز کو برباد کردے گی۔

لَيَحْبَطَنَّ۔کا مادہ "حبط" بروزن "ربط" ہے جس کی بنیاد "حبط" بروزن هدف ہے اور اس کا معنی ہے حیوان، اس قدر گھاس کھائے

---

[1] البیان جلد ۳ صفحہ ۵۶۔

کہ ہوا پیدا ہو جائے اور وہ بیمار ہو کر مر جائے پھر اسے ایسے اعمال کے لیے استعمال کیا گیا جو بظاہر زیادہ ہوں۔ لیکن بہ باطن خراب ہوں اور مکمل طور پر نامقبول اور بے فائدہ قرار پائیں [1]

یہی معنی و مطلب ''لسان العرب'' و ''مصباح اللغۃ'' میں بھی آیا ہے۔ لیکن ''لسان العرب'' میں ''احباط'' کا ایک معنی کنوئیں کے پانی کا خشک ہو جانا اور پھر اس کا نہ پھوٹنا ہے۔ ''مقاییس اللغۃ'' میں اس کا اصل معنی ''بطلان'' اور ''درد'' لیا گیا ہے نیز زخم کے بھر جانے کے بعد چہرے پر جو نشان رہ جاتا ہے اس کو بھی حبط'' کہا گیا ہے۔

حبط اعمال کی حقیقت اور یہ کہ وہ کس طرح ہوتا ہے یہاں ان کے بارے میں بحث کرنے کا موقع و محل نہیں ہے۔

## سب سے بڑا ظلم:

(۴) چوتھی آیت میں لقمان کی زبان سے شرک کی ایک بلا دینے والی تعبیر ذکر کی گئی ہے وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: بیٹے کسی چیز یا کسی شخص کو خدا کا شریک نہ بناؤ کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے: (واذا قال لقمان لابنہٖ وھو یعظہ یا بنی لاتشرک باللّٰہ ط ان الشرک لظلم عظیم)

اگر چہ بناء بر مشہور لقمان پیغمبر نہیں تھے، لیکن دانا و حکیم ایسے تھے کہ قرآن نے ان کے علم و حکمت کی گواہی دی ہے اور ان کی باتوں کو اپنے فرمان کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔ انہی صاحب علم و حکمت بزرگ نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنے بیٹے کو قیمتی نصیحتیں کی ہیں ظاہر ہے کہ یہ نصیحتیں ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور قابل عمل ہوں گی۔

حضرت لقمان کی دس نصیحتیں جو قرآن میں مذکور ہیں، ان میں پہلی یہ ہے کہ بیٹا! شرک سے بچو۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود سازی، اصلاح ذاتی و اجتماعی اور اخلاقی بنیاد شرک کا مقابلہ کرنا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں طہارت و پاکیزگی کا ذریعہ ہے...... خدا نے چاہا تو ''توضیحات'' میں شرک کے بارے میں مزید تشریح کی جائے گی۔

ہوسکتا ہے کہ لقمان کا بیٹا مشرک ہوا اور وہ اسے روک رہے ہوں۔ لیکن بزرگ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ نصیحت درحقیقت خبردار کرنے کے لیے ہے کہ اس کی اہمیت ظاہر ہو اور ان کا بیٹا اس سے دور رہنے کی کوشش کرے۔

ظلم عظیم تعبیر بڑی پر معنی ہے، اصولی طور پر ''ظلم'' کے معنی ہر طرح کا انحراف اور کسی چیز کو غیر مناسب جگہ پر رکھنا ہے...... سب ظلموں سے بڑا ظلم کہ جو خدا و خلق اور خود اپنے بارے میں ہے وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ہے اس سے بڑا انحراف اور ظلم کیا ہوگا کہ ایک بے قدر و قیمت چیز کو زمین و آسمان اور تمام موجودات کے خالق و مالک کا ثانی و شریک قرار دیا جاتا ہے، خلق خدا کے ساتھ اس سے بڑھ کر اور کیا ستم ہوگا کہ انہیں توحید کے نورانی راستے سے ہٹا کر شرک کی تاریکیوں میں دھکیل دیا جائے نیز خود اپنی ذات پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ انسان ایک ایسی آگ جلائے جس میں اس کے نیک اعمال جل کر راکھ ہو جائیں؟

---

[1] مفردات راغب (مادہ حبط)

## خوفناک سقوط:

(۵) پانچویں آیت میں تمام مسلمانوں کو یہ حکم دینے کے بعد کہ وہ خالصا توحید پرست رہیں۔اور شرک کی راہ نہ چلیں۔ایک عمدہ تشبیہ دیتے ہوئے کہا ہے: جس نے خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا گویا وہ آسمان سے گرا دیا درمیان سے پرندوں نے اس کو اچک لیا(ومن یشرك بالله فکانما خر من السمآءِ فتخطفه الطیرُ) یا ایسے کہ آندھی اس کو کہیں دور جا پھینکے۔(او تھوی به الریح فی مکانٍ سعیق[۱]

درحقیقت ''ایمان'' کو بلند آسمان اور ''شرک'' کو ''خوف ناک سقوط'' سے مشابہت دی گئی ہے (توجہ رہے کہ ارباب لغت کے نزدیک حر کے معنی اس طرح گرنا ہے جس میں کوئی آواز اور آہٹ نہ ہو) پھر یہ سقوط (گرنا) معمولی چیز نہیں بلکہ اس میں دو بڑے خطرے بھی ہیں...... یا تو شکاری پرندوں کا لقمہ بنے گا یا آندھی اس کو آبادی سے دور پھینک دے گی۔جہاں چکنا چور ہوجائے گا۔

یہ دل ہلا دینے والی تعبیریں واضح کررہی ہیں کہ شرک میں کس قدر خطرات ہیں۔

یہ شکاری پرندے اصل میں اندرونی بری صفات یا بیرونی باطل پرست گروہ ہیں جو جاوہ توحید پر گھات لگائے رہتے ہیں اور تندو تیز ہوا(آندھی) وہی گمراہ شیاطین ہیں جن کا ذکر سورۂ مریمؑ کی آیت ۸۳ میں ہے (الم تر انا ارسلنا الشیاطین علی الکافرین توزھم (زاً) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیج دیا تاکہ وہ ان کو حرکت دیں اور ہلائیں، مشرکوں کے تعاقب میں جائیں ان کی گردنوں میں رسیاں ڈالیں اور جدھر چاہیں کھینچ لے جائیں یا یہ سخت فسادات اور سیاسی وفکری اختلافات اور فتنے ہیں کہ ان میں خالص موحدین کے بغیر کوئی ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔

(۶) چھٹی آیت میں حضرت رسولؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کے محرمات (حرام امور) سے آگاہ کریں کہ جن میں پہلی چیز شرک ہے چنانچہ ارشاد ہوا: کہو...... آؤ میں خدا کی حرام کی ہوئی چیزیں تمہیں بتاؤں (قل تعالو اتل ما حرم ربکم علیکم[۲])

---

[۱] تخطف، کا مادہ ''خطف' بروزن ''عطف'' ہے جس کے معنی کسی چیز کو تیزی کے ساتھ دبوچ لینا ہے ''سحیق، کا مادہ ''سحن بروزن ''سخت'' اور اس کا معنی کسی چیز کو ریزہ ریزہ کردینا ہے۔یہ لفظ پرانے لباس اور مکان کو ترک کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔آخری معنی آیت کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔

[۲] تعالو'' کا مادہ ''علو' ہے جس کا معنی ہے ایک انسان کا بلند جگہ پر کھڑے ہوکر دوسرے لوگوں کو بلانا، گویا اس کا مفہوم ہے اوپر جاؤ۔پھر اس میں وسعت پیدا ہوگئی اور دعوت کی آمد پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا (المنار جلد ۸ صفحہ ۸۳) ممکن ہے اس میں اساس اصلی دعوت ہائے الٰہی ہوں۔ کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کو بلند و بالا مقام کی طرف دعوت دیں

## مشرکین پر بہشت حرام ہے:

(۷) ساتویں آیت میں ''شرک'' کی اہمیت اوراس کے خطرات کے پیش نظرایک نئی تعبیر لائی گئی ہے اور یہ زبان حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل سے خطاب کیا گیا ہے جس کسی نے بھی خدا کا کوئی شریک قرار دیا تو خدا نے اس پر بہشت حرام کردیا اوراس کا ٹھکانہ دوزخ میں ہوگا (انه من يشرك بالله فقدْ حرم الله عليه الجنة وماوٰهُ النارُ)

پہلے جملے میں اسم ''اللہ'' آیا ہے، دوسرے جملے (فقد حرم الله عليه الجنة) میں قاعدے کے مطابق ضمیر لائی جانی چاہے تھی لیکن اس جملے میں بار دیگر اسم ''ذکر ہوا ہے......اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی تاکید ہے اوراس حکم کی اہمیت پرایک واضح دلیل ہے آیت کے آخر میں فرماتا ہے اور ظالموں کے لیے کوئی یار و مددگار نہیں (وما للظلمين من انصار) اور یہ مشرکین کے ظالم ہونے پرایک اور دلیل ہے نیز اس پر کہ قیامت کے روز کسی کو یہ جرات نہ ہوگی کہ وہ ان کا دفاع کرے۔

## اللہ تعالیٰ مشرکوں سے بیزار ہے:

(۸) آٹھویں آیت میں ہم شرک کے بارے میں ایک نئے پہلو سے آشنا ہوتے ہیں۔جس میں مومنوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے اے ایمان لانے والو مشرک لوگ نجس و ناپاک ہیں (یاایها الذین اٰمنو انما المشرکون نجسٌ)

پھر فرماتا ہے: اس وجہ سے ناپاک لوگ آئندہ سال مسجد الحرام کے قریب نہ آئیں (فلا يقربوا المسجد الحرام بعد همهم هذا)

یہ آیت کئی جہات سے تاکیدات پر مشتمل ہے۔

سب سے پہلے انما کی تعبیر کہ یہ حصر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین نجس و ناپاک ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔اس سے مبالغہ اور تاکید کا پتہ چلتا ہے دوسرے لفظ ''نجس'' معنائے مصدری رکھتا ہے یعنی مشرک عین نجس ہیں جیسے کسی کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ وہ عین عدالت ہے، یہ بھی مبالغے کی ایک صورت ہے [1]

تیسرے یہ کہ یوں نہیں کہا گیا کہ (فلا يدخلو المسجد الحرام) وہ مسجد حرام میں داخل نہ ہوں بلکہ (فلا يقربو المسجد الحرام) کہا گیا ہے یعنی وہ اس قدر ناپاک ہیں کہ ان کا قریب جانا بھی مسجد کو نجس کردیتا ہے۔

(۹) نویں آیت میں بھی ایک نئے نکتے کی طرف ''اعلان عام'' کے عنوان سے اشارہ کیا گیا ہے، ۹ھ میں یہ آیات نازل ہوئیں اور حضرت امام علی علیہ السلام کو مامور کیا گیا کہ وہ حج کے موقع پر لوگوں کو یہ فرمان سنا ہیں: حج اکبر (عید قربان) کے دن خدا اور رسولؐ کی

---

[1] ''نجس'' بروزن ''مگس'' مصدر ہے اور ''نجس'' بروزن ''خشن'' اس کا وصفی معنی ہے جیساہ راغب نے مفردات میں کہا ہے یہ لفظ ظاہری و باطنی دونوں طرح کی نجاست کے لیے بولا جاتا ہے۔علامہ طبرسی، مجمع البیان'' میں کہتے ہیں، جس چیز سے انسانی طبیعت نفرت کرے وہ نجس ہے۔

طرف سے لوگوں کے لیے ایک اعلانِ عام ہے کہ خدا مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسولؐ بھی ان سے بیزار ہے (واذا ان من الله ورسوله الی الناس یوم الحج الاکبر ان الله بری من المشرکین ورسوله [1]

حج کے ایام میں ایک اہم اور حساس دن میں خدا رسول کے مشرکین سے اعلان بیزاری کا مطلب یہ ہے کہ ان کو مشرکین سے انتہائی نفرت ہے نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ "شرک" تمام گناہوں میں سب سے بدتر اور ایک نا قابل معافی گناہ ہے۔

(۱۰) دسویں آیت میں ایک اور طرز سے اس کی مذمت بیان ہوئی ہے، یعنی مشرک مرد اور مشرکہ عورت کو زنا کار مرد اور زنا کار عورت جیسا قرار دیا گیا ہے...... ارشاد ہوتا ہے: زانی مرد زانیہ یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے۔ اسی طرح زانیہ عورت بھی زنا کار مرد یا مشرک مرد لے سوا کسی سے نکاح نہ کرے (الزانی لاینکح الا زانیه اومشرکة والزانیه لاینکحها الا زانٍ اَوْ مشرِكٌ۔"

یہ تعبیر خواہ حکم شرعی کے بیان میں ہو کہ زنا کاروں اور مشرکوں سے نکاح حرام ہے یا ایک ظاہری طریقہ کا اظہار ہے کہ ہم جنس اپنے ہم جنس کی طرف جاتا ہے یعنی بدکار اپنے جیسے بدکاروں کی طرف مائل ہوتے ہیں ہر دو صورتوں میں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ "شرک" ایک بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ مشرکوں کو زنا کاروں اور اخلاقی خوبیوں سے محروم لوگوں کے مساوی قرار دیا گیا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے۔ لایزنی الزانی حین یزنی وهو مومنٌ ولا یسرق السارق حین یسرق وهو مومن فانه اذا فعل ذالك خلع عنه الایمان كخلع القمیص۔ زنا کار زنا حالت میں مومن نہیں اور چور حالت چوری میں مومن نہیں کیونکہ جب وہ ایسا کام شروع کرتے ہیں تو ان کی روح سے ایمان خارج ہو جاتا ہے۔ جیسے قمیص بدن سے اتر جائے [2]

نیز ان کے باہمی رابطے کی وضاحت انشاء اللہ بعد میں کی جائے گی۔

البتہ مومنوں کا مشرکوں سے نکاح قطعاً حرام ہے۔ زنا کاروں کے ساتھ ازدواج کے بارے میں ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ار وہ زنا کاری میں مشہور ہوں اور اس فعل سے توبہ نہ کریں تو ان سے نکاح حرام ہے اور ہرگز جائز نہیں اس کی شاہد وہ بہت سی احادیث ہیں جو پیغمبر اکرمؐ، امام جعفر صادق اور امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہیں۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں لکھا ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے ام مہزول سے نکاح کے لیے حضرت رسولؐ سے اجازت مانگی تو یہ آیت نازل ہوئی تھی مذکورہ عورت زمانہ جاہلیت میں زنا کاری میں شہرت رکھتی تھی حتی کہ اس مقصد سے اس کے گھر پر جھنڈا بھی لگا ہوتا تھا۔ لہٰذا اس شخص کو اس کے ساتھ نکاح کرنے سے روکا گیا [3]

---

[1] بہت سے مفسرین نے یوم الحج الاکبر سے "عید قربان" مراد لی ہے جو ایام حج میں اہم ترین دن ہے اور اہل بیت و اہل سنت کی روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں لیکن بعض علماء کے نزدیک وہ دن یوم عرفہ اور بعض کے خیال میں حج کے عام ایام ہی حج اکبر ہیں کہ یہ تعبیر حج وعمرہ کے مقابل ہوئی ہے جو حج اصغر کہلاتا ہے۔ بعض علماء نے اس آیت کے سال نزول ہی کو حج اکبر کہا ہے کیونکہ اس سال مسلمان اور مشرک حج میں اکٹھے ہی موجود تھے، تاہم ان چاروں میں سے پہلا احتمال مناسب ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۵۷۱ حدیث ۲۰۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۷ صفحہ ۱۲۵۔

(۱۱) گیارہویں آیت میں عقیدہ توحید کی ضرورت اور شرک کی برائی کو ایک اور عنوان سے بیان کیا گیا ہے چنانچہ پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا کہو کہ مجھے تو صرف خدائے واحد کی عبادت کرنے کا حکم ہوا ہے۔ اور یہ بھی کہ میں اس کے ساتھ کسی چیز یا شخص کو شریک قرار نہ دوں (قل انما اُمرت ان اعبدالله ولا اُشرك به)۔

انما'' کی تعبیر جس میں حصر کے معنی پائے جاتے ہیں...... اس سے ظاہر ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی تمام تر دعوت کا خلاصہ توحید کی ترویج اور شرک کی نفی ہے[1] واقعی ایسا ہی ہے کیونکہ توحید ہی تمام آسمانی تعلیمات کی جان ہے جیسا کہ تمام شیطانی نظریات کی اساس و بنیاد شرک پر قائم ہے۔ آخر میں یہ آیت بطور تاکید کہہ رہی ہے۔ (الیه ادعوا و الیه ماب) یعنی میں صرف اسی (خدائے واحد) کی طرف بلاتا ہوں اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

(۱۲) بارہویں آیت میں پہلے اولوالعزم پیغمبر یعنی حضرت نوحؑ کے متعلق بات ہو رہی ہے کہ انہوں نے بھی اپنی دعوت کی اساس اثبات توحید اور نفی شرک کو قرار دیا اور یہ امر قابل توجہ ہے کہ دیگر انبیاء کی دعوت کے بارے میں بھی یہی تعبیر آئی ہے۔ ارشاد ہوا ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا (تو انہوں نے لوگوں سے کہا) میں تمہارے لیے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ (ولقد ارسلنا نوحاً الی قومه انی لکم نذیرٌ مبینٌ)

اس کے بعد مزید کہا: (میری سب سے پہلی دعوت یہ ہے کہ) خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو مجھے تم لوگوں پر سخت عذاب والا دن آنے کا اندیشہ ہے (ان لا تعبدوا الا الله انی اخاف علیکم عذاب یومٍ الیم)

(حضرت نوحؑ سے لے کر پیغمبر اکرمؐ تک) تمام انبیاء کی طرف سے اس بات کا تکرار اس امر کی دلیل ہے کہ دعوتِ انبیاء میں سب سے اہم چیز اثبات توحید اور نفی شرک ہے اور یہی تمام ادیان میں قدر مشترک ہے اسی بناء پر ہم سورہ آلِ عمران کی آیت ۶۴ میں پڑھتے ہیں: کہو کہ اے اہل کتاب (آسمانی) اس بات کی طرف آؤ کہ جو ہمارے تمہارے درمیان مشترک ہے یعنی ہم سب خدائے یکتا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم میں سے بعض خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا رب تصوّر نہ کریں۔ (قل یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمةٍ سوآءٍ بیننا و بینکم الا نعبد الا الله ولا نشرك به شیاء ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله)۔

یہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور اس میں کبھی شکستگی نہیں آئی یہی تمام آسمانی مذہب کی اساس ہے اور اہل مذہب کی بدبختی کی اصل وجہ اسی قاعدہ (عقیدۂ توحید) سے ان کا انحراف ہے۔

(۱۳) ترھویں آیت اسی قاعدے کی ایک نئی تعبیر ہے اور کلمہ ''انما'' کے ساتھ حصر کر کے بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام کی دعوت و تبلیغ کا خلاصہ عقیدہ توحید ہے فرمایا گیا: کہو کہ فقط ایک چیز جس کی وحی میری طرف ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تمہارا معبود خدائے واحد ہے (قل انما یوحی الی انما الهکم الهٌ واحدٌ)

کیا تم اصل حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر آمادہ ہو (فهل انتم مسلمون) اگر تم سر تسلیم خم کرو تم اہل نجات میں سے ہوا

---

[1] اگر اس حصر کو اضافی قرار دیا جائے تو بھی تمام عبودیت کا خلاصہ عبودیت خدا ہی ہوگا (غور کریں

اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ جدائی

## شرک کا مقابلہ کرنا حضرت ابراہیمؑ سے سیکھیں:

(۱۴) چودھویں اور آخری آیت میں شرک وتوحید کا مضمون ایک نئے انداز سے بیان کیا گیا ہے اور ابراہیمؑ بت شکن کو( توحید وشرک کے مقابلہ کے ضمن میں )ایک نمونہ کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں تمہارے لیے ایک نمونہ موجود ہے۔(قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہٗ)

پھر اس اسوہ حسنہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: انہوں نے اس زمانے کی بت پرست اور مشرک قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جن کی خدا کے سوا تم پوجا کرتے ہو۔بیزار ہیں(اذقالو القومھم انا براءؤُ منکم ومما تعبدون من دون اللہ)

اس پر تاکید مزید کے طور پر فرمایا: ہم تمہارے نظریئے سے انکاری ہیں۔(کفرنا بکم)البتہ اشخاص کی نسبت سے کفر وانکار کا معنی ان سے برات وبیزاری کا اعلان کرنا ہے کیونکہ اسلامی روایات میں لفظ ''کفر'' پانچ معنوں میں استعمال ہوا ہے اور ان میں سے ایک معنی یہی برائت وبیزاری ہے لیکن اس پر قناعت نہیں کی گئی اور یہ بھی کہا گیا اب ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ دشمنی وعداوت رہے گی(وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضا ابداً)فقط ایک ہی صورت ہے کہ یہ دشمن ختم ہوجائے اور وہ یہ کہ وہ سب ے سب خدائے واحد پر ایمان لے آئیں۔(حتی تومنوا باللہ وحدہ)

یہ تعبیرات(بیزاری برات اور عداوت ابدی کا اعلان)بہ بانگ دہل بتارہی ہیں کہ توحید کے حامل لوگ کبھی بھی شرک وبت پرستی میں آلودہ لوگوں کے ساتھ دوستی نہیں کرسکتے۔جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کو بہ عنوان نمونہ پیش کرتا ہے تو اس سے ہم یہ مفہوم اخذ کرتے ہیں کہ اسلام بھی توحید پرستوں اور مشرکوں کے درمیان دوستی کے رابطے کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت کے مطالب پر غور وفکر کرنے سے مسئلہ شرک وتوحید کی اہمیت اور بھی واضح ہوجاتی ہے قومھم کی تعبیر بتارہی ہے کہ ان میں اکثریت بت پرست اور موحد بہت کم تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قائم ہے۔اس لحاظ سے مومنین کی ایک چھوٹی سی جماعت نے بھی اس چیز کو پسند نہیں کیا وہ مشرکوں(کے اکثریتی گروہ)سے دوستی اور رابطہ رکھیں اور یوں انہوں نے کلمہ توحید کا پرچم بلند کیے رکھا)۔

دوسری تعبیر: ہم تم سے بیزار ہیں اور تمہارے نظریئے کے کافر(انکاری)ہیں۔

تیسری تعبیر: ہم تمہارے معبودوں سے بری اور دُور ہیں۔

چوتھی تعبیر: ہم تمہیں اپنا دشمن گردانتے ہیں۔

پانچویں تعبیر: ہمارے دلوں میں تمہارے لیے کینہ ہے۔

گویا ہر تعبیر واضح کررہی ہے کہ یہ فیصلہ اٹل ہے اور ہمارے تمہارے درمیان کبھی تعلق نہ ہوگا۔عداوت اور بغضاء کا فرق کتب لغت کے ذریعے معلوم ہوجاتا ہے یعنی عداوت عملی پہلو رکھتی ہے اور بغضاء ایک قلبی کیفیت ہے......اگرچہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ

بھی استعمال ہوتے ہیں۔

اس طرح حضرت ابراہیمؑ اوران کے ساتھیوں نے واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ مشرکین سے بری و بیزار ہیں اور ہر صورت میں ان کا مقابلہ کریں گے یہی وہ اُسوہٴ حسنہ ہے جو ہر شخص اور ہر زمانے کے لیے ایک نمونہ ہونا چاہیے۔

''اُسوہ'' مقاییس اللغۃ کے بقول اس کے معنی ہیں مداوا اور اصلاح اسی لیے طبیب کو آسی کہا جاتا ہے''اسیٰ'' بروزن ''عصا'' کے معنی غم و ندوہ کے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ بیمار اور زخمی کے علاج معالجے میں دُکھ درد کی آمیزش ہوتی ہے اس کے بعد لفظ'' (اُسوہ) پیروی اطاعت اور پیچھے پیچھے چلنے کے معنی میں بولا جانے لگا کیونکہ علاج معالجے میں اس کام کے پیچھے لگے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن راغب نے المفردات میں ''اسوہ'' کے معنی پیروی ہی قرار دیئے ہیں خواہ یہ پیروی نیکی میں کی جائے یا بدی میں کی جائے۔ [1]

مذکورہ بالا چودہ آیات کہ جن کی مثالیں قرآن مجید میں بہت زیادہ ہیں ان سب سے ایک نکتہ واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ بروائے قران مسئلہ اثبات توحید و نفی شرک بڑی اہم اور اساسی حیثیت رکھتا ہے یہاں تک کہ مشرکین کے ساتھ کسی قسم کی دوستی اور رابطہ رکھنا جائز نہیں ہے۔اور شرک کی جڑ بنیاد کو اکھاڑ پھینکنا چاہیے اگر علمی و منطقی استدلال سے شرک کو روکا جا سکے تو بہتر......ورنہ پوری قوت اور ثابت قدمی کے ساتھ شرک اور اہل شرک کے مقابلے میں اُٹھ کھڑا ہونا ضروری ہے۔

مومن کا اصل سرمایہ عقیدہ توحید ہے اور قیامت میں جس سامانِ نجات کی قدر و قیمت ہوگی وہ توحید ہے گناہ شرک ہرگز قابل بخشش نہیں اور مشرک ایک ایسا موجود ہے جس سے مکمل طور پر الگ دور اور بیزار ہونا چاہیے مگر یہ کہ وہ اپنے غلط طریقے کو چھوڑ دے۔اپنی اصلاح حال کرلے اور ایمان بر توحید کی طرف پلٹ آئے۔

# توضیحات

## مسئلہ توحید و شرک کی اتنی اہمیت کیوں؟

ہم سب اس بات کو اجمالی طور پر جانتے ہیں کہ اسلام بلکہ تمام مذاہب شرک کے بارے میں بہت حساسیت رکھتے ہیں۔لیکن اس کی دلیل سب پر ظاہر واضح نہیں یعنی اثبات توحید اور نفی شرک کے دلائل اکثر لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔تاہم اس بارے میں چار دلیلیں دی جاسکتی ہیں۔

(ا) توحید تمام صفات الٰہیہ کی شناخت میں اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔اصل توحید کی طرف توجہ کیے بغیر ہم صفات خداوندی کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے۔کیونکہ (بعد میں کی جانے والی وضاحت کے مطابق) خدا کی یکتائی کا سرچشمہ اس کا لامحدود ہونا ہے اور

[1] بعض لوگوں ے مطابق ''اسیٰ'' ناقص وادی و ناقص یائی ہر دو صورتوں میں استعمال ہوتا ہے، اگر ناقص یائی ہو تو اس کا معنی حزن و غم ہے اور ناقص وادی ہو تو پھر اس کا معنی معالجہ و اصلاح ہے۔

اس کی ذات تمام صفات کمال کی جامع اور ہر قسم کے نقص وعیب سے مبرا و منزہ ہے پس اگر ہم توحید حقیقی کو سمجھ لیں تو گویا ہمیں خدا کی تمام صفات کی معرفت ہو گئی......خلاصہ یہ کہ شرک میں مبتلا ہونے کی صورت میں ہم صفات خداوندی کی معرفت کے حصول میں ناکام رہیں گے۔

(۲) اس جہانِ ہستی پر خدا کی ذات کے نور توحید کی شعاعیں بھر رہی ہیں، یہ ساری کائنات اور اس کے موجودات باہم متصل ہیں اور وحدت کا رنگ رکھتے ہیں۔ اس عالم دنیا کی صحیح شناخت اور پہچان کے لیے اس کے تمام اجزاء کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم موجودات عالم کو متفرق اور بے ترتیب تصور کریں تو پھر ہم جہان و جہانیات کو پہچانتے ہیں غلط فہمی سے بچ نہیں سکیں گے۔

جہانِ ہستی ایک وحدت ہے...... یہ درس ہمیں کہاں سے ملا؟ اس کی بنیاد خدا کی یگانگی اور یکتائی ہے وحدت خدا وحدت جہان کی دلیل ہے وحدت جہان وحدت خدا کی نشانی ہے (مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ③ [۶۷:۳] )تم خدائے رحمن کے خلق کرنے میں تفاوت نہیں پاؤ گے۔ دوبارہ دیکھو کیا کوئی شگاف ورخنہ نظر آ رہا ہے؟

(۳) جہانِ انسانیت کی ترقی وپستی اور پس ماندہ رہ جانے کا موجب ہوتا ہے......اتحاد و یگانگت، قوت، وقدرت اور عمران و آبادی کا ذریعہ ہے۔

خدائے یکتا کی وحدت کا عقیدہ کروڑوں انسانوں کے قلوب کے لیے حلقہ اتصال ہے۔ یہ ان میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرتا ہے اور رنگ ونسل قوم اور وطن کے تعصّبات کی بیخ کنی کرتا ہے (وہ سب ایک ہیں کیونکہ ان کا خالق ایک ہے)۔

زمانہ جاہلیت میں عرب معاشرہ توحید وایمان سے دُور اپنے اپنے قبیلے کے بتوں کے نام پر بٹ جانے سے کمزور ہو چکا تھا اور بدبختی ان لوگوں پر مسلط تھی۔ پھر اسلام آیا بت ٹوٹے اور زنجیر توحید نے ان کے دلوں کو باہم جوڑ کر انہیں ایک متحد اور مضبوط ملت بنا دیا۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ میں وہ معاشرہ اس قدر ترقی یافتہ اور طاقتور ہوا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام متمدن ممالک اس کے زیرنگیں آ گئے۔

(۴) اخلاقی تربیت اور انسانی صفات کا تکامل بھی سایہ توحید ہی میں ممکن ہے کیونکہ اخلاق کی بنیاد اخلاص اور غیر خدا سے دل کو دُور رکھنا ہے اس کی اصل اور بنیاد ہی یہ ہے کہ انسان کی عملی حرکت وتحرک فقط تحریکِ الٰہی سے ہو۔ یعنی فقط اسی کے لیے قدم اُٹھے۔ اسی کی راہ میں جہاد کیا جائے اور اسی کی طرف حرکت ہو، اس کے سوا ہر حرکت وتحرک سے دور رہے۔

توحید ہی انسان کو خلوص نیت کا درس دیتی ہے......کیسا درس؟ ہر قسم کی ریاکاری، نفس پرستی اور جاہ طلبی کی مخالفت اور دنیا پرستی ، شیطان دوستی وشرک کے مقابلے کا درس اسی عقیدہ توحید ہی سے ملتا ہے اگر آپ اس پہلو سے غور کریں تو مسئلہ توحید وشرک عقائد سے اعمال تک نیتوں سے اخلاق تک اور فرد سے معاشرے تک ہر ایک کو اپنے زیر اثر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تمام مذکورہ باتوں کی نسبت مسئلہ اثبات توحید ونفی شرک کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی اور اس پر استدلال میں وہ قوت دکھائی ہے کہ اس کے سامنے کوئی باطل نظریہ ٹھہر ہی نہیں سکتا۔

یہاں دو حدیثوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس بحث کو اختتام تک پہنچاتے ہیں:

(۱) ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے عبداللہ بن مسعود سے فرمایا: یابن مسعود! ایاك ان تشرك باللہ طرفة عین وان نشرت بالمنشار، اوقطعت، اوصلبت، اواُحرِقت بالنارِ[۱]

اے ابن مسعود! ہوشیار ہو مبادا کہ چشم زون کے لیے بھی شرک میں جا پڑا، خواہ تجھے آرے سے چیر دیا جائے یا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا تجھے آگ میں جلا دیا جائے۔ اس روایت سے توحید کی ضرورت و اہمیت واضح و آشکار ہے۔

(۲) ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ان بنی امیة اطلقوا للناس تعلیم الایمان ولم یطلقوا تعلیم الشرك لکی اذا حملوهم علیهِ لم یعرفوه[۲]

بنی اُمیہ نے لوگوں کو ایمان کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دے رکھا تھا۔ لیکن انہیں مسئلہ شرک پر توجہ دینے کی اجازت نہ دی گئی (کہ وہ شرک کی حقیقت کو سمجھ لیں) تاکہ جب چاہیں ان لوگوں کو شرک کی وادی میں دھکیل دیں۔

اس حدیث سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ شرک دشمنان دین کے ہاتھ میں ایک سیاسی و اجتماعی تخریبی ہتھیار تھا جس سے وہ کام لیا کرتے تھے۔ جبکہ توحید اور اس کے آثار پر ایمان ہی ایک ایسی قوت ہے جس سے کالموں کی جڑ بنیاد قطع کی جاسکتی ہے۔

# دلائلِ توحید

مسئلہ توحید میں ہم سب سے پہلے دو مسائل کی جستجو کرتے ہیں:

(۱) یہ کہ ذات خداوندی کسی طرح کے اجزاء ترکیبی (خارجی و عقلی) سے مرکب نہیں ہے۔

(۲) یہ کہ ذاتِ الٰہی کی کوئی مثل و مثال نہیں اور وہ ہر لحاظ سے واحد و یکتا ہے۔

قرآن مجید میں اس ضمن میں بہت سے دلائل نظر آتے ہیں۔ یہاں ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[۱] بحارالانوار جلد ۴ صفحہ ۱۰۷ (طبع بیروت)

[۲] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۱۵ حدیث ۱۔

# (۱) توحیدِ خدا پر فطرت کی گواہی

## اشارہ:

جیسا کہ اس جلد کے آغاز میں اصل مسئلہ معرفتِ خدا میں ''برہان فطرت'' سے استفادہ کیا ہے اسی طرح یہ صفات خدا بلکہ مسئلہ معاد نبوت میں ہمارے لیے رہنما بن سکتا ہے۔ اس لحاظ سے گویا ہم نے اس برہان کے ساتھ عہد و پیمان کر لیا ہے کہ اسے ہرگز ترک نہیں کریں گے اور اکثر مباحث میں اس کا ذکر کرتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

توحید ذات اور توحید صفات میں ''برہان فطرت'' ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ یعنی ہم نہ صرف اپنی رُوح کی گہرائی اور عمق قلب سے وجودِ خدا کے ہونے کی آواز سن رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس آواز کے سوا ہمارے باطن میں کوئی اور آواز ہی نہیں ہے۔ جب مشکلوں سختیوں اور مصیبتوں میں ہم پر جان کنی کی کیفیت طاری ہو جائے۔ وسائل و اسباب کا دروازہ بند نظر آئے تو ایسے میں ہم اپنے اندر سے آوزۂ توحید سُن رہے ہوتے ہیں جو ہمیں مبداء یکتائی کی طرف بلا رہا ہوتا ہے۔ کہ یہی وہ قوت ہے جو تمام مشکلات میں کام آ سکتی ہے اور یہی وہ مسبب الاسباب ذات ہے جو عالم اسباب سے بلند و بالا ہے۔

اب ہم اس سلسلے کی چند آیات پر نظر ڈالتے ہیں:

(۱) فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ [۲۹:۶۵] (روم)

(۲) وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ [۳۰:۳۳] (انعام)

(۳) قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ [۶:۴۰] بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ [۶:۴۱] (نحل)

(۴) وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ [۱۶:۵۴] (نحل)

(۵) قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ

لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٣﴾ [٦:٦٣] قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا
وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٦٤﴾ [٦:٦٤] (انعام)

## ترجمہ:

(۱) جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا کو اخلاص سے پکارتے ہیں اور اس کے غیر کو بھول جاتے ہیں) لیکن جس وقت خدا ان کو خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو پھر سے مشرک بن جاتے ہیں۔

(۲) جب لوگوں کو تنگی و سختی ہوتی ہے تو وہ اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔لیکن جب وہ انہیں اپنی رحمت کے کچھ حصے کا ذائقہ چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ والے اپنے پروردگار کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

(۳) کہو کہ کیا تم نے کچھ سوچا ہے کہ اگر تم پر تمہارے پروردگار کا عذاب آجائے یا قیامت برپا ہوجائے تو کیا تم (حل مشکلات کے لیے) غیر خدا کو پکاروگے، اگر تم سچے ہو۔نہیں صرف اسی کو پکاروگے اور جس مشکل کے لیے تم نے اسے پکارا ہو وہ چاہے تو اسے حل کردے، وہ جسے آج تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، اس روز (بوقت مشکل اسے فراموش کردیتے ہو۔

(۴) جو نعمتیں تمہارے پاس ہیں وہ خدا کی طرف سے ملی ہیں پھر جب تمہیں تکلیف آپڑتی ہے تو خدا ہی کو پکارتے ہو اور جب وہ تکلیف تم سے دور کردیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے پروردگار کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔

(۵) کہو کہ کون تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے نجات دیتا ہے جب تم اسے ظاہراً اور پوشیدہ طور پر پکارتے (اور کہتے) ہو کہ اگر تو ہمیں ان خطرات سے نکال لے تو ہم تیرے شکر گذاروں میں سے ہوں گے کہو کہ خدا تم کو ان مشکلوں اور دیگر مصیبتوں سے بچاتا ہے پھر تم اس کے لیے شریک ٹھہراتے ہو۔

# تفسیر آیات

## نور توحید کی روشنی:

(۱)......(۲)......اس جلد کے آغاز میں ''معرفت خدا کے فطری راستے، کے ذیل میں پہلی اور دوسری آیت کی تفسیر ہو چکی ہے۔ اب ہم اس کی طرف مختصر اشارہ کرکے آگے بڑھ جائیں گے۔پہلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے۔جو کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور خلوص نیت سے اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔دوسری آیت میں اسی مسئلہ کو کلی طور پر بیان کیا ہے کہ لوگ جب بھی کسی تنگی میں پڑتے ہیں مشکلیں ان کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں تو بے ساختہ ان کے دستِ دعا معبود حقیقی کے حضور بلند ہوتے ہیں اسی کے سایہ رحمت میں پناہ حاصل کرتے ہیں لیکن جب خدا نہیں اپنے لطف وکرم کا ذائقہ چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ شرک کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ان ہر دو آیات میں دو باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) آفات وحوادث کے وقت اکثر لوگوں میں خلوص دل پیدا ہو جاتا ہے۔

(۲) طوفان حوادث کے ٹل جانے کے بعد ان میں سے ایک بڑا گروہ شرک کی طرف لوٹ جاتا ہے۔اس لحاظ سے مسئلہ معرفت خدا کی طرح توحید پرستی بھی فطرت انسانی میں موجود ہے لیکن عام زندگی میں جب عالم اسباب کی طرف توجہ نہ ہو اور زندگی خوشحالی سے گزر رہی ہو تو اس سے لوگوں میں شرک نمودار ہونے لگتا ہے، لیکن روز مرہ زندگی میں تنگی وسختی پیدا ہو جائے اور وسائل حیات کم یا مفقود ہو جائیں تو غفلت اور بدمستی کے تاریک بادلوں کے پیچھے سے انسان کی ''فطرت توحید پرستی'' ''طلوع کرتی اور اپنا جلوہ دکھانے لگتی ہے۔گویا انسان توحید کی طرف پلٹ آتا ہے۔یہ آیات واضح وروشن راستے سے غفلت کے مارے ہوئے انسانوں کے کانوں کو ندائے فطرت سے آشنا کرتی ہیں، یہ انسان کی دستگیری کرتے ہوئے اسے ایسی جگہ لے جاتی ہیں۔جہاں عالمِ اسباب کا شور وشغب نہ ہو اور انسان لذاتِ زندگی میں ڈوب نہ جائے...... ہاں! ایسے ہی فطری وطبیعی ماحول میں انسان اپنے ضمیر اور وجدان کی آواز سن پاتا ہے اس عالم میں معرفت خدا کی روشنی اس تک پہنچتی ہے اور اسے توحید پرستی کا درس بھی ملتا ہے لیکن یہ دلنواز صدا وہاں بہت کم سنائی دیتی ہے جہاں نفسانی خواہشات کا ہجوم ہو اور دنیا کی عیش وعشرت کے علاوہ کچھ یاد ہی نہ آتا ہو۔کبھی کبھی یہی صدا انسان کا باز و پکڑ کر اسے سمندر میں جا اتارتی ہے کبھی اسے زندانوں میں لے جاتی ہے۔اور کبھی اسے ناقابل علاج بیماروں کے پاس پہنچاتی ہے یہ ایسے مقامات ہیں، جہاں شیاطین جن وانس کی صدائیں خاموش ہو جاتی ہیں اور فقط فطرت ووجدان کی سچی ندا کانوں میں رس گھول رہی ہوتی ہے کتنی پسندیدہ اور کتنی دلکش ہے یہ آواز!

(۳) تیسری آیت میں مشرکوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نئی تعبیر کے ساتھ فطری توحید پرستی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔فرمانِ الٰہی ہوا۔ان سے کہو، تم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ اگر پروردگار کا عذاب آجائے یا قیامت اپنی سختیوں کے ساتھ برپا ہو جائے تو کیا تم غیر خدا کو پکارو گے اگر تم سچے ہو (قل اراء یتکم ان اتاکم عذاب اللہ او اتتکم الساعۃ اغیر اللہ تدعون ان کنتم صدقین)۔

عذاب اللہ'' سے مراد دنیا میں پیش آنے والے مصائب وتکالیف ہیں اور'' اتتکم الساعة ''سے علاماتِ قیامت، آخری زمانے کے خوفناک حادثے اور ابتداء قیامت مراد ہے۔ ان مصیبتوں کا ذکر بہت سی آیات قرآن میں آیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرب قیامت میں ہولناک سختیاں آئیں گے۔

بہت سے مشرک عذاب الٰہی اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ لیکن جب وہ ان لوگوں کی تاریخ پڑھیں گے جن پر عذاب آیا ''خصوصاً جزیرہ عرب وحجاز کے نزدیک گزری ہوئی قومیں تو ان کے آثار اور علامات کا مشاہدہ کرکے عذاب الٰہی کا یقین کرلیں گے۔ یہ بھی فصاحت وبلاغت کا ایک پیرایہ ہے کہ جس چیز کو فریق مخالف تسلیم نہ کرتا ہو اس کا ذکر ایسے امر کے ساتھ کیا، جسے وہ قبول کرتا ہو تا کہ وہ ان دونوں کی باہمی مشابہت کو دیکھتے ہوئے اس کو بھی قبول کرلے۔

لیکن قرآن مجید ان مشرکوں کے جواب کا انتظار نہیں کرتا۔ بلکہ ان کی طرف سے جونسا جواب دیا جاسکتا ہے اسے خود ہی دہراتے ہوئے کہتا ہے: تم لوگ فقط انہی (سخت) اوقات میں پکارتے ہو، وہ اگر چاہے تو بہ لحاظ مصلحت تمہاری مشکل کو حل کردے۔ (بل ایاہ تدعون فیکشف ماتدعون الیہ ان شآء) تو ایسی حالت ضرور ہے کہ جن کو تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو۔ انہیں بھول جاؤ گے۔ (وتنسون ما تشرکون)۔

اس سے پہلے ہم یہ ذکر کرچکے ہیں کہ بہت سے مفسرین نے ''اء یتکم ''کو'' اخبرونی'' (مجھے خبردو) کے معنی میں لیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ معنی اصلی کا لازمہ ہے اور اس کا اصل معنی یہ ہے کہ کیا تم نے مشاہدہ کیا؟ آیا تم نے سوچا؟ بہرحال قرآن نے ان آیات میں مشرکوں کی عملی روش کا ذکر کیا اور اسے خود انہی کے مقابل بطور استدلال پیش کیا ہے [1]

## تمام شدائد اور سختیوں میں اس کی پناہ لیتے ہو:

(۴) چوتھی آیت میں اس مفہوم کو ایک نئے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے فرمایا ہے جو بھی نعمت تمہارے پاس ہے وہ خدائے واحد کی دی ہوئی ہے (ومابکم من نعمة فمن اللہ)

تمہارے بنائے ہوئے بتوں اور معبودوں نے تمہارے لیے کونسا کام انجام دیا ہے۔ تمہیں ان کی طرف سے کونسی نعمت ملی ہے اور انہوں نے تمہارے سروں پر کونسے پھول لگائے ہیں؟

اصولی طور پر تو وہ اپنی ذات اور اپنے وجود میں تمہارے ہی محتاج ہیں (تمہی انہیں تراشتے ہو اور ان کی حفاظت کرتے ہو) پھر کیونکر وہ تمہیں کوئی نعمت اور برکت دے سکتے ہیں؟

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: وہ تو نعمت وبرکت عطا کرنے کی بات تھی۔ لیکن تم تو مشکلوں اور مصیبتوں میں بھی خدائے واحد ہی کو پکارتے ہو اور خانہ خدا کے دروازے پر نالہ وفریاد کرتے ہو (ثم اذا مسکم الضر فالیہ تجرون)

---

[1] پہلی صورت میں ''روت'' اور مشاہدہ ظاہری آنکھ سے اور دوسری صورت میں دل کی آنکھ سے'' مشاہدہ کرنا مراد ہے۔

تجئرون کا مادہ جئار ''بروزن'' غبار'' ہے اس کا اصل معنی جنگی اور پالتو جانوروں کا سختی وتکلیف کی حالت میں بے تابی سے آوازیں بلند کرنا ہے......پھر بطور کنایہ اسے انسانوں کی فریاد واستغاثہ کے معنی میں استعمال کیا گیا جو وہ مشکلوں اور مصیبتوں میں بلند کرتے ہیں۔ راغب اصفہانی المفردات میں کہتا ہے کہ یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب انسان دُعا وتضرع کی حالت میں آواز بلند کرے جیسے تکلیف واذیت کے وقت جنگلی جانور آوازیں بلند کرتے ہیں۔

واضح ہے کہ ایسے حالات میں انسان اپنی فطرت کی طرف لوٹ آتا ہے، مصنوعی رکھ رکھاؤ کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ خیالی محلات زمین بوس ہوجاتے ہیں......پھر انسان ہوتا ہے اور اس کی فطرت انسان ہوتا ہے اور اس کا وجدان، اس وقت وہ ایک ہی نکتہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ہاں وہی ایک نکتہ کہ جس کو ہم ''اللہ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ جملہ الیہ تجئرون'' میں حصر اور یکتائی پر دلالت پائی جاتی ہے یعنی تم لوگ صرف اسی خدائے واحد کی طرف متوجہ ہوتے اا ور اسی سے حل مشکلات کے طلبگار ہوتے ہو۔

پھر فرمایا ہے: لیکن جب اللہ تعالیٰ تمہارے رنج وتعب کو دُور کردیتا ہے اور تم اپنی پہلی سی اطمینان کی زندگی میں داخل ہوجاتے ہو تو تم میں سے ایک گروہ پھر شرک کی طرف چلا جاتا ہے (ثم اذا کشف الضر عنکم اذا فریق منکم بربھم یشر کونَ)

فریق (ایک گروہ) کے لفظ میں اشارہ ہے کہ ان میں ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو ان سخت حالات سے گزرنے کے بعد اپنے آپ کو بدل لیتا ہے اور اپنی زندگی میں شرک کی بجائے توحید پرستی کا طریقہ اختیار کرلیتا ہے مختلف آفات وبلیات میں ایک یہ فلسفہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے باعث ایک گروہ کی روحانی تربیت ہوتی ہے اور اس کا ضمیر بیدار ہوجاتا ہے [۱]۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ ''ضر بروزن''حر''اور''ضَر''بروزن''شر''ہر دو کا معنی ایک ہی ہے اور وہ ہے ضد نفع جب کہ کچھ دوسرے ماہرین لغت پہلے لفظ کو بدحالی اور دوسرے لفظ کو ضرر کے معنوں میں لیتے ہیں۔ المفردات میں راغب اصفہانی نے کہا ہے''ضر'' کا معنی بدحالی اور دوسرے لفظ کو ضرر کے معنوں میں لیتے ہیں المفردات میں راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ ''ضر'' کا معنی بدحالی ہے کہ چاہے وہ عقل ودانش کی کمی کے باعث ''روحانی بدحالی'' یا کسی عضو میں نقص کی وجہ سے ''بدنی بدحالی'' یا مالی پریشانی وبدحالی کی صورت میں ظاہری پہلو رکھتی ہو جو فقر وفاقہ اور بے آبروئی کی شکل میں ہوتی ہے۔ [۲]

بہرحال لفظ ''ضر'' ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر قسم کا رنج وغم اور تکالیف ومصائب کے علاوہ کمی مال بھی شامل ہے۔

اس نکتے پر بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ جیسا کہ لسان العرب میں آیا ہے۔ کہ ''کشف'' کے معنی کسی چھپی ہوئی چیز پر سے حجاب وپردہ ہٹا دینا ہے جس کا لازمہ اس کا ظاہر ہوجانا ہے، (پھر یہ لفظ ہر قسم کے غم واندوہ اور مشکل ومصیبت کو دور کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا گویا یہ اذیتیں انسان کے تن بدن کو ایک حجاب کی طرح ڈھانپ لیتی ہیں اور کسی چیز یا شخص کے ذریعے چھٹ جاتی ہیں)۔

---

[۱] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جملہ میں ''من'' تبعیض کا نہیں بیانیہ ہے لیکن یہ بعید نظر آتا ہے اور پھر سورۂ لقمان کی آیت ۳۲ کے مضمون کے مخالف بھی ہے۔ فلما نجّھم الی البر فمنھم مقتصدٌ۔ (تفسیر روح المانی)

[۲] لسان العرب مجمع البحرین مفردات راغب۔

## امواج ظلمت میں نور درخشاں:

(۵) پانچویں اور آخری آیت میں مذکورہ بالا آیات کے مضمون کو ایک دوسرے ڈھب سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: کہو کہ صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں کون تمہیں نجات دیتا ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ اسی کو نالہ وفریاد کرتے ہوئے پکارتے ہو۔ (قل من ینجیکم من ظلماتِ البر والبحر تدعونہ تضرعاً وخفیۃ)

اس حالت میں تمہارے سب بناوٹی معبود تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں صرف خدائے واحد کا دامن رحمت ہی تھامتے اور کہتے ہو کہ اگر خدا ہمیں (ان خطروں اور تاریکیوں سے) نجات دے تو ہم اس کے شکر گذار بنیں گے۔ (لئن انجانا من ھٰذہٖ لنکونن من الشکرین

ظلمات البرو البحر (دریا صحراؤں کی تاریکی) کی خوبصورت ترکیب میں شاید ظاہری تاریکیوں کی طرف اشارہ ہو، ممکن ہے راتوں کو سمندری طوفانوں اور زمینی جھگڑوں کا ذکر ہو کہ ایسے وقت بڑے ہی خوفناک اور خطرناک ہوتے ہیں۔

شب تاریک وبیم موج وگردابی چنیں ہائل
کجا دانند حال ما سبکسار ان ساحل ہا

ہوسکتا ہے کہ یہاں بری وبحری تمام وحشی وموذی حیوانات کا خوف مراد ہو! نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مفسرین کے بیان کردہ مطلب کے مطابق یہ تاریکیاں سبھی مشکلوں مصیبتوں تنگیوں اور سختیوں کی طرف کنایہ ہوں [۱]۔

بہرحال یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کے مفہوم میں دونوں طرح کی تاریکیاں شامل ہوں۔ یعنی ظاہری تاریکی جو انسان کے لیے ہولناک ہے اور معنوی تاریکی کہ وہ بھی تکلیف دہ اور وحشت ناک ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اس قسم کی تکالیف عموماً سفر میں پیش آتی ہیں اور آیت کا اشارہ اسی طرف ہے۔

''تضرعاً وخفیۃً۔ کی ترکیب بھی بڑی پسندیدہ ہے کیونکہ ''تضرع'' کا معنی دعا گڑ گڑاہٹ اور اپنی عاجزی کا اظہار کرنا ہے۔ [۲]

جب کہ خفیہ کا مطلب پوشیدہ طور پر اور دل ہی دل میں دعا مانگنا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں تعبیریں ایک ہی انسان کی دو حالتوں کو بیان کرتی ہوں یعنی مشکلات کی تاریکیوں کے آغاز میں وہ خدا کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے اور جب تکلیفوں اور مصیبتوں میں بُری طرح پھنس جاتا ہے۔ گویا چھری گردن پر ہوتی ہے تو جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وہ زبان پر آجاتا ہے۔ پھر وہ آہ وزاری اور عاجزی کرتے ہوئے خدا کو پکارتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ تضرع اور خفیہ کی تعبیریں مختلف گروہوں کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہوں کہ بعض گروہ ایسی ابتلا و مصیبت میں خدا کو آ شکار

---

[۱] تفسیر المیزان جلد ۷ صفحہ ۱۳۶۔ تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۳ صفحہ ۲۶۹۔

[۲] راغب اصفہانی کہتا ہے کہ ''تضرع'' سے مراد ''اظہر الضراعۃ یعنی ظاہر بظاہر فریاد و پکار کرنا ہے۔

اطور پر پکارتے ہیں اور بعض پوشیدہ طور پر اسے یاد کرتے ہیں، گویا ابھی وہ خدا کو ظاہراطریقے سے پکارنے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں یا ان لوگوں سے ندامت کا احساس رکھتے ہیں۔ جن کے نزدیک وہ بت پرست قرار دیئے جاتے ہوں۔ لیکن اب بتوں کی بجائے خدا کو پکار رہے ہوں اور مشکلوں میں اس سے مدد مانگنے لگے ہوں۔

بہرحال ایسے سخت حالات میں وہ (مشرک) لوگ اپنی فطرت (خداشناسی) کی طرف پلٹ آتے ہیں اور نور توحید ان کے قلب ونظر کر روشن کردیتا ہے اور وہ خدا کے سوا ہر دوسری ذات کو خود سے دو ہٹا دیتے ہیں۔ ایسے میں انہیں یقین ہوجاتا ہے کہ ہمارے یہ بت نہایت بے حیثیت اور ناکارہ ہیں اس لیے ہماری زندگی اور بقا کا راستہ صرف اور صرف عقیدہ توحید و یکتا پرستی ہی ہے۔

اس حال میں وہ لوگ غالباً اپنے خدا کے ساتھ عہد و پیمان باندھتے منتیں مانتے اور قول وقرار کرتے ہیں۔ کہ اگر وہ ہمیں ان مشکلوں اور سختیوں سے رہائی بخشے اور ہماری جانوں کو اپنے لطف وکرم سے آرام وراحت عطا کرے تو ہم ہمیشہ ہمیشہ اس کے فضل واحسان پر اس کے شکر گزار رہیں گے۔ لیکن جب وہ مصیبتوں کی تنگ گھاٹیوں سے نکل آتے ہیں تو زیادہ تر اپنے قول وقرار کو فراموش کردیتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت میں آگے چل کر کہا گیا ہے: کہو کہ خدا ہی تمہیں ان تاریکیوں اور ہر قسم کی ناراضی سے نجات دیتا ہے لیکن تم پھر سے اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتے ہو (قل اللہ ینجیکم منھا ومن کل کرب ثم انتم تشر کون[1])۔

البتہ جیسا کہ اس سے پہلے کی آیات میں ذکر آیا ہے کہ یہ اکثر مشرکین کی حالت بیان ہوئی ہے۔ لیکن ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جس میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت اور آمادگی پائی جاتی ہے۔ یہ گروہ جب بیدار ہوتا ہے اور فطرت خداشناسی کی طرف پلٹتا ہے تو شرک وبت پرستی کو ترک کر کے خدائے واحد پر ایمان لے آتا ہے۔ آیات قرآن کے مذکورۂ بالا مجموعے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے۔ کہ قرآن فقط خداشناسی کو ہی فطرت قرار نہیں دیتا۔ بلکہ وہ توحید و یکتا پرستی کو بھی تقاضائے فطرت سے تعبیر کرتا ہے چونکہ انسان کی فطرت غالباً آداب ورسوم گمراہ کن نظریات اور غلط قسم کی تعلیم وتربیت کے باعث پس منظر میں چلی جاتی ہے اس لیے وہ ایسے زمانے کے انتظار میں رہتی ہے جس میں اس پر سے غلط اثرات کے پردے ہٹ جائیں اور وہ اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوسکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن اس سلسلے میں انسان کی زندگی کے حساس ترین لمحات کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ سخت ترین حوادث ان پردوں کو ہٹا دیں پھر انسان ہو اور فطرت انسان...... انسان ہو اور اس کا ضمیر و وجدان ایسی حالت میں انسان صرف اسی (خدا) کو پکارتا ہے اور اس کے غیر سے رُخ پھیر لیتا ہے۔ اس سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ خدا کی توحید و یکتائی انسان کی جان وروح میں پوشیدہ ہے اس بارے میں اس جلد کے ابتدائی صفحات میں فطرت اور خداشناسی کے زیرِ عنوان تفصیلی بحث وگفتگو ہو چکی ہے۔

---

[1] کرب'' کے معنی ہیں شدید غم واندوہ لسان عرب میں ہے کہ الالہ............ ہر وہ چیز جسے خدا کے علاوہ معبود بنایا جائے ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں اہل لغت کے بیانات نقل کرنے کے بعد کہا گیا ہے ان بیانات سے ظاہر ہے کہ الا الہ کا معنی ''عبادت'' ہے مجمع البحرین میں ہے'' الالھۃ'' کے معنی ہیں اصنام کیونکر مشرکوں کے نزدیک وہ عبادت کے لائق ہیں کتاب امین از میل بن احمد میں بھی ہے۔ کہ الثالہ کا معنی ہے التعبد عبادت کرنا قاموس اللغہ میں بھی یہی معنی آئے ہیں گویا یا تمام اہل لغت کا نظریہ یہی ہے کہ ''الہ'' کا معنی معبود ہی ہے

# موجوداتِ جہاں کا باہمی ارتباط وہم آہنگی

## اشارہ:

معرفت ذات خدا کے جو طریقے علماء عقائد اور فلاسفہ نے بتائے ہیں۔ ان میں سے ایک اس جہان ہستی کا مطالعہ ہے، یہ جہان ایک مربوط نظام رکھتا ہے۔ جس میں ہر چیز دوسری چیز سے ہم آہنگ ہے اور یہ وحدت وارتباط اس جہان کے خالق کی وحدانیت و یکتائی کی خبر دے رہا ہے اس لحاظ سے اس دلیل کو برہان وحدت وارتباط...... کا نام دیا جائے تو بہتر ہے۔

بعض اوقات اس دلیل کو ایک اور طریقے سے ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح اگر اس عالم وجود میں دو ارادے کار فرما ہوں او دو مدبر اس کی تدبیر کر رہے ہوں تو اس میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ چونکہ اس کائنات میں ایسا کوئی فتور و فساد نہیں ہے پس یہ سمجھا جائے گا کہ اس جہان کا خالق و مدبّر ایک ہی ہے، اس اعتبار سے اس دلیل کو...... برہان تمانع...... کہا جا سکتا ہے۔

بنابریں برہان وحدت وارتباط اور برہان تمانع کی اصل وروح ایک اور تعبیریں دو ہیں یہ الفاظ دیگر ایک مفہوم مطلب کی طرف دو زاویوں سے نظر کی جاتی ہے کبھی وحدت عالم سے وحدت خالق کی طرف اور کبھی اس عالم ہستی میں عدم فساد سے وحدت مدبر کی طرف جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایک صورت میں اوپر سے نیچے اور دوسری صورت میں نیچے سے اوپر کو نظر کی جارہی ہے۔ بہر حال دلائل توحید میں یہ ایک بہترین دلیل ہے اور آیات قرآن میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف متوجہ ہوتے اور آیات ذیل میں دل وجان سے نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ ہُوَ حَسِیۡرٌ ﴿۴﴾ [۶۷:۳] ملك

(۲) اَمِ اتَّخَذُوۡۤا اٰلِہَۃً مِّنَ الۡاَرۡضِ ہُمۡ یُنۡشِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾ لَوۡ کَانَ فِیۡہِمَاۤ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۲۲﴾ [۲۱:۲۲] (انبياء)

(۳) مَا اتَّخَذَ اللّٰہُ مِنۡ وَّلَدٍ وَّ مَا کَانَ مَعَہٗ مِنۡ اِلٰہٍ اِذًا لَّذَہَبَ کُلُّ اِلٰہٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿ۙ۹۱﴾ [۲۳:۹۱] (مومنون)

## ترجمہ:

(۱) تم رحمن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے پھر پلٹ کر دیکھو کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آ تا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر ناکام پلٹے گی۔

(۲) کیا ان لوگوں کے (بنائے ہوئے) ارضی خدا ایسے ہیں کہ موجودات جہان کو پیدا کرنے کے بعد منتشر کریں اور پھیلائیں؟ اگر آسمان وزمین میں ایک اللہ کے علاوہ دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین وآسمان کا نظام بگڑ جاتا پس اللہ......رب عرش ان باتوں سے پاک ہے جو وہ بنا رہے ہیں۔

(۳) اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور خود ہی اس کے امور کو چلاتا۔ پھر وہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا چاہتے (تو یہ دُنیا تباہ ہو جاتی) پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بنایا کرتے ہیں۔

## مفردات کی تشریح:

''فطور'' کا مادہ ''فطر'' بروزن ''سطر'' ہے......اصل میں اس کا معنی شگاف پیدا کرنا اور پھاڑنا ہے بعض ماہرین لغت مثلاً المفرادت میں راغب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا معنی طول میں شگاف ڈالنا ہے، پھر یہ ہر قسم کے ابداع وایجاد اور خلقت کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ عمل پردہ عدم سے وجود کو ظاہر کرتا ہے گویا پردہ عدم میں شگاف پیدا ہوتا ہے تو کوئی چیز وجود میں آتی ہے۔

یہ لفظ ''دو انگلیوں سے دودھ دوہنے پر بھی بولا جاتا ہے اسی طرح روزہ کھولنے کو بھی افطار کہا جاتا ہے۔ اس پر ضروری بحث ہم ''برہان فطرت'' کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

''الہٰ'' ماہرین لغت کے نزدیک یہ لفظ ''معبود'' کے معنی رکھتا ہے، اس کا مادہ ''الاھلہ'' بہ معنی عبادت سے لیا گیا ہے، اس کے بارے میں دیگر ماہرین کی آراء حاشیے میں ملاحظہ فرمائیں۔ [1]

قرآن مجید میں بہت سی آیات میں اس کے یہی معنی لیے گئے ہیں جیسا کہ ہم بنی اسرائیل کی داستان میں پڑھتے ہیں کہ بت پرستوں

---

[1] مصباح اللغۃ، میں کہا گیا ہے ''اَلَہَ ۔لَہُ ۔الھۃ، باب ''تعب'' (عبد عبادۃ) تالہ (تعبد) اور اِلٰہ کے معنی ''معبود'' ہیں۔ نیز صحاح اللغۃ میں بھی کچھ فرق کے ساتھ یہی معنی لئے گئے ہیں اور راغب اصفہانی نے المفردات میں کہا ہے کہ ''الہٰ'' ہر معبود کے لئے مستعمل ہے الہ فلان یالہ (عَبَدَ) یعنی عبادت کی لسان العرب میں کہ ہے الأ لہ۔۔۔۔ ہر وہ چیز جسے خدا کے علاوہ معبود بنایا جائے ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں اہل لغت کے بیانات نقل کرنے کے بعد کہا گیا ہے ان بیانات سے ظاہر کہ اَلِالٰہَ کا معنی ''عبادت'' ہے مجمع البحرین میں ہے اَلاُلھۃُ کے معنی ہیں اصنام کیونکہ مشرکوں کے نزدیک وہ عبادت کے لائق ہیں کتاب العین از جیل بن احمد میں بھی ہے کہا التَّالُّہُ کا معنی ہے اَلتَّعَبُّدُ عبادت کرنا قاموس اللغۃ میں بھی یہی معنی آئے ہیں گویا تما اہل لغت کا نظریہ یہی ہے کہ ''الہٰ'' کا معنی ''معبود'' ہی ہے۔

کے ایک گروہ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا (یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَةٌ ) یعنی اے موسیٰ! ہمارے لیے ایک معبود بنا دو، جیسے ان کے معبود اور بت ہیں۔ (اعراف ۱۳۸)

قصہ سامری میں آیا ہے (وَانْظُرْ اِلٰٓی اِلٰھِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ) اس معبود کی طرف دیکھو جس کی تم ہمیشہ عبادت کیا کرتے تھے ہم تو یقینا اس کو جلائیں گے (طٰہٰ۔۹۷) دیگر بہت سی آیات بھی اس پر دال ہیں خلاصہ یہ کہ تمام اہل لغت اور بہت سے مفسرین نے ''الہ'' کا معنی معبود ہی لیا ہے اور عام طور پر اس کا استعمال بھی اس معنی میں ہوتا ہے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مورد میں اس کو خالق یا مدبر کائنات کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے تو وہ اس لحاظ سے کہ یہ اوصاف معبود والہ کا لازمہ ہیں پھر محض کسی لفظ کا استعمال ہی حقیقت کی علامت نہیں ہوتا جب کہ علماء لغت کی تصریحات اس کے خلاف ہیں اور موارد استعمال بھی اس کے شاہد ہیں۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ کلمہ لا الہ الا اللہ ان معنوں کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ عرب وعجم کی قوموں میں خدا کے سوا دیگر معبود بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس سوال کا جواب واضح ہے۔ کیونکہ معبود سے مراد معبود برحق ہے نہ معبود باطل یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود برحق نہیں اور بت عبادت کے لائق نہیں ہیں اس معنی کے قرائن خود اسی جملہ میں موجود ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں۔ لاعلم الا ما نفع کوئی علم نہیں مگر وہ جو نفع بخش ہو یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض اہل لغت الٰہ کو مادہ ''ولہ'' سے مشتق مانتے ہیں کہ جس کا معنی ''تحیر'' ہے یعنی اس میں ایک ایسی ذات کی طرف اشارہ ہے جس کے بارے میں عقلیں حیران رہ جاتی ہیں۔ تاہم اہل لغت میں سے اکثریت کے نزدیک پہلے معنی کو ہی ترجیح حاصل ہے کہ الٰہ کا مادہ الہ (عبادت) ہے اس ساری گفتگو سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں الٰہ کا معنی معبود نہیں ان کا یہ قول کسی بھی صورت میں قابلِ لحاظ نہیں ہے۔

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

اس جہان کو غور سے دیکھو۔ کوئی بے ترتیبی نہیں پاؤ گے۔

(۱) پہلی آیت میں آسمانوں کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ رحمٰن کی تخلیق میں تم کسی قسم کی بے ربطی۔ عیب نقص اور تضاد نہیں پاؤ گے (ماتریٰ فی خلق الرحمن من تفاوتٍ) یعنی یہ وسیع وعریض دنیا اپنی تمام پہنائیوں کے باوجود ہم آہنگ مربوط متحد اور منظم ہے۔

بدیہی امر ہے کہ اس جہان ہستی میں رنگ، صورت اور دیگر ظاہری وباطنی کیفیات میں تو فرق اور تفارت ہے لیکن یہاں جس تفاوت کی نفی کی جارہی ہے وہ بے ربطی، بدنظمی اور اختلال ہے۔ اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے پھر فرماتا ہے پھر سے دیکھو...... اس کائنات کو بڑے غور سے دیکھو، کیا تمہیں کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے۔

(فارجع البصر هل تریٰ من فطورٍ)

جملہ ''فارجع البصر'' سے مراد گہری اور باریک نگاہ ہے اس میں خطاب اگرچہ نبی اکرمؐ سے ہے لیکن اس میں سبھی لوگ شامل

وداخل ہیں اس سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے تاکیداً فرمایا: بار بار نگاہ دوڑاؤ اس وسیع وعریض دنیا کا نظارہ کرو (لیکن) تمہاری آنکھیں تھک کر ناکام پلٹیں گی اور تمہیں اس میں کسی قسم کی خامی نظر نہیں آئے گی (ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیك البصر خاسیاً وھو حسیرٌ[1]

اس طرح قرآن اپنے مختلف بیانات کے ذریعے انسانوں کو اس دنیاو جہان کا مشاہدہ ومطالعہ کرنے کی دعوت دے رہا ہے صرف دعوت ہی نہیں بلکہ وہ انہیں تشویق وترغیب دے کر اس کیلئے آمادہ وتیار بھی کر رہا ہے تا کہ انہیں یقین ہوجائے کہ واقعی اس جہان کی خلقت میں کوئی کسی اور نقص نہیں ہے جب ان کو اس میں کوئی بے ربطی وبدنظمی نہیں ملے گی تو ان کے دل وزبان سے نغمہ لآ اِلٰہَ اَلاَّ اللہُ پھوٹ نکلے گا اور یہ سہانے صدا بہت سے دلوں کو موہ لے گی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک نفی تفاوت سے نقص وعیب کی نفی مراد ہے اور بعض کے خیال میں یہاں بے ربطی کی نفی ہورہی ہے۔بعض اسے اضطراب وتنزلزل کی نفی اور بعض اسے تناقص اور کسی طرح کی کجی کی نفی کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں جب کہ اس آیت کا مفہوم وسعت رکھتا ہے ار یہ ہرقسم کے نقص کو شامل ہے۔اس لفظ (تفاوت) کا مادہ ''فوت'' ہے کیونکہ جب دو چیزوں میں تفاوت ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں دوسری چیز کے صفات نہیں پائے تھے۔

## اگر دنیا میں دو خدا ہوتے:

(۲) دوسری ایت میں وہی مطلب ومفہوم ایک اور انداز میں بیان ہورہا ہے فرمایا گیا۔کیا ان کے (مٹی پتھر) کے زمینی معبود ایسے ہیں کہ قیامت میں مردوں کو زندہ کرسکیں۔ یا ان میں یہ طاقت ہے کہ موجودات کو پیدا کریں اور انہیں زمین میں پھیلا دیں (امِ اتخذ والھة من الارض ھم ینشرون)

من الارضِ (زمین سے) کے الفاظ میں ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ وہ (مشرک) اپنے معبودوں یعنی بتوں کو مٹی پتھر لکڑی اور دھاتوں سے بناتے ہیں کہ وہ سب زمین چیزیں ہیں کیا ایسی چیزیں وسیع آسمانوں کی خلاق وحاکم اور ان کو قائم رکھنے والی ہوسکتی ہیں؟ پھر مشرکوں کے عقیدے کو جھٹلانے کے لیے بطور استدلال فرماتا ہے۔اگر آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کچھ خدا موجود ہوتے تو اس کائنات کا نظام تہ وبالا ہیں جاتا اور وہ ویران ہوکر رہ جاتی ہے۔(لو کان فیھما اٰلھة الا اللہ لفسدتا)

المفرادت میں راغب اصفہانی نے خیال ظاہر کیا ہے''فساد'' کے معنی کسی چیز کا حد اعتدال سے نکل جانا ہے کہ وہ کمی ہو یا بیشی جسم میں

---

[1] ارجع البصر'' (پلٹ کر دیکھو) بار بار توجہ سے دیکھنے سے کنایہ ہے'' خاسئ کا مادہ ''خسأ'' بروزن ''کسب'' ہے اور اس کا معنی ذلت وخوری کے ساتھ بند ہوجانا ہے۔گویا یہ محرمیت وناکامی سے کنایہ ہے حسیر مادۂ 'حسر'' بروزن ''قیصر'' سے ضعف وناتوانی کے معنی میں ہے، اصل میں اس کا معنی برہنہ ہونا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی چیز کمزور ہوجائے تو قوت وطاقت سے خالی وبرہنہ ہوجاتی ہے۔یہ لفظ کمزور کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے

ہو یا روح میں یا دنیا کی دیگر اشیاء میں واقع ہو۔فساد کا نقطہ مقابل اصلاح ہے، یہاں فساد کے معنی خرابی تباہی بد نظمی اور ٹوٹ پھوٹ ہیں۔آخر میں نتیجہ کلام کے طور پر ذکر کیا جارہا ہے کہ پروردگارِ عرش ان باتوں سے پاک ہے جو یہ (مشرک) کہہ رہے ہیں اور وہ ہر قسم کے شریک اور ساجھی سے منزہ و بے نیاز ہے (فسبحان اللہ رب العرش عما یصفون)[1]

اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مدبر، مدبر خالق حاکم اور تصرف کرنے والے اس دنیا میں دو ہوں تو اس میں نظم وضبط کا پیدا ہونا ممکن نہیں کیونکہ متعدد خداؤں کے باعث تدبیر وتصرف کرنے والے زیادہ ہوں گے، جس سے جہانِ ہستی میں بے ترتیبی اور فساد وتباہی پھیل جائے گی اس لیے کہ ہر خدا کی خواہش ہوگی کہ وہ دنیا میں اپنی پسند کا نظام قائم کرے۔

البتہ اس ذیل میں ایک مشہور اشکال ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ کہ ہوسکتا ہے دونوں خداؤں میں اتحاد اور ہمکاری ہو اور وہ متفق ہو کر اس دنیا کا نظام چلاتے ہوں جس سے یہاں ایک واحد ومربوط نظام قائم ہو گیا ہو۔اس اشکال کا جواب توضیحات میں دیا جائے گا۔

تیسری اور آخری آیت میں اس دلیل وبرہان کو نئے پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔فرمایا: اللہ نے مسیحیوں اور بت پرستوں کے خرافات کے برعکس) کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور (مشرکوں کے قول کے برخلاف) کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ شریک نہیں (ما اتخذ اللہ من ولد وما کان معہ من الہٍ)۔

اگر کوئی دوسرا خدا بھی ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہوجاتا (اپنی تدبیر وتصرف میں لے آتا) اور پھر یہاں غیر مربوط اور مختلف نظام) اور قانون کی حکومت ہوتی۔اس طرح دنیا میں بڑی بے ترتیبی اور بد نظمی پیدا ہوجاتی (اذاً لذہب کل الہٍ بما خلق)

یہ امر بذات خود وحدت خدا اور توحید کی ایک مضبوط دلیل ہے جو انہیں دو مقدموں سے مرکب ہے جن کا ذکر ہو چکا ہے یعنی ایک طرف یہ منظم ومربوط کائنات ہمارے سامنے ہے کہ جس میں معین ومقرر قوانین جاری ہیں۔

دوسری طرف یہ چیز ہے کہ اگر یہاں دو خالق دو مدبر اور دو تصرف کرنے والے موجود ہوتے تو متعدد تدبیروں اور تعبیروں کی وجہ سے اس دنیا میں ناموزنیت ہوتی۔اس آیت کے آخر میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے اگر اس جہان میں کئی ایک خدا ہوتے تو ہر ایک اپنی قلمرو میں وسعت کے لیے کوشاں ہوتا اور وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے (ولعلی بعضھم علی بعض) چنانچہ خداؤں کی یہ باہم آویز دنیا کے نظام میں فساد اور بگاڑ کا سبب بن جاتی۔

اس موقع پر ایک مشہور اشکال وارد ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے وہ دانا وحکیم خدا اپنے اپنے دستور العمل کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ بنائیں اور یوں اس دنیا کے نظام میں خلل اور بد نظمی پیدا نہ ہو، لیکن جیسا کہ پہلے کیا گیا ہے......ہم اس اشکال کا جواب توضیحات کے ذیل میں دیں گے۔

آخر میں ان دونوں دلائل کا نتیجہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ پاک ومنزہ ہے خدائے واحد ان باتوں سے جو یہ لوگ اس کے بارے میں کیا کرتے ہیں (سبحان اللہ عما یصفون)

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت کے نزدیک اس آیت میں لفظ ''اَم'' منقطع ہے اور ''بَل'' کے معنی میں ہے بعض اسکو ''ھل'' (استفہامیہ) کے معنی میں لیتے ہیں چونکہ مشرکین اپنے بتوں کیلئے خالقیت کے دعوے دار نہیں ہیں اس لیے بہتر ہے کہ اس استفہام انکاری تصور کیا جائے۔

# توضیحات

## (۱)۔علوم کی رو سے آفرینش جہان کی وحدت:

جب اس وسیع عالم کی طرف نظر کی جائے تو بادی النظر میں پراگندگی اور تفریق دکھائی دیتا ہے۔سورج چاند، ستارے زمین آسمان، انسان، حیوان، درخت پودے اور عناصر جدا جدا اور مختلف نظر آتے ہیں لیکن جب قدرے غور کریں تو اجزاءوزارت عالم اس طرح مربوط دکھائی دیتے ہیں۔جیسے ان میں ایک ربط اور وحدت موجود ہے۔جب مطالعہ اور بھی دقیق وعمیق ہو پھر وحدت وارتباط پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے......اس لیے کہ

(۱) نظامِ شمسی کے تمام کرات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ ایک ہی شمار ہوتے ہیں اور مفکرین کا بدیہی خیال ہے کہ شروع میں یہ سب ایک ہی کرہ کی شکل میں تھے۔پھر جدا جدا ہوگئے۔لیکن جدائی کے باوجود بھی باہم مربوط ہیں۔ادھر ماہرین فلکیات کا نظریہ ہے کہ ہمارا نظام شمسی اپنی جگہ مستقل نہیں بلکہ یہ ایک بہت بڑی کہکشاں کا حصہ ہے جو دوسری کہکشاؤں کے ساتھ مل کر ایک واحد نظام کی تشکیل کرتے ہیں اور قانون جاذبہ نے ان سب کو ایک زنجیر میں جکڑ رکھا ہے......بہرحال ان ماہرین کے نزدیک یہ تمام کہکشاؤں میں ابداء ایک وحدت تھیں اور پھر آہستہ آہستہ ان میں علیحدگی اور جدائی پیدا ہوئی گئی۔

(۲) وہ مختلف اجسام جو ہمیں باہم متفاوت نظر آتے ہیں اور ان کی تحلیل وتجزیہ سے ظاہر ہوا ہے کہ یہ سب معینہ عناصر سے مرکب میں اس وقت تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق ان عناصر کی تعداد ایک سو سے کچھ زیادہ ہے۔ان کے ظاہری اختلاف کے باوجود جب ان عناصر کو شگافتہ کیا اور توڑا جائے یعنی ''اٹیم'' کی صورت میں لایا جائے تو یہ ذات ایک دوسرے سے مشابہ نکلیں گے، ان میں جو فرق ہوگا فقط الیکٹرون اور پروٹون کی تعداد میں کمی بیشی کی بناء پر ہوگا۔

(۳) یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ جو نظام اس ذرہ ناچیز یعنی ''ایٹم'' میں ہے وہی نظام اس پوری کائنات پر حکم فرما ہے یہی نظام جاذبہ ودافعہ اس نظامِ شمسی کے تمام سیارات اور ''ایٹم'' کے الیکٹرون کی اپنے اپنے خاص مداروں، ان کے اصل مرکز کے گرد حرکت دیتا ہے لیکن نہ تو وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور نہ باہم جذب ہوتے ہیں۔

(۴) روئے زمین کے تمام موجودات رنگا رنگ کے نظارے دکھاتے ہیں اور ہماری نظر میں ان رنگوں کے درمیان بڑا فرق ہوتا ہے۔لیکن اگر ہم ان کا تجزیہ کریں تو سب رنگوں کی بازگشت امواج کی طرف ہوتی ہے ان میں جو بھی فرق نظر آتا ہے وہ شدت ارتعاش اور ان موجوں کی بلندی وپستی کی وجہ سے ہے۔

(۵) ہم مختلف قسم کی آوازیں سنتے ہیں لیکن آج علم طبیعات بتارہا ہے کہ ان اچھی بُری اور بلند وپست سبھی آوازوں کی بنیاد ایک ہے یہ اصل میں خاص قسم کی امواج ہیں کہ ان کا ارتعاش ان کے درمیان اختلاف اور تنوع کا موجب بن رہا ہے۔

(۶) دنیا میں جانوروں کی بہت سی اقسام ہیں اور فقط کیڑے مکوڑوں کی قسمیں ہی لاکھوں تک پہنچتی ہیں نباتات میں اس سے بھی زیادہ

تنوع ہے لیکن ماہرین کہتے ہیں کہ ان سب کی اصل اور بنیاد ایک ہے یہ سب نباتات میں اس سے بھی زیادہ تنوع ہے لیکن ماہرین کہتے ہیں کہ ان سب کی اصل بنیاد ایک ہے یہ سب سلول اور جرثومہ سے مرکب ہیں اور ان میں ایک نظام جاری ہے......یہی وجہ ہے ایک دواء کی انسان پر ہونے والی تاثیر کا پتہ چلانے کے لیے اس کا تجربہ حیوانات پر کیا جاتا ہے۔

(۷) آسمان کے ستارے خواہ ہم سے نزدیک ہیں یا دور......ان کے نور اور روشنی کا تجزیہ کرنے والے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جن عناصر سے یہ ستارے مرکب ہوئے ہیں وہ ان اجزا ترکیبی سے مشابہ ہیں جو کرہ زمین کا وجود تشکیل دیتے ہیں ان تمام کرات اور ستاروں میں ایک عجیب طرح کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

(۸) اس دنیا پر حکم فرما قوانین (مثلاً قانون جاذبہ، رفتار نور اور قانونِ حرکت وغیرہ) ایک جیسے ہیں اور سب کا اُصول وقاعدہ ایک ہی ہے جب ہم کرہ زمین کی بعض چیزوں پر ایک قانون جاذبہ کو دیکھیں کہ جو نظامِ شمسی اور کہکشاؤں پر حاوی ہے اور نیوٹن نے اس قانون کو ایک درخت سے سیب کے گرنے سے دریافت کیا تھا۔

اس ساری بحث کے خلاصہ کے طور پر معلوم ہوا کہ خداوند رحمن کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہیں اس میں کسی قسم کا نقص خلل اور رخنہ نہیں ہے۔ جوں جوں انسان کے علم و دانش میں وسعت اور اضافہ ہوگا اسی قدر اس آیہ کریمہ کی عظمت اس کے مطالب کی گہرائی اور اس کے مفاہیم کی جامعیت واضح اور روشن ہوتی چلی جائے گی......موجوداتِ عالم کی یہ ہم آہنگی وحدتِ خالق اور توحید الٰہی کی ایک کھلی ہوئی دلیل ہے۔

## (۲) برہان تمانع کی ایک وضاحت

برہان تمانع جس کو ''برہان ممانعت'' اور برہان ''وحدت وہم آہنگی'' کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ وہ دو مقدمات سے مرکب ہے۔ اوّل جہان آفرینش میں وحدت وہم آہنگی کہ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے دوم اگر اس جہان کے خالق و مالک دو ہوں تو اس میں اختلاف وفساد ہو گا چونکہ اس دنیا جہان کے موجودات میں بدنظمی اور ناموزنیت نہیں......اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب موجودات کا سرچشمہ ایک مبداء حقیقی ہے سب کا خالق ایک ہے کہ وہی ان کا خالق اور مدبر ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں پہلی مقدمہ اول کے بارے میں اور دوسری وتیسری آیت مقدمہ دوم سے متعلق ہیں۔ لہٰذا کبھی مقدمہ اوّل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس (برہان تمانع) کو ''برہان وحدت'' کہا جاتا ہے اور کبھی مقدمہ دوم کو سامنے رکھتے ہوئے اسے ''برہان تمانع'' سے تعبیر کیا جاتا ہے پس ان دونوں تعبیروں کی بازگشت ایک ہی دلیل کی طرف ہے البتہ دو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے اسے دو ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

## دو سوالوں کا جواب:

(ا) پہلے سوال کے ضمن میں اکثر کہا جاتا ہے کہ مبداء وخالق کے تعدد کا نتیجہ ہمیشہ بدنظمی کی صورت میں رونما نہیں ہوتا۔ ہم نے ایسے کئی گروہ دیکھے ہیں جو باہمی مشاورت سے ایک دستور العمل پر عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر اس کائنات میں دو خدا ہوں تو فساد اس وقت پیدا ہوگا۔ جب ان کے درمیان کشمکش اور مقابلہ ہو لیکن اگر ہم یوں تصور کریں کہ وہ دونوں حکیم اور خبیر ہیں تو یقیناً وہ ایک دوسرے کے

معاون و مددگار ثابت ہوں گے اور باہمی مشاورت سے دنیا کا نظام قائم رکھ سکیں گے۔

## جواب:

یہ سوال پہلی نظر میں تو کچھ معقول دکھائی دیتا ہے۔لیکن درحقیقت اس میں مفہوم ''تعدد'' کی طرف توجہ ہی نہیں کی گئی۔

## توضیح:

جب ہم کہتے ہیں کہ متعدد خدا ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا نقطۂ نظر ایک نہیں ...... کیونکہ اگر ان میں ہمہ جہتی واتحاد فکر و عمل ہو تو پھر وہ واحد (ایک ہی) شمار ہوں گے۔ بہ الفاظ دیگر جب بھی تعداد و تکثر ہو، چاہے ہم بھی تصوّر کریں کہ ان کے نقطہ نظر میں تفاوت واختلاف نہیں۔تو بھی یہ امر محال ہے کہ دو موجود تمام جہات سے متحد و متفق ہوں علاوہ ازیں فعل و فاعل میں ایک مناسبت ضروری ہے۔کیونکہ ہر فعل اپنے فاعل کا ایک اثر اور نشان ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ چیز محال ہے کہ دو فعل جن کے فاعل دو الگ الگ ید قدرت ہوں وہ تمام جہات سے باہم مطابقت رکھتے ہوں۔جیسا کہ یہ بھی محال ہے کہ وہ فاعل ارادہ و عمل میں بالکل متحد اور ایک ہوں۔یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب وجود دو ہیں اور ان میں تفاوت ہے تو اس کا اثر ان کے ارادہ و عمل پر بھی ضروری ہوگا خلاصہ یہ کہ یہ صورت ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ایسا نظام جس میں دوئی نہیں اس کا مبداء وسرچشمہ ایسا ہو کہ جس میں تعداد ہی تعدد ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر ایک گروہ اور ایک تنظیم کے افراد مل جل کر کوئی کام کرتے ہیں ایسے کاموں میں وحدت دیک رنگی محض ظاہری حیثیت میں ہوتی ہے اور نظم واقعی وحدت واقعی نہیں ہوتی اس لیے کہ شوریٰ یعنی چند آدمیوں کا مل کر کام کرنا اس طرح جاری رہتا ہے کہ وہ شرکت وہم کاری کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے تصورات ونظریات سے صرفِ منظر کرتے ہیں (تاکہ وحدت برقرار رہے) نہ یہ کہ ہمیشہ ان سب کا نقطۂ نظر اور ان کی تشخیص و ترجیح ایک ہوتی ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ شورائی نظام میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ سبھی ایک چیز پر متفق ہو جائیں، بلکہ اس میں غالب اکثریت کی آراء پر عمل کیا جاتا ہے اور یہ بات خود ہمارے دعوے کی صحت پر ایک دلیل ہے نیز یہ اکثریت ثابتہ نہیں ہوتی اور افراد میں تبادلہ ہوتا رہتا ہے کبھی سات نفری مجلس میں جن چار آدمیوں کی اکثریت شمار ہوتی ہے ایک دوسرے موقع پر تین افراد تو انہیں میں سے ہوتے ہیں۔لیکن چوتھا ان کے پہلے حمایتی کی بجائے کوئی اور شخص ہوتا ہے اور اس پہلے شخص کی رائے ان کے برعکس ہو جاتی ہے۔اکثریت میں چونکہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے لہٰذا افعال میں یکسانیت نہیں ہوگی۔

ان تین دلیلوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شوارئی نظام میں افراد کے درمیان اختلاف فکر ونظر ہوتا ہے۔لیکن اس لیے کہ وہ ظاہری اتفاق رائے پر قناعت کر لیتے ہیں۔انہیں ایک لحاظ سے باہم مربوط و منظم کہا جا سکتا ہے۔جب کہ اس دنیا کا طبعی وفطری نظام محض ظاہری تناسب نہیں رکھتا بلکہ وہ حقیقی واصلی ارتباط اور کامل ہم آہنگی کا مظہر ہے ایک اور تعبیر کے مطابق اگر اس عالم کے مبداء وموجد دو ہوں اور ان میں ہر لحاظ سے یکسانیت ہو تو پھر وہ ایک ہی ہوں گے یا ان میں تمام جہات سے اختلاف ہو تو یہاں نظام وتدبیر میں دو مقابل نقاط ہوں گے

یا بعض امور میں اتفاق اور بعض میں اختلاف ہو تو اس افتراق و تفاوت کا اثر ان کے افعال پر ہوگا کیونکہ فعل وجود فاعل کا سایہ ہوتا ہے۔

(۲) مذکورہ بالا آیات میں جو جملہ (ولعلیٰ بعضهم علی بعض) آیا ہے۔اس پر غور کرنے سے یہاں ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ دو خدا جو دانا و حکیم ہیں ان کے درمیان ہمیشہ اختلاف و کشمکش رہے اور وہ ایک دوسرے پر غلبہ و تفوق حاصل کرنا چاہیں اہل تفسیر حضرات نے کیوں انہیں دو ایسے بادشاہوں کے مشابہ فرض کرلیا ہے جو صرف اپنا اختیار و اقتدار چاہتے ہیں اور ان میں ہمیشہ اختلاف و کشمکش رہے اور وہ ایک دوسرے پر غلبہ و تفوق حاصل کرنا چاہیں اہل تفسیر حضرات نے کیوں انہیں دو ایسے بادشاہوں کے مشابہ فرض کرلیا ہے۔جو صرف اپنا اختیار و اقتدار چاہتے ہیں اور ان میں ہمیشہ ہی کشا کش رہے گی۔کیوں ان دونوں خداؤں کو باہم متحد نہیں سمجھا جاتا جب کہ وہ حکیم ہیں؟

## جواب:

یہ سوال اس لیے پیدا ہوا ہے کہ اختلاف کی وجہ ہمیشہ خودخواہی اور خواہشات نفسانی ہی کو قرار دیا گیا۔جب کہ کسی وقت تفادستہ نظریات کے باعث بھی اختلاف ہوسکتا ہے اور یہ دو خداؤں کے درمیان بھی واقع ہوسکتا ہے۔

ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کا بار بار ذکر کریں کہ جب اس کائنات کے دو مبداء و خالق ہوں تو اس دوئی کا مطلب یہ ہے کہ وہ دو الگ الگ وجود ہیں اور یقیناً ان میں کئی جہات سے تفاوت و اختلاف بھی ہوگا وگرنہ ان کا وجود ایک ہوگا نہ کہ......لہٰذا ممکن نہیں کہ ان دونوں کا فعل ایک ہو۔ان میں سے ایک اس دنیا کے نظم و تکامل میں ایک طریقہ اختیار کرنا چاہے گا اور دوسرا اس سے مختلف رائے رکھتا ہوگا۔یہ تصویر کرنا کہ وہ دونوں (خدا) ہر لحاظ سے کامل ہوں گے ایک بہت بڑا استثناء ہے کیونکہ جب ان کو دو مانا گیا ہے تو ان میں سے ایک بعض کمالات سے تہی دامن ہوگا۔جبکہ دوسرا ان کمالات کا حامل ہوگا اس کا مفہوم یہ ہوا کہ کمال مطلق موجود نہیں بلکہ نسبتاً ان دونوں میں نقص پایا جاتا ہے لہٰذا کوئی تعجب نہیں کہ ان دونوں کے علم و قدرت میں باہمی تفاوت ہو اور ہر ایک نظام کائنات کو اپنے نظریے کے مطابق چلانا چاہتا ہو۔

## اسلامی روایات اور برہان وحدت و تمانع:

اسلامی روایات میں مندرجہ ذیل دلیل موجود ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ہشام بن حکم نے امام جعفر صادق سے پوچھا: ہم اس پر کیا دلیل رکھتے ہیں کہ خداوند عالم واحد یکتا ہے؟

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: اتصال التدبیر و تمام الصنع کما قال الله عزوجل و لو کان فیهما اٰلهةٌ الا الله لفسدتا......تدبیر عالم میں اتصال اور خلقت جہان کا کامل ہونا ہی خدا کی واحدانیت کی دلیل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہوتا تو ان میں تباہی و بربادی آجاتی [1]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۵۵ حدیث ۱۔

ایک اور حدیث جو الکافی میں شیخ کلینی نے ہشام بن حکم سے نقل کی اس میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ایک زندیق کے جواب میں فرمایا: لما اینا الخلق منتظما والفلك جاریا والتدبیر واحدًا واللیل والنهار والشمس والقمر دل صحة الامر والتدبیر واتلافِ الامر علی ان المدبر واحدٌ۔ جب ہم اس دنیا کو منظم و مرتب دیکھتے ہیں کشتی کو چلتا پاتے ہیں یہاں ایک تدبیر کو رواں محسوس کرتے ہیں......رات دن، سورج چاند اپنے راستے پر چل رہے ہیں تو تدبیر کے کامل ہونے اور تمام امور کے باہمی رابطے سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان سب کا مدبر ایک ہے [1]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۵۵ حدیث ۲۔

# ۳۔ دلیل صرف الوجود

## اشارہ:

وجود خدا غیر محدود ہے۔ جیسا کہ بعد میں بیان ہوگا۔

واضح سی بات ہے کہ جو غیر محدود ہو اس کے ساتھ دوائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ دو وجودوں کا غیر محدود ہونا ممکن نہیں اس لیے کہ جب دوئی کی بات ہوگی تو ان دو میں سے ہر ایک اپنے غیر کے وجود کو مفقود اور ختم کرے گا یا واضح الفاظ میں ایسی جگہ جا ئیں جہاں ایک کے وجود کی انتہا اور دوسرے کے وجود کی ابتدا ہو، اس صورت میں پہلا اور دوسرا ہر دو وجود محدود ہو جائیں گے کہ ان میں سے ہر کسی کی ابتداء اور پھر انتہاء بھی ہوگی۔

آیئے اس مطلب کو ایک مثال سے واضح کریں......دو شخص ہیں اور دونوں ہی ایک ایک باغ کے مالک ہیں، ظاہر ہے کہ جب باغ دو ہیں تو وہ محدود ہی ہوں گے۔ اگر فرض کیا جائے کہ ایک شخص کے باغ نے اتنی وسعت پیدا کر لی کہ روئے زمین کی پہناؤں کو گھیر لیا تو یہ مسلمہ امر ہے کہ پھر دوسرے باغ کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رہے گی اور دُنیا میں بس وہ ایک ہی باغ ہوگا۔ پس جہاں کوئی ذات لامحدود ہوگی اور واحد بھی ہوگی۔ برہان صرف الوجود سے مراد یہی ہے کہ خدا جو مطلق ہے اور وہ بلا قید و شرط ہر لحاظ سے لامحدود ہے۔ ظاہر ہے کہ اب اس کا ثانی اور دوسرا قطعاً فرض نہیں کیا جا سکے گا۔

اس اشارے کے بعد ہم قرآن کریم کی طرف توجہ کرتے اور آیات ذیل پڑھتے ہیں۔

(۱) شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰۤئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَاۤئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ [۳:۱۸] (عمران)

(۲) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲﴾ [۵۷:۲] هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳﴾ [۵۷:۳] (حدید)

(۳) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ [۱۲:۳۹] (یوسف)

## ترجمہ:

(۱) خدائے تعالٰی (عالم وجود کے ایک نظام کی ایجاد کے ساتھ) گواہی دے رہا۔ ہے کہ معبود بس وہی ہے۔فرشتے اور صاحبان علم (اپنے اپنے طریقے سے) گواہی دے رہے ہیں۔ جب کہ خدا نے (عالم ہستی میں) انصاف وعدالت کو قائم کیا (عدالت خدا کی واحدانیت کی علامت ہے) لہٰذا تم بھی اس آواز کے ساتھ آواز ملا کر کہو،اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی قادر وحکیم ہے۔

(۲) آسمانوں اور زمین کی مالکیت وحاکمیت اسی کی ہے وہی زندہ کرتا اور موت دیتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے وہی اوّل آخر۔ظاہر اور باطن ہے اور ہر چیز کا عالم ہے۔

(۳) (یوسفؑ نے کہا) اے میرے قیدی دوست......مختلف خدا بہتر ہیں۔ یا ایک واحد وقہار (خدا بہتر ہے)

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

## خودخدا اپنی ذات کی وحدت کا گواہ ہے:

(۱) پہلی آیت کی تفسیر ''برہان صدیقین'' کے ذیل میں ہوچکی ہے۔اس لیے اب ہم اسے اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔اس آیت کا مضمون یہ ہے: خدائے تعالٰی گواہی دے رہا ہے۔کہ معبود بس وہی ہے فرشتے اور صاحبانِ علم (اپنے اپنے طریقے سے) گواہی دے رہے ہیں (شھداللہ انہ لاالہ الاھو والملکۃ واولوا العلم)۔

خدا کی ذات پاک کی وحدت کی ایک علامت ونشانی اس کا وہ نظم وعدالت ہے جو پوری کائنات پر حکم فرما ہے اسی لحاظ سے آیت میں ارشاد ہوا وہ ایسی حالت میں ہے کہ اس نے انصاف قائم کیا ہوا ہے۔(قائما بالقسط) اس کے ساتھ ہی بار دیگر اپنی ذات کی وحدت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس کے سوا کوئی معبود نہیں (لاالہ الاھو) وہی خدا ہے جو قادر وحکیم ہے۔(العزیز الحکیم)

یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر اس بہان میں کئی خدا حکمران ہوں تو ایک کی سلطنت دوسرے کے ہاتھ میں نہیں ہوگی یعنی ان میں سے ہر ایک دوسرے کے کمال وقدرت کا حامل نہیں ہوگا۔لیکن یہ چیز خدائے تعالٰی کی صفت ''عزیز'' سے مناسبت نہیں رکھتی نیز اس دنیا میں اس کی جو ''حکمت'' کارفرما ہے۔وہ بھی اس کی وحدت کو ثابت کرتی ہے کیونکہ خداؤں کے تعدد کی صورت میں یہاں فساد وتباہی ہوگی۔

وحدت خدا کے بارے میں فرشتوں اور صاحبان علم کی گواہی تو واضح ہے۔لیکن اپنی ذات کی وحدت پر خدا کی اپنی گواہی کی صورت کیا ہے؟اس پر مفسرین نے خیال آرائیاں کی ہیں۔بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد لفظی شہادت ہے جو قرآن کریم کی بہت سی آیات میں آئی ہے،لیکن بعض کہتے ہیں اس عالم ہستی کے آفاق وانفس میں خدا کی قدرت وحکمت کے نشانات ظاہر وہویدا ہیں اور سب پر ایک ہی نظام حکم فرما ہے......پس یہی اپنی وحدت پر خدا کی گواہی ہے۔

بہر حال یہ دونوں تصورات اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ یہاں گواہی کی ایک اور صورت بھی ہوسکتی ہے اور اسی کی تشریح کرنا ہمارا مقصد ہے وہ گواہی کچھ یوں ہے کہ خدا کی ذات ہے ہی ایسی کہ اس میں تعدد ممکن نہیں،کیونکہ وہ ایک غیر محدود وجود ہے اور غیر محدود لامتناہی وجود ایک سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتا۔پس وہ ذات (خدا) ہی اپنی ذات کی وحدت پر گواہ اور اس پر ایک زبردست دلیل ہے(غور کریں)

البتہ ان تینوں نظریات میں کوئی تناقض نہیں اور یہ مذکورہ آیت کے مفہوم میں جمع ہو سکتے ہیں۔لہٰذا بعض بزرگ مفسرین (مثلاً صاحب المیزان) کا یہ اصرار قابل تسلیم نہیں کہ اس آیت کی تفسیر فقط معنیٰ اوّل (یعنی شہادت قولی ولفظی) کے مطابق ہی درست ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے الفاظ مطلق ہیں اور ان پر کسی ایک معنی کی قید نہیں لگائی جاسکتی۔

اس آیت میں جملہ ''لاالہ الااللہ'' کا تکرار کیوں ہوا؟ ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ بار اوّل بطور مقدمہ اور بار دوم بطور نتیجہ کے لایا گیا ہے،شاید اہل سنت کی مشہور تفسیر......تفسیر قرطبی میں امام جعفر صادقؑ کے ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہوا ہے جہاں آپ نے فرمایا:**الاولی وصفٌ وتوحیدٌ الثانیةُ رسم وتعلیم یعنی قولوا لاالہ الا اللہ العزیز الحکیم**۔یعنی یہ جملہ پہلی دفعہ وصف اور توحید کے لیے اور دوسری دفعہ تعلیم اور طریق عمل سے آگاہ کے لیے مذکور ہے۔یعنی (اے انسانو!) تم بھی کہو کہ خدائے واحد کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور وہ قدرت وحکمت والا ہے۔[1]

## وہی ہے اوّل وآخر، ظاہر باطن:

(۲) دوسری آیت سورۂ حدید کی آیات میں سے ہے (ان آیات میں امام علی زین العابدین علیہ السلام کے حساب ارشاد صاحبانِ فکر ونظر کے لیے صفات جمال وجلالِ خداوندی بہترین طریق اور عمیق پیرایہ میں ذکر ہوئی ہیں) چنانچہ فرمانِ ایزدی ہے: آسمانوں اور زمین کی ملکیت اور حاکمیت اسی کے لیے۔(**له ملك السمٰوٰتِ والارض**[2])

اس دلیل کے تحت موت وحیات بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔(**یحی و یمیت وھو علی کل شیءٍ قدیر**)

اس بناء پر عالم ہستی میں صرف وہی مالک، حاکم، اور مدیر ومدبر ہے۔

پھر انہی آیات میں ایک اور پہلو سے بات کی گئی ہے ممکن ہے کہ وہ بھی خدا کی توحید مالکیت، حاکمیت اور اس کے مدبر موجودات

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۲ صفحہ ۱۲۸۵

[2] یاد رہے کہ۔لہٗ۔کا مقدم ہونا حصر پر دلالت کرتا ہے۔یعنی آسمانوں اور زمین کی مالکیت وحاکمیت اسی کی ذاتِ اقدس میں منحصر ہے۔

ہونے کی دلیل ہو......فرماتا ہے۔وہی اوّل، آخر، ظاہراور باطن ہے اوروہی ہر چیز سے آگاہ اور عالم ہے(ھو الاوّل والا خر ولظاھر والباطنُ وھو بکل شیءٍ علیم)

اس آیت میں اس ذاتِ مقدس کے پانچ اوصاف بیان ہوئے ہیں جو مجموعی طور پر اس کی لامحدودیت کی دلیل ہیں۔جیسا کہ فرماتا ہے۔ہر چیز کی ابتداءاسی سے ہے۔ہر چیز کی انتہا اسی سے اور وہ ظاہر و باطن میں وجود رکھتا ہے وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اس کے سوا کوئی اور ایسا وجود نہیں کیونکہ اگر کوئی دوسرا خدا بھی ہوتا ہے تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا آغاز وانجام ہوتا اور وہ ظاہر و باطن میں موجود نہ ہوسکتے۔ان کا علمی حضور بھی ہر جگہ نہ ہوتا۔اگر وہ دو ہوتے تو دونوں ہی محدود ہوتے کیونکہ ان میں سے ہر ایک جب دوسرے تک پہنچتا تو ختم ہوجاتا ہے یعنی اس کی انتہا ہوتی اور دوسرے کی ابتداء پس خدا کا غیر محدود ہونا اس کی توحید و وحدت کی دلیل ہے۔

فخرالدین رازی نے کہا ہے کہ بہت سے مفسرین نے ھوالاول کو وحدت خدا کی دلیل قرار دیا ہے۔[1]

(۳) تیسری اور آخری آیت میں حضرت یوسفؑ اور دو قیدیوں کا ذکر ہے۔جو زندان میں آپ کے ساتھ تھے انہوں نے حضرت یوسفؑ سے اپنے خواب کی تعبیر دریافت کی تھی حضرت نے خواب کی تعبیر بتانے کے مسئلہ کو توحید باری تعالیٰ کے ساتھ منسلک کردیا کیونکہ توحید ہی تمام سعادتوں کی بنیاد و اساس ہے......آپ نے فرمایا: اے میرے قیدی ساتھیوں! متعدد معبود بہتر ہیں یا خدائے واحد وقہار بہتر ہے۔(یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ [۱۲:۳۹])

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ قرآن میں صفت قہار چھ بار استعمال ہوئی[2]

اور ہر موقع پر اسے واحد کے بعد ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ ان دونوں صفات میں ایک خاص رابطہ ہے اور قاہری بھی خدا کی وحدت اور یکتائی کی دلیل ہے(غور کریں)

حضرت یوسفؑ نے یہ مسئلہ ان کے وجدان کے سامنے پیش کیا کیونکہ حقیقت توحید (جیسے پہلے ذکر ہوچکا ہے) فطرت انسانی کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے۔اس لیے آپ نے فرمایا: تم بہت سے خداؤں کے قائل ہو کہ جن میں زمین، آسمان، آگ اور پانی کے الگ الگ خدا شامل ہیں پھر جن اور فرشتے بھی تمہارے معبود ہیں اور فرعون مصر بھی تمہارا خدا ہے۔علاوہ ازیں مٹی، پتھر، لکڑی اور بعض دھاتوں سے بنے ہوئے بت بھی تمہارے الٰہ ومعبود ہیں اور تم ان سب کی بندگی، پوجا اور عبادت کرتے ہو......اچھا تو بتاؤ کہ اتنے بہت سے خدا بہتر ہیں یا واحد قہار خدا کہ جس کی ہر جگہ حکمرانی ہے؟

قہار'' مبالغے کا صیغہ ہے جس کا مادہ قہر ہے......المفردات میں راغب اصفہانی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا معنی غلبہ کرنا اور فریق ثانی کی پستی کی طرف دھکیلنا ہے۔لیکن یہ لفظ ان دونوں معنوں میں علیحدہ علیحدہ بھی استعمال ہوا ہے مجمع البیان میں طبرسی کہتے ہیں۔

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ صفحہ ۲۱۳۔تفسیر روح البیان جلد ۹ صفحہ ۳۴۷۔

[2] ملاحظہ ہوں آیات۔۱۶۔رعد۔۴۸ ابراہیم۔۶۵ص ۴ زمر۔۱۶ غافر اور آیت زیر بحث۔

القاھر ھو القادر الذی لایمتنع علیه شیءٌ یعنی قاہر وہ صاحب قدرت ہے جس کے لیے کوئی چیز غیر ممکن نہیں اس سے وحدت اور قہاریت کے مابین رابطہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ جب ہم اس امر کے قائل ہو گئے کہ اس کی قدرت ہر چیز پر غالب یعنی غیر محدود ہے تو پھر اس کا ثانی اور دوسرا تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ اس لیے کہ جو بھی اس کا غیر ہے وہ اس کے سامنے مغلوب ہے اور جو مغلوب و مقہور ہوگا وہ واجب الوجود اور لامحدود نہیں ہوسکتا۔

# توضیحات

## (۱) خدا ایک لامتناہی حقیقت اور غیر محدود ہے:

سب سے اہم چیز جس کو باب صفات خدا میں ثابت کرنا ہے تا کہ مسئلہ توحید مشخص و ظاہر ہو اور صفاتِ الٰہی جیسے علم و قدرت وغیرہ ثابت ہوں...... وہ ہے ذات مقدس کا لامتناہی ہی ہونا۔ کیونکہ اگر یہ چیز ثابت ہو اور سمجھ میں آ جائے تو تمام صفات جمال و کمال (صفات ثبوتیہ وصفات سلبیہ) کے اثبات کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

ذاتِ خدا کے وجود کو غیر محدود ثابت کرنے کے لیے درج ذیل اُمور کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

(۱) محدودیت وجود یعنی عدم سے آمیزش کیونکہ اگر اس میں عدم نہ ہو تو محدودیت کا کوئی مطلب ہی نہ ہوگا مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں کی عمر محدود ہے یعنی اس کی عمر کی انتہا عدم پر ہوگی اس لیے کہ اس کے وجود میں نیستی و نابودی شامل ہے۔ پس علم و قدرت وغیرہ کی محدودیت کا بھی یہی حال ہے۔

(۲) وجود ضد عدم ہے اور جس کی ذات میں اقتضاء وجود پایا جاتا ہو۔ اس میں عدم کا گزر نہیں ہوتا۔

(۳) برہان علت و ملعول میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ علت و معلول کی زنجیر اس کائناتِ عالم میں ایک ایسے نقطے تک پہنچی چاہیے جو ازلی و ابدی ہو ہم اس کا نام واجب الوجود قرار دیتے ہیں۔ یعنی اس کا وجود اس کی ذات سے ہے خارج سے نہیں، اس لیے عالم موجودات کی علت اوّلیہ ذاتی طور پر اقتضاء وجود رکھتی ہے۔ ان تینوں مقدمات پر خوب غور وفکر کریں ان سے واضح ہو جائے گا کہ اگر ذات واجب الوجود ہو وہاں عدم و نیستی کا اقتضاء ہرگز نہیں ہوسکتا پس اگر محدودیت ہوگی تو وہ خارج سے آئے گی اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ چیز واجب الوجود نہ ہو کیونکہ وہ اپنے وجود میں غیر کی مخلوق اور معلول ہوگی۔

بہ الفاظ دیگر اس میں شک نہیں کہ اس کائنات میں ایک واجب الوجود ہے (توحید کی بحث اثبات وجود خدا کے بعد ہے) اگر واجب الوجود لامحدود ہو تو ہمارا مدعا ثابت ہو گیا اور اگر محدود ہے تو یہ محدودیت ذاتی نہیں کیونکہ ذات تو متقفی وجود ہے جس میں عدم کا شائبہ نہیں پس معلوم ہوا کہ محدویت خارج سے آئی ہے جس کا لازمہ یہ ہوگا کہ کوئی بیرونی علت ہے اور یہ ذات اس کا معلول ہے...... اس صورت میں وہ ذات واجب الوجود ہی نہ رہے گی۔ اس بناء پر یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ اس کا وجود ہر لحاظ سے غیر محدود ہے۔

## (۲) وجود غیر متناہی ولامحدود یقیناً ایک ہے:

سابقہ بحث میں ثابت ہوا ہے کہ خدا کا وجود لامحدود ہے......اب ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کی حقیقت میں دوئی نہیں ہوسکتی اور وہ یقیناً ایک ہے، کیونکہ بار بار واضح کر چکے ہیں کہ دو اشیاء غیر محدود ہوں ۔ یہ بات تصور میں بھی نہیں آ سکتی کہ دوئی تو محدودیت کا تقاضا کرتی ہے ۔ یہ چیز واضح روشن ہے کہ جب دو وجودوں کا تصور کیا جائے تو ان میں سے ہر ایک اپنے غیر سے الگ ایک وجود ہوگا اور کسی نہ کسی حد پر پہنچ کر تمام ہوجائے گا پھر وہاں سے دوسرے وجود کا آغاز ہوگا۔

ایک سادہ سی مثال ہے اس گفتگو کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ ایک نور روشنی کا تصور کرتے ہیں جو زمان ومکان، وسعت اور منبع کے لحاظ سے بلاقید وشرط ہے اور ہر پہلو سے غیر محدود ہے کیا اسی طرح کا کوئی دوسرا نور بھی قیاس کیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ ان میں سے ہم جس نور کا بھی تصوّر کریں وہی نور اوّل شمار ہوگا۔ مگر یہ کہ اس میں قید وشرط کا اضافہ کریں اور کہیں کہ وہ جو فلاں منبع سے اور فلاں جگہ پر ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں ہے کہ جب ہم کہیں خارج میں دونوں موجود ہیں تو اگر ان کا وقت وزمانہ اور جگہ ومکان دو ہیں یا منابع جدا جدا ہیں یا ایک کی روشنی زیادہ اور دوسرے کی کم ہے لیکن اگر وہ ان تمام پہلوؤں سے بلاقید وشرط ہوں تو پھر دو نہیں ایک ہی نور ہوگا۔ (غور کریں)

آیت کریمہ ومن یدع مع الله الهاً اٰخر لا برهان له به. فانما حسابهٗ عند ربه انه لایفلِح الكافرون۔ یعنی جو شخص خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے کہ جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل وبرہان نہیں اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہے وہ کافروں کو کبھی کامیابی نہیں دیتا۔ (مومنون ۱۱۷) شاید یہ آیت اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ خدا کے لیے کسی شریک کا تصورِ کسی استدلال کے قابل نہیں اس پر استدلال کیونکر قائم ہوگا۔ جب کہ یہ بات فرض بھی نہیں کی جاسکتی۔

## (۳) دلیل صرف الوجود اسلامی روایات میں:

برہان صرف الوجود ایک لطیف بیان کی صورت میں حضرت امام زین العابدینؑ کے فرمان میں موجود ہے۔ ان الله لا یوصف بمحدودیةٍ عظیم ربنا عن الصفة و کیف یوصف بمحدُودیة من لایحد۔ خدائے تعالیٰ کسی حد بندی کے ساتھ متصف نہیں (وہ ذات پاک کسی حد کو قبول نہیں کرتی) وہ اس قسم کی توصیف سے بلند وبالا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہ ہو وہ محدودیت کے ساتھ متصف ہوجائے [1]

دوسری روایت امام علی رضا علیہ اسلام کے فرمان پر مشتمل ہے: هو اجل من ان تدركه الابصار اويحيط به وهم ويضبطه عقل۔ وہ ذات اس سے برتر ہے کہ آنکھیں اسے دیکھ سکیں یا فکر اس کا احاطہ کر سکے یا عقل اسے کسی قید وشرط کے تحت لا سکے۔

---

[1] اصول کافی جلد ا صفحہ ۱۰۰، باب النہی عن الصفۃ حدیث ۲۔

سائل نے عرض کیا کہ پھر اس کی حد بیان فرمائیں، تب امامؑ نے ارشاد فرمایا۔

انه لایحد قال لم ؟ قال (ع) لان کل محدودٍ متناه الی حدٍ، فاذا احتمل التحدیدَ احتمل الزیادة واذا احتمل الزیادة احتمل النقصان فهو غیرُ محدودٍ، ولا متزائدٍ ولا متجزٍ ولا متوهمٍ۔

اس لیے کہ ہر متناہی ایک حد میں محدود ہوگا پس اگر اس کا وجود حد کو قبول کرلے تو زیارت کو بھی قبول کرلے گا۔ اگر وہ قابل زیارت ہوگا تو اس میں نقصان و کمی بھی ہو سکے گی۔ (جو زیارت و نقصان کے قابل ہو، وہ ممکن الوجود ہوگا) پس وہ ذات غیر محدود ہے، وہ نہ زیادت کو قبول کرتا ہے نہ اس کا تجزیہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی وہ وہم وخیال میں آسکتا ہے۔ [1]

---

[1] بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۱۵ حدیث ۱۔

# دلیل فیض و ہدایت
# تمام انبیاءؑ نے توحید خدا کی دعوت دی

## اشارہ:

خداوند قدوس وجود کامل ہے اور ایسا ہی وجود دوسروں کو فیض وکمال پہچانے والا منبع ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس طرح کا منبع کمال دوسرے موجودات کو اس سے محروم رکھے اور کم سے کم انہیں اپنا تعارف اور پہچان بھی نہ کرائے۔ جبکہ یہ معرفت ان کی ترقی وکمال کا سبب اور انہیں اس وجود کامل اور منبع فیض کی طرف لانے کا ذریعہ ہے۔

اس بیان سے واضح ہوا کہ اگر کئی ایک خدا ہوں تو ضروری ہوگا کہ ہر خدا کے رسول ہوں۔ جو مخلوق کو اپنے اپنے خدا کی پہچان کرائیں اور فیض تکوینی وتشریعی ان سب تک پہنچے، لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ سب رُسول ایک ہی خدا کی طرف دعوت دیتے رہے، پس معلوم ہوا کہ معبود بس ایک ہی ہے (کسی دوسرے معبود کا کوئی وجود نہیں ہے)

اس کے ساتھ ہی ہم قرآن کریم کی طرف آتے اور درج ذیل آیات پر غور کرتے ہیں۔

(۱) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۝۲۵ [۲۱:۲۵] (انبیاء)

(۲) وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِـهَةً يُّعْبَدُوْنَ۝۴۵ [۴۳:۴۵] (زخرف)

(۳) قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۴ [۴۶:۴] (احقاف)

## ترجمہ:

(۱) تم سے پہلے ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر یہ کہ ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری ہی عبادت کرو۔

(۲) تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے ہیں۔ان سے پوچھو کہ آیا ہم نے خدائے رحمان کے علاوہ ان کے لیے کچھ دوسرے معبود مقرر کیے تھے؟

(۳) ان سے کہو کہ تم خدا کے سوا جن معبودوں کو پکارتے ہو کیا تم سمجھتے ہو کہ انہوں نے زمین میں کوئی چیز خلق کی یا آسمانوں کی آفرینش میں ان کا کوئی حصہ ہے تو مجھے دکھاؤ،اس سے پہلے کی کسی آسمانی کتاب یا علمی آثار میں ایسی کوئی بات ہے تو وہ میرے سامنے لاؤ،اگر تم سچے ہو۔

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

## خدائے واحد کی طرف کے پیغمبروں کی عمومی دعوت:

(۱) پہلی آیت میں انبیاء سابق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: تم سے پہلے ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا۔مگر یہ کہ ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو(وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ الانوحی الیه انه لا اله الا انا فاعبدونِ)

ہاں تو تمام انبیاء سابق بھی توحید ہی کے مبلغ تھے انہوں نے انسانوں کو خدائے یکتا کی طرف دعوت دی جیسا کہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔یہ کیونکر ممکن ہے کہ شرک اپنی کوئی اصلیت رکھتا ہو اور پھر بھی سب انبیاء توحید کی طرف دعوت دیں۔

کیا کوئی اور خدا موجود تھا۔لیکن اس نے اپنی معرفت اور پہچان نہ کرائی اور اپنے فیض کو روکا یا اس کے مامور کیے ہوئے رسول نے اس کا پیغام پہچانے میں کوتاہی برتی؟ عقل سلیم ان میں سے کسی بات کو بھی قبول نہیں کرسکتی۔بعض مفسرین کا خیال ہے کہ سورۂ انبیاء میں پہلے دلیل عقلی سے استدلال کیا گیا ہے۔(لو کان فیهما اٰلهةٌ الا الله......) پھر دلیل نقلی پیش کی جو آیت زیر بحث میں مذکور ہے یعنی تمام پیغمبروں نے توحید کی طرف دعوت دی ہے اور یہ خود اس مسئلہ میں ایک اہم دلیل ہے [1]

(۲) دوسری آیت میں ہی بات ایک اور طرح سے کہی گئی ہے اور اس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کیا گیا ہے(اگرچہ مقصود پورا گروہ انسانی ہے) چنانچہ فرمایا: تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے ہیں،ان سے پوچھو کہ آیا ہم نے خدائے رحمان کے علاوہ ان کے لیے کچھ دوسرے معبود مقرر کیے تھے؟ (واسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا واجعلنا من دون الرحمن اٰلهةً یعبدون)

نبی اکرمؐ کو کیونکر انبیاء سابق سے پوچھنے کا حکم دیا گیا،جب کہ وہ آپ کے عہد میں موجود نہ تھے،اس بارے میں مفسرین نے کئی

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۶ صفحہ ۴۳۲۰

احتمالات ذکر کیے ہیں۔

بعض کے خیال کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ ان انبیاء کی امتوں سے سوال کریں تا کہ یہ مدعا خبر متواتر کے ذریعے سے ثابت ہوجائے، کیونکہ وہ امت جوتین خداؤں کا دم بھرتی ہے وہ بھی خود کو توحید کا پرستار کہتی ہے اور وہ لوگ اس کو تثلیث سے توحید کی طرف رجوع سے تعبیر کرتے ہیں......اصل میں اس آیت کا مفہوم سورہ یونس کی آیت ۹۴ کے مشابہ ہے کہ (فسئل الذین یقرئو ان الکتاب من قبلك) یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان انبیاء کی کتابوں کی طرف رجوع کریں جو اس وقت بھی ان کی امتوں کے پاس موجود ہیں اور کتابوں کے مطالعہ سے اس مسئلے کی حقیقت معلوم کرنا گو یا ان انبیاءؑ ہی سے پوچھنا ہے۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے پوچھنے سے مراد آپ کا ارواحِ انبیاء سے سوال کرنا ہے جو شب معراج اور اس کے علاوہ بھی ممکن ہے، کیونکہ روح پیغمبر اس قدر بزرگ و بلند ہے کہ اس کے لیے زمان و مکان کا فاصلہ اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتا، اور آپ کے لیے انبیاء سابق کی ارواح سے تماس و ملاقات ناممکن نہیں ہے۔

مگر اس لحاظ سے کہ یہاں مقصد اصلی مشرکوں کے مقابل استدلال کرنا ہے۔اس لیے پہلے اور دوسرے معنی مناسب رہیں گے، کیونکہ ارواح انبیاء کے ساتھ باطنی رابطہ اہل شرک کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔ پھر یہ باطنی رابطہ محض ذاتِ پیغمبر کے لیے مفید ہے حالانکہ یہ واضح ہے کہ توحید پر آپ کا ایمان اس قدر بلند درجہ رکھتا ہے کہ کسی سے سوال کرنے اور پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

تیسرے احتمال کو اس آیت کی تفسیر باطنی قرار دیا جا سکتا ہے اور اس بارے میں متعدد روایات میں واضح اشارے ملتے ہیں [1]

بہر حال اصل مطلب یہ ہے کہ نبی کریمؐ کا توحید کی طرف دعوت دینا کوئی نیا اور عجیب عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی دعوت ہے جس پر تمام انبیاء کا اتفاق ہے جو عقیدہ توحید کی صداقت پر ایک روشن دلیل ہے۔اس سلسلے میں یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ آیت زیر بحث میں خدا کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ''رحمان'' کو اختیار کیا گیا ہے۔یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہی خدائے واحد لائق عبادت ہے جو رحمت عام کا مالک ہے حتیٰ کہ کافر مشرک بھی اس سے محروم نہیں رہتے۔یعنی تمام انسان سر سے پاؤں تک اس کے احسان و کرم کے بحر نا پیدا کنار میں ڈوبے ہوئے ہیں......پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے ولی نعمت کو چھوڑ کر بتوں کا دامن جا پکڑے۔

## کیا شرک کے حق میں کوئی دلیل ہے؟

(۳) تیسری اور آخری آیت میں دلیل عقلی کو دلیل نقلی کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے۔ارشاد ہوا: ان سے کہو کہ تم خدا کے سوا معبودوں کو پکارتے ہو کیا تم سمجھتے ہو کہ انہوں نے زمین میں کوئی چیز خلق کی یا آسمان کی آفرینش میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ تو مجھے دکھا (وقل اریتم ماتدعون من دون الله ارونی ماذا خلقوا من الارض ام لهم شرك فی السموٰت)۔

اگر وہ حقیقی معنی میں خدا ہوتے تو انہیں مبداء فیض و کرم ہونا چاہیے تھا کم سے کم انہوں نے زمین کے کسی حصے کو پیدا کیا ہوتا یا آسمانوں

[1] تفسیر برہان جلد ۴ صفحہ ۱۴۷ ۔تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۶۰۶۔۶۰۷۔

کی خلقت میں تھوڑی بہت شرکت کرتے (وہ تو کچھ کر ہی نہیں سکتے) کیا یہ ممکن ہے کہ خدا معبود فیض وکمال سے خالی ہو؟ ایک اور پہلو سے دیکھیں کہ وہ کونسا پیغمبر آیا، کہ جس نے لوگوں کو دوسرے خداؤں کی طرف دعوت دی ہو پہلی کتابوں میں سے کوئی کتاب لاؤ یا اپنے بڑوں کا کوئی ایسا علمی نوشتہ دکھاؤ کہ جس میں ان معبودوں کی بندگی کرنے کی کمزور دلیل موجود ہو اگر تم سچے ہو۔(ایتونی بکتابٍ من قبل هذا آو اثارةٍ من علمٍ ان کنتم صٰدقین۔ اس تعبیر سے واضح ہے کہ توحید پر تمام انبیاء کا اجماع رہا ہے اور یہ خدا کی توحید واحدانیت پر ایک کھلی ہوئی دلیل ہے اس طرح ثابت ہوا کہ کتاب کائنات اور کتب انبیاء بھی توحید خداوندی پر مضبوط دلائل پیش کرتی ہیں پس توحید الٰہی ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کا انکار صرف کوئی بے عقل وخرد شخص ہی کرسکتا ہے۔

''اثارةٍ من علمٍ''میں''اثارةٍ''کا مادہ''اثر''ہے مقاییس اللغۃ کے مطابق الفظ کے تین معنی ہیں یعنی مقدم رکھنا یاد کرنا اور کسی چیز کا باقی ماندہ نشان واثر۔

یہی معنی تفسیر فخر رازی میں ایک اور صورت میں آیا ہے۔ اثار کے تین معنی ہیں یعنی باقی ماندہ علامت اور روایت......لیکن بہت سے مفسرین نے اس کا معنی''بقیہ''قرار دیا ہے۔ یعنی سابقہ علماء ودانشوروں کے علمی آثار، تاہم ان تینوں معنی کی بازگشت ایک مطلب کی طرف ہونا کچھ بعید نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب معانی ایک ہی بنیاد سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اور وہ ہے''ایک ایسی چیز جو کسی دوسری چیز کے وجود پر دلالت کرے[1]

# توضیحات

## فیض وہدایت اسلامی روایات میں

برہان فیض وہدایت قرآن مجید کے علاوہ روایات میں بھی مذکور ہے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے اپنے ہر دو عظیم فرزندان حضرت حسن وحسین علیہما السلام کو وصیت کرتے وقت اس برہان کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

واعلم یابنی انه لو کان لربك شریك لاتتك رسوله ولرایت اثار ملکهٖ وسلطانه، ولعرفت افعالهٗ وصفاته ولکنهٗ الهٌ واحدٌ کما وصف نفسَهُ۔

یعنی اے فرزند! آگاہ رہو کہ اگر تمہارے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھی رسول آتے، اس کی سلطنت وفرمانروائی کے آثار بھی دکھائی دیتے اور اس کے کچھ صفات وافعال بھی ظاہر ہوتے

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم جلد ا۔ مادۃ اثر۔

مگر یہ کہ وہ ایک اکیلا خدا ہے جیسا کہ اس نے خود بیان فرمایا ہے۔[1]

## توضیع:

خدا حکیم ہے......خداوندحکیم سے یقیناً فیض وہدایت کے آثار ظاہر ہوں گے، عالم تکوین اور عالم تشریع ہر دو میں یہ آثار ہویدا ہیں۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ کوئی دوسرا خدا بھی موجود ہو جبکہ ہم اس وسیع کائنات میں اس کی کسی صفت کا اظہار نہیں دیکھتے نہ ہمیں اس کے رُسولوں کا کوئی نشان دکھائی دیا۔ یہ صورت خدا کے حکیم ہونے کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی کہ اس طرح انسان اس کی شناخت اور اس کی عظمت کے تصور سے محروم رہیں گے۔

علاوہ ازیں اگر خدا واقعی دو ہوتے تو سب انبیاء کا ایک ہی خدا کا تذکرہ کرنا کچھ مناسب نظر نہیں آتا، کیا یہ ممکن ہے کہ سبھی انبیاء ایک خدا کی طرف دعوت دے کر (نعوذ باللہ) غلط بیانی کرتے رہے اور وہ خدا جس نے انہیں بھیجا وہ ان کو حقیقت کے خلاف توحید کی دعوت دینے پر مامور کرتا رہا ہے۔ یہ بات خدا کے حکیم ہونے کے ساتھ سازگار نہیں لہٰذا خدا ایک ہی ہے کہ جس کی خبر تمام انبیاء نے دی ہے۔ البتہ خدا کی توحید کے اثبات کے لیے فقط یہی ایک دلیل نہیں، اس کے علاوہ اور بھی دلائل ہیں۔ جن کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے، بہر حال اجماع انبیاء بھی وحدت خدا کی ایک مستقل دلیل ہے۔

# (۵) برہان ترکب

فلاسفہ اور علماء علم کلام نے وحدتِ خدا کے اثبات میں ایک پانچویں دلیل بھی پیش کی ہے اس کے لیے ہمیں قرآن مجید کی صریح آیت نہیں مل سکی لہٰذا اسے توضیحات کے ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔ اگر خدا کا کوئی شریک ہو تو وجود میں وہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے، لیکن ان میں پائی جانے والی دوئی کا تقاضا ہے کہ ان میں باہم فرق اور افتراق بھی ہونا چاہیے تاکہ ایک دوسرے سے جدا جدا محسوب ہوں۔ گویا ان میں سے ہر ایک دو اجزاء سے مرکب ہوگا۔ ان میں ایک ما بہ الاشتراک (مشترک پہلو) اور ایک ما بہ الامتیاز (پہلوئے تفاوت) ہوگا۔ اس صورت میں کہنا پڑے گا۔ کہ ان دونوں میں سے ہر خدا اپنے اجزائے ترکیبی کا محتاج ہوگا۔ کیونکہ مرکب کا وجود اجزاء کے بغیر ممکن نہیں......جو محتاج ہو وہ واجب الوجود نہیں ہوسکتا اس لیے کہ واجب الوجود وہی ہوگا۔ جو بے نیاز ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح خدا کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح اس کے ایک سے زیادہ اجزاء بھی نہیں ہیں کیونکہ اگر اس کا کوئی شریک ہو تو پھر اس کے اجزاء بھی ہوں گے پس وہ (خدا) ہر لحاظ سے ایک بسیط وجود اور ہر پہلو سے لاشریک ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔

## توحید اور الدلہ ءنقلی:

اس سے پہلے اثبات توحید کے لیے جن پانچ دلیلوں کا ذکر ہوا وہ اس کی عقلی دلیلیں تھیں اس ضمن میں نقلی دلیلیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ اثبات وجودِ خدا اقرار نبوت پیغمبر اسلام اور ان کے صدق دعوت کا لازمہ ہے کہ اس آسمانی کتاب (قران کریم) میں جو کچھ بیان ہوا۔ وہ نا قابل انکار ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پیغمبر صادق وامین ہے، اس کو بھیجنے والا خدا صادق العقول ہے۔ پس یقین کامل ہو گیا کہ اس کتاب میں کوئی بھی بات خلاف واقع نہیں ہے۔

بنا بریں اثبات توحید میں آیات قرآن سے تائید حاصل کی جاسکتی ہے۔ قرآن تو اثبات توحید سے متعلق، آیات سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس میں کسی موضوع کا اس قدر تکرار نہیں جتنا توحید کے بارے میں ہوا ہے اور خدا کی کسی صفت پر اتنی تاکید نہیں جتنی توحید پر ہوئی ہے۔

بحار الانوار میں علامہ مجلسی رحمہ اللہ اس استدلال کے ضمن میں فرماتے ہیں: کتاب وسنت میں اثبات توحید کی نقلی دلیلیں بہت زیادہ ہیں اور باب توحید میں سب سے عمدہ اور مفید دلیل نقلی ہی ہے۔

وھذہ ھی المعتمد علیھا عندی۔[1]

لیکن یہ چیز کچھ کہے بغیر ہی ظاہر ہے کہ دلیل نقلی سابقہ عقلی استدلالات سے کوئی تناقض نہیں رکھتی کیونکہ دلیل عقلی کی بنیادیں خود کتاب وسنت میں موجود ہیں۔ پس اثبات توحید میں پیش کیے جانے والے دلائل عقلی ونقلی کا منبع ومصدر ایک ہی ہے اور وہ کتاب وسنت ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۳۴۔

# شِرک کے اہم سرچشمے شرک کا پہلا سرچشمہ

# اوہام کی پیروی

## اشارہ:

اس کے باوجود کہ فطرت انسانی توحید سے ہم آہنگ ہے جیسا کہ ہم نے بحث توحید کے آغاز میں کہا ہے۔ نیز عقلی و نقلی دلائل بھی اس فطرت کی تائید کرتے ہیں۔ انسان کیوں شرک کی خاردار وادیوں میں جا پھنستا ہے؟ انسان کے قلب و نظر جو فطرت خداشناسی پر خلق کیے گئے ہیں کیوں ان میں شرک آن گھستا ہے...... اب سوال یہ ہے کہ شرک کہاں سے اور کدھر سے آتا ہے؟

مختلف انبیاءؑ اور متعدد اقوام کی تاریخ کے مطالعہ سے طولِ زمانہ میں بت پرستوں کے دعوے سامنے آتے ہیں تو شرک پر سے پردہ اُٹھنے لگتا ہے۔ اور شرک کے اصل سرچشمے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ شرِک کے سرچشمہ کی شناخت اس بہت بڑی آفت کا مقابلہ کرنے میں موثر ہوگی کیونکہ مرض کی پہچان کے بعد ہی اس کے علاج کا طریقہ واضح ہوتا ہے۔ اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے اور درج ذیل آیات پر نظر ڈالتے ہیں:......

(۱) وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ [۲۳:۱۱۷] (مومنون)

(۲) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَاۗءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾ [۱۲:۴۰] (یوسف)

(۳) وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾ [۲۲:۷۱] (حج)

(۴) اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِـعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ [۱۰:۶۶] (یونس)

(۵) وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶ [۱۰:۳۶] (یونس)

(٦) اِنْ هِىَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝۲۳ [۵۳:۲۳] (نجم)

(۷) اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِىَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِىْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۲۴ [۲۱:۲۴] [1]
(انبیاء)

## ترجمہ:

(۱) جو شخص خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے کہ جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہے وہ کافروں کو کبھی کامیابی نہیں دیتا۔

(۲) یہ معبود کہ خدا کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو، ان کی حیثیت اسماء (بلا مسمّیٰ) کے علاوہ کچھ بھی نہیں، تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے ان کو خدا قرار دے رکھا ہے۔ خدا نے ان کے لیے کوئی دلیل نازل نہیں کی، حکم کرنے کا حق تو صرف خدا ہی کو ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ کسی اور کی عبادت نہ کرو مگر اس کی یہی ہے آئین ثابت وقائم لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۳) یہ (مشرک) لوگ خدا کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور نہ یہ خود اباارے میں کوئی علم رکھتے ہیں، ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

(۴) آگاہ رہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا ہے، جو لوگ غیر خدا کو اس کا شریک بنا کر اسے پکارتے ہیں وہ ان شرکاء کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ اپنے وہم وگمان کی پیروی

---

[1] علاوہ ازیں بہت سی آیات ہیں جن کا مضمون ان آیتوں سے ملتا جلتا ہے۔

کررہے ہیں۔اور وہ بس جھوٹ ہی بولتے ہیں۔

(۵) ان میں سے اکثر بے بنیاد ظن وگمان کے سوا کسی کی پیروی نہیں کرتے حالانکہ ظن انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا (حق کی جگہ نہیں لے سکتا) بے شک خدا اس سے آگاہ ہے جو کچھ وہ کررہے ہیں۔

(٦) یہ بُت تو فقط نام ہی ہیں۔ جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے ان کے لیے قرار دے رکھے ہیں۔(جن کی کوئی اصلیت نہیں) خدا نے ان کے متعلق کوئی دلیل وحجت نازل نہیں فرمائی، یہ بت پرست فقط بے بنیاد گمانوں اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کررہے ہیں، حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے لیے ہدایت آچکی ہے۔

(۷) کیا اُنہوں نے خدا کو چھوڑ کر کچھ اور معبود بنا لیے ہیں، کہو کہ اس کے لیے اپنی دلیل لاؤ یہ میری اور ان انبیاء کی دعوت ہے جو مُجھ سے پہلے ہوگزرے لیکن ان میں سے اکثر لوگ حق کو نہیں جانتے پس وہ اس سے منہ موڑتے ہیں۔

## مفردات کی تشریح:

''ظن''، المفردات میں راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ ''ظن'' وہ کیفیت ہے، جو کسی چیز کے ملاحظہ سے پیدا ہوتی ہے۔اگر یہ قوی ہو جائے تو علم ہے اور ضعیف ہو تو محض خیال ہی ہے۔لسان العرب میں ابن منظور کہتا ہے کہ ''ظن'' شک اور یقین ہر دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایسا یقین نہیں جو روایت (دیکھنے) سے حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ یقین تدبر وتفکر سے ہوا کرتا ہے علم تو بس اسی یقین کو کہا جاتا ہے جو مشاہدے سے حاصل ہو۔نہایہ ابن اثیر میں ہے کہ ''ظن''، کبھی علم کبھی شک اور کبھی تہمت کے معنی میں ہوتا ہے۔لیکن آیات زیر بحث میں یہ لفظ بے بنیاد خیالات کے مفہوم میں آیا ہے(اس کے قرائن خود انہیں آیات میں موجود ہیں جن کا تذکرہ آگے چل کر ہوگا)

''خرص'' بروزن ''غرس'' ہے اور صحاح اللغۃ کے مطابق یہ درخت خرما سے حاصل ہونے والے خرما کی مقدار کا اندازہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، المفردات میں راغب اصفہانی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، پھر اس کا اطلاق ہر قسم کے تخمینہ واندازہ پر ہونے لگا، چونکہ اندازہ اور تخمینہ ہمیشہ درست نہیں ہوتا، اس لیے یہ لفظ جھوٹ کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور اصولی طور پر ہر بے بنیاد گمان پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

لفظ ''خرص'' کے مشتقات کے کچھ اور معانی بھی بتائے گئے ہیں جیسے ''نیزہ'' ''حلقہ'' ''حوض'' (وہ حوض جو نہر کے کنارے پر ہو کہ

اس میں نہر کا پانی آئے اور پھر لوٹ جائے) لیکن بعید نہیں کہ ان سب معانی کی بازگشت بے اساس و بے بنیاد ظن کی طرف ہو یعنی ایسا گمان جس میں تزلزل اور تذبذب ہو، مذکورہ بالا نیز حلقہ اور خاص حوض بھی یہی معنی رکھتے ہیں[1]

''برہان''، محکم اور قاطع دلیل کو ''برہان'' کہتے ہیں، یہ لفظ ہر طرح کی دلیل اور وضاحت کے لیے بھی بولا جاتا ہے، المفردات میں راغب اصفہانی لکھتا ہے...... برہان''، یعنی دلیل محکم، بعض ماہرین کا خیال ہے کہ لفظ ''برہان'' مادہ'' برہ'' (بہ معنی سفید ہونا) سے لیا گیا ہے پھر اس کا اطلاق ہر ایسے کلام واضح پر ہوا۔ جس میں کسی قسم کی کمزوری وسُستی نہ پائی جائے[2]

اسی طرح ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ الصدقۃُ برھانٌ یعنی صدقہ ایک محکم دلیل ہے، شاید اس لیے کہا گیا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ...... اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا صحت ایمان ویقین کی ایک مضبوط اور محکم دلیل ہے کیونکہ جب تک کسی انسان کو ایک عقیدے پر گہرا ایمان وایقان نہ ہو وہ اس کی خاطر اپنا مال خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

''سلطان''...... مقابیس اللغۃ میں کہا گیا ہے کہ اس لفظ کے معنی ایسی قدرت وقوت ہے جس میں تفوق وبرتری پائی جاتی ہو چونکہ قوی استدلال ایک شخص کی اپنے مدمقابل پر قاہریت اور غلبے کا سبب ہوتا ہے اس لیے لفظ ''سلطان'' مضبوط ومحکم دلیل پر بھی بولا جاتا ہے۔

''سلیط''...... یہ لفظ کبھی ''فصیح'' کے معنی میں ہوتا ہے کبھی اس انسان کو ''سلیط'' کہا جاتا ہے جو سر وصدا میں کامل ہو۔ نیز اسے ''بدزبان''، شخص کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسی عورتوں جو کو تسلیط'' کہتے ہیں، جو بدزبان ہوں...... یہ سب الفاظ مادہ ''سلطہ'' سے لیے گئے ہیں۔

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

## وادی اوہام میں جا پڑنا:

(۱) یہاں زیر بحث پہلی آیات میں مشرکین کے خودساختہ معبودوں، دیوتاؤں اور اتاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ ان بناوٹی خداؤں کے لیے ان لوگوں کے پاس کوئی دلیل نہیں بس یہ سب ان کے توہمات اور خام خیالیاں ہیں۔ ارشاد ہوا: جو شخص خدا کے سوا کسی معبود کو پکارے کہ جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہے وہ کافروں کو کبھی کامیابی نہیں دیتا۔ (ومن یدعُ مع اللہ الٰھاً اٰخرَ لا برھان لہ بہٖ فانما حسابہٗ عند ربہٖ انہ لا یفلح الکافرونَ)

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، مادہ خرص۔

[2] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔ اس مادہ سے فعل ''برھن۔ یبرھن، یا وصف ''مبرھن'' آتا ہے، ایسا اشتقاق انتزاعی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ''سلطان'' جو مادہ ''سلطان'' جو مادہ سلط'' سے ہے۔ سلطن یسلطِنُ کی صورت میں بھی آتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس مقام پر مشرکوں کو ملنے والی سزا کا ذکر نہیں ہوا اور صرف یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ یہ بہت بڑی تہدید اور دھمکی ہے۔ کیونکہ ایک عظیم وقاہر ذات ان سے حساب لینے والی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کا انجام بہت ہی بُرا ہوگا۔

اس آیت میں مذکورہ جملہ لا برھان لہ بہ واضح کر رہا ہے کہ شرک کی اصلاً کوئی دلیل عقلی ونقلی ہے ہی نہیں یہ نہ فطرت کے مطابق ہے نہ عقل ومنطق سے سازگار ہے بلکہ اس پر جس قدر غور کیا جائے اس کا بطلان اور واضح ہوتا جائے گا۔

''لا یفلح الکافرون'' کی تعبیر اپنی جگہ پر بڑی وسعت رکھتی ہے، یعنی کافر لوگ دنیا و آخرت میں کسی بھی طرح کی فلاح وکامیابی حاصل نہیں کر پائیں گے، جیسا کہ بے ایمان اشخاص کے بارے میں روزمرہ کا مشاہدہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے۔

# نامہائے بے اصل:

(۲) دوسری آیت میں یہی مفہوم ایک نئے پیرایہ میں ذکر ہو رہا ہے۔ جہاں حضرت یوسفؑ اپنے قیدی ساتھیوں سے کہہ رہے ہیں: یہ معبود کہ خدا کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو ان کی حیثیت اسماء (بلا مسمی) کے علاوہ کچھ بھی نہیں تم نے اور تمہارے بزرگوں نے ان کو خدا قرار دے رکھا ہے (ما تعبدون من دونہٖ الا اسمآءً سمیتموھا انتم واٰبآؤکم) اس کی دلیل یہ ہے کہ خدا نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی (ما انزل اللہ بھا من سلطانٍ)

اگر ان خداؤں کی کوئی حقیقت ہوتی تو ان کے لیے کسی دلیل کا ہونا ضروری ہے یہ امر محال ہے کہ کسی کے خدا کا شریک ہونے جیسی اہم بات بے سند وثبوت ہو، پس اس کے لیے کسی دلیل کا موجود نہ ہونا، خود اس کے شریک کے نہ ہونے کی دلیل ہے اس آیت کے اگلے جملے میں نتیجہ گفتگو کے طور پر کہا گیا ہے حکم کرنے کا حق تو صرف خدا ہی کو ہے۔ (ان الحکم الا للہ) اس نے حکم فرمایا ہے کہ کسی کی عبادت نہ کرو مگر اس کی (امر الا تعبدو الا ایاہٗ) یہی ہے آئین ثابت وقائم۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے (ذٰلک الدین القیم ولکن اکثر الناسِ لا یعلمون)۔

دراصل اس آیت کا ہر جملہ نفی شرک پر ایک واضح دلیل ہے...... ایک طرف کہتا ہے: خدا نے تمہارے خداؤں کے وجود رکھنے اور موجود ہونے کی دلیل نازل نہیں فرمائی۔

دوسری طرف یہ نکتہ بیان کرتا ہے: اس کائنات کی تدبیر اور اس پر حاکمیت کا حق تو صرف خدائے واحد کے ہاتھ میں ہے۔ جیسا کہ اس دنیا میں ایک نظام اور ایک تدبیر کے علامات بہت سی مناسبتوں کی صورت میں جا بجا نظر آتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ خدا نے تو خدائے واحد و یگانہ کی عبادت اور پرستش کا حکم دیا ہے کیا ایسا ممکن ہے کہ خدائے حکیم اپنے بندوں کو ایک غلط اور نادرست حکم دے رہا ہو؟

اس آیت کے آخر میں قول فیصل کے طور پر شرک کو جہالت اور نادانی کا نتیجہ قرار دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا...... لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے اور حق اور حقیقت کو نہیں جانتے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ بت پرستوں کا اعتقاد یہ تھا کہ خدائے قدوس نورِ اعظم ہے اور فرشتے اس نور کے تحت چھوٹے چھوٹے انوار ہیں۔ وہ ان انوار میں سے ہر نور کے مظہر اور نشانی کے طور پر ایک ایک بت بناتے اور اس کا کوئی سا نام رکھ لیتے پھر اس کو اپنا معبود قرار دیتے ،اور اس کی پوجا پاٹ کیا کرتے ،اس سے ظاہر ہے کہ وہ بت اور ان کے نام محض فرضی تھے اور وہ کوئی حقیقت وواقعیت نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا وہ اسماء بلا مسمیٰ کے سوا کچھ نہ تھے [۱]

اگر ہم مفسرین کے اس بیان سے صرف نظر کرتے ہوئے ان بتوں کو مظہر ونشانی کی بجائے خدا ومعبود بھی کہہ لیں تو بھی یہ اسم بے مسمیٰ ہی ہوں گے، کیونکہ پتھر اور لکڑی کے ان بے جان بتوں میں الٰہ اور معبود ہونے کی کوئی علامت موجود نہیں ہے۔

(۳) تیسری آیت کا مضمون بھی دوسری آیت سے مطابقت رکھتا ہے اس میں بت پرستوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے: یہ مشرک لوگ خدا کے ماسوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی (ویعبدون من دون الله مالم ینزل به سلطاناً)

یہ اصل میں دلیل نقلی نہ ہونے کا ذکر ہے جیسا کہ اس کے بعد کہا گیا: اور نہ یہ خود اس (بت پرستی کے بارے میں علم رکھتے ہیں (ومالیس لهم به علمٌ) پھر آیت کے آخر میں کہا: ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ وما للظالمن من نصیر) یعنی عذاب الٰہی کے ہنگام ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا نہ ہدایت ورہنمائی میں کوئی ناصر ویاور اور نہ انہیں کوئی عقلی دلیل میسر آئے گی ممکن ہے آیت کے مفہوم میں یہ تینوں تفسیریں جمع ہو جائیں۔

## اندازہ وتخمینہ پر بھروسہ

(۴) چوتھی آیت کے آغاز میں آسمانوں اور زمین کے خدا کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: آگاہ رہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا ہے۔ (الا ان الله من فی السمٰوٰت ومن فی الارض) ممکن ہے یہ تعبیر شرکوں کے اعتقاد کی طرف اشارہ کرتی ہو، کیونکہ وہ معترف تھے کہ آسمانوں اور زمین کا مالک خدا ہی ہے اور اس کے باوجود بتوں کی پرستش بھی کرتے تھے، نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عالم ہستی کے واحد نظام کی طرف اشارہ ہو جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں ایک مدبر حکمرانی کر رہا ہے...... پھر فرمایا: جو لوگ غیر خدا کو اس کا شریک بنا کر اسے پکارتے ہیں وہ (ان شرکاء کی) پیروی نہیں کرتے (وما یتبع الذین یدعون من دون الله شرکاءِ) بلکہ وہ اپنے وہم وگمان کی پیروی کر رہے ہیں (وہ اندازے لگا لگا کر باتیں بناتے ہیں) وہ بس جھوٹ ہی بولتے ہیں (

---

[۱] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۸ صفحہ ۱۴۱

ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون)[۱]۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ''یخرصون'' کا مادہ ''خرص ہے جس کا معنی اندازہ وتخمینہ ہے اور سے جھوٹ کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔آیت زیر بحث میں اس کے ہر دو معنی لیے جا سکتے ہیں۔

(۵) یہی مفہوم پانچویں آیت میں بھی کچھ فرق کے ساتھ موجود ہے۔ بت پرستوں کی روگردانیوں کے تذکرے کے بعد فرماتا ہے ان میں سے اکثر بے بنیاد ظن وگمان ہے سوا کسی کی پیروی نہیں کرتے۔ حالانکہ ظن انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا (حق کی جگہ نہیں لے سکتا)......وما یتبع اکثرھم الا ظناً ان الظن لایغنی من الحق شئیاً) پھر ان خام خیالیوں کے پیچھے چلنے والوں کو دھمکی دی گئی ہے فرمایا: بے شک خدا اس سے آگاہ ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں (ان اللہ علیم بما یفعلون) ہاں تو ظن وتخمین اور تخیلات وتوہمات سبھی اندھیرے میں تیر چلانے کی مانند ہیں جو انسان کو اصل ہدف ومقصد تک نہیں پہنچاتے۔ اگر کبھی یہ درست بھی نکلیں تو پھر بھی ان سے مقصد ومنزل کی پہچان نہیں ہوگی۔ اور یہ فقط ایک اتفاقیہ امر ہی شمار ہوگا۔

''ظن'' لغت کے اعتبار سے ظن ہر قسم کے گمان، خیال اور وہم کو شامل ہے کبھی یقین پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔لیکن آیت مورد بحث میں پہلے معنی ہی مراد ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت میں وہم وگمان کی پیروی کو اکثریت سے منسوب کیا ہے اور سب کو اس میں شامل نہیں کیا گیا......اس بات کی طرف بہت سے مفسرین نے ضروری توجہ دی ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہاں اکثر سے وہ سبھی مراد لیے گئے ہیں لیکن اس تعبیر کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اس مقام پر اکثر سے اکثر ہی کو مراد لیا جائے کیونکہ اکثریت ہمیشہ بے خبر اور نادان ہوتی ہے چنانچہ اکثر لوگ تصورات وخیالات سے متاثر ہوتے اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان کے مقابل ایک گمراہ اقلیت ہوتی ہے اور یہ گنے چنے افراد رہبروں اور رہنماؤں کی حیثیت سے ان بے چاروں کو خطا وغلطی کی طرف دھکیلتے ہیں[۲]

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ''اکثر'' سے مراد وہ جمعیت ہے جو ساری زندگی وہم وگمان ہی میں پڑے رہتے ہیں اور شرک بھی ان توہمات

---

[۱] اس تفسیر کے مطابق ''ومایتبع'' میں ''ما'' نافیہ ہے اور ''یتبع'' کا فاعل ''الذین'' ہوگا جس کا مفعول ''شرکاء'' ہے یعنی مشرک درحقیقت ان کی پیروی نہیں کرتے جن کو وہ خدا کے شریک ٹھہراتے ہیں (کیونکہ خدا کا شریک تو کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ فقط ان لوگوں کے وہم وخیال کی گڑھت ہے) لیکن بعض مفسرین کے بقول یہاں ''ما'' استفہامیہ ہے اب اس جملے کے معنی یہ ہوں گے مشرکین کس چیز کو خدا کا شریک قرار دیتے اور کس کی پیروی کرتے ہیں، کیا یہ وہم گمان کے سوا بھی کچھ ہے؟ البتہ ان دونوں تفسیروں کا نتیجہ قریباً ایک ہی ہے............تفسیر مجمع البیان، تفسیر کبیر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر کشاف اور تفسیر روح المعانی میں زیر بحث آیت کی طرف رجوع کریں۔ بعض نے ''ما'' کو موصولہ کیا ہے لیکن یہ خیال بعید نظر آتا ہے۔

[۲] تفسیر روح البیان جلد ۴ صفحہ ۴۵ ۔تفسیر روح المعانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۳ میں بھی قریباً یہی معنی لیا گیا ہے۔

میں سے ایک تو ہم ہے، یہ لوگ ہمیشہ بے بنیاد خیالات اور اوہام کی تاریکیوں میں ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں[۱]

(۶) چھٹی آیت کا مضمون دوسری آیت کے مشابہ ہے جیسا کہ فرمان ہوا: یہ بت تو فقط نام ہی ہیں جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے ان کے لیے قرار دے رکھے ہیں۔ خدا نے ان کے متعلق کوئی دلیل و حجت نازل نہیں فرمائی (ان ھی الا اسماءٌ سمیتموھا انتم واٰبآئو کم ما آنزل اللہ بھا من سلطٰنٍ)

آیت کا یہ جملہ ان مشرکوں میں پائی جانے والی اندھی تقلید کی واضح طور پر نشاندہی کر رہا ہے۔ کہ وہ لوگ آنکھ کان بند کیے نادانیوں میں پڑے ہیں۔ پھر فرمایا: یہ بت پرست فقط بے بنیاد گمانوں اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ (ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس)[۲]

اس جملے میں ایک نیا نکتہ وہم وگمان پر ہوٰنفس کا عطف ہے اور یہ بڑی پر معنی تعبیر ہے اس میں یہ اشارہ ہوا ہے کہ ان کے اوہام وتصورات کا سرچشمہ ان کی خواہش نفس ہے جو باطل کو ان کے سامنے حق کے طور پر پیش کرتی ہے، حقیقت میں وہ اپنی خواہش نفس کے بت کی پرستش کرتے ہیں اور یہ پتھر اور لکڑی کے بت اسی کے زیر اثر بنائے گئے ہیں۔

گویا ان مشرکوں کی گمراہی وانحراف اور بت پرستی کے دوسبب میں اوّل عقلی واعتقادی لحاظ سے یقین سے کام نہ لینا اور خیالی باتوں پر بھروسہ رکھنا، دوم میلان ورجان کے لحاظ فطرت توحیدی سے صرف نظر کرنا اور ہوائے نفس کی پیروی کرنا۔

یہ چیز بھی خاص توجہ چاہتی ہے کہ "یتبعون" اور "تھوی" ہر دو فعل مضارع میں، اس لحاظ سے معنی یہ ہوں گے کہ وہ (مشرک) ہوائے نفس اور ذاتی خواہشوں کی پیروی کرنے میں روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں اور ان کا وہم وگمان انہیں نئی سے نئی صورت میں یہ افعال جاری رکھنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آیت کے آغاز میں روئے سخن مشرکوں کی طرف تھا۔ لیکن آخر آیت میں انہیں ضمیر غائب سے یاد کیا گیا ہے (اس کو اصطلاح میں حاضر سے غائب کی طرف التفات کا نام دیا جاتا ہے) اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ وہ لوگ اتنے پست اور بے وقعت میں کہ مخاطب کیے جانے کے قابل ہی نہیں ہیں۔

(۷) زیر بحث ساتویں اور آخری آیت میں یہی حقیقت ایک اور انداز میں بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوا کیا انہوں نے خدا کو چھوڑ کر کچھ اور معبود بنا لیے ہیں؟ (ام اتخذوا من دونہ الھۃ") ان سے کہو کہ اس کے لیے اپنی دلیل لاؤ (قل ھاتو برھان نکم) یعنی جو کچھ تم کر رہے ہو، جب تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں تو یہ فعل سراسر باطل اور غلط ہے۔

پھر ان کے عقیدے کا بطلان کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ میری اور ان انبیاء کی دعوت ہے، جو مجھ سے پہلے ہو گزرے (ھذا ذکر من

---

[۱] تفسیر رُوح المعانی میں بھی یہی احتمال دیا گیا ہے۔

[۲] ممکن ہے جملہ "ماتھوی الانفس، میں "ما" موصولہ ہو یا مصدرہ۔ پہلی صورت میں ان کی یہ پیروی ہوائے نفس کے تحت ہے، دوسری صورت میں خود یہ پیروی ہی ہوانفس ہے...... یہ دونوں معانی قریب قریب ایک کی بنیاد رکھتے ہیں۔

معی وذکر من قبلی)اس کا مطلب یہ ہے کہ میری اور مجھ سے پہلے کے انبیاء کی کتابیں تمہارے سامنے ہیں۔انہیں دیکھو اور پڑھو کیا ان میں شرک کی تائید میں کوئی ایک لفظ نظر آتا ہے؟ہاں ان آسمانی کتابوں میں تو خالصِ توحید اور خدا کی یکتائی کی دعوت وتعلیم ہے۔[1]

آسمانی کتابوں کو ذکر کے نام سے موسوم کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سبھی کتابیں انسانوں کو نصیحت کرنے اور ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے نازل کی گئی ہیں۔بعض مفسرین نے ذکر کے اور معنی بھی بیان کیے ہیں لیکن وہ مناسب حال نہیں ہیں۔

آیت کے آخر میں اسی مطلب کی مزید تاکید کے لیے فرمایا:لیکن ان میں سے اکثر لوگ حق کو نہیں جانتے پس وہ اس سے منہ موڑتے ہیں(بل ا کثرھم لا یعلمون الحق فھم معرضون)۔اگرچہ ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ حق سے آگاہی رکھتا ہے لیکن وہ اپنے ناجائز فوائد ومنافع کو بحال رکھنے کی خاطر اظہارحق سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا سات آیات سے مجموعی طور پر نتیجہ بخوبی نکالا جاسکتا ہے کہ شرک یعنی دو یا اس سے زیادہ خداؤں کی پرستش کے لیے کوئی عقلی ونقلی دلیل موجود نہیں ہے۔محال ہے کہ ایک اتنے اہم موضوع کے لیے کوئی دلیل نہ ہو۔پس دلیل نہ ہونا شرک کے بطلان پر ایک ناقابلِ تردید دلیل ہے۔

---

[1] اس آیت میں دلیل نقلی سے استدلال کیا ہے۔جب کہ اس سے پہلے ذکر شدہ دو آیتوں میں دلیلِ عقلی اور برہان تمانع سے تائید حاصل کی گئی ہے۔

# شرک کا دوسرا سرچشمہ، حسی میلان ورغبت

## اشارہ:

جب انسان اس دنیا جہان میں آنکھ کھولتا ہے تو وہ اپنے حواس خمسہ یعنی دیکھنے، سننے، چکھنے، ٹٹولنے اور سونگھنے کے ذریعے اپنے گردوپیش کی اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے اور انہیں کو اپنے علم وخبر کی اساس قرار دیتا ہے۔ پھر جوں جوں اس کے علم ودانش میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ تدریجاً مسائل عقلی وفکری سے واقف ہوتا ہے۔

لیکن کچھ لوگ اپنی علمی پسماندگی کے باعث محسوسات ہی پر رُک جاتے ہیں۔ اس کے بعد نہ انہیں کسی چیز کا علم ہوتا ہے اور نہ وہ اس پر ایمان لا سکتے ہیں۔ اس بناء پر وہ چاہتے ہیں کہ خدا کا وجود حسی ہو کہ وہ اسے دیکھیں اور اپنے ہاتھوں سے مس کریں۔

طول تاریخ میں خدایان محسوس اور بت پرستی کا سب سے اہم سرچشمہ یہ حسی میلان ورغبت ہی رہا ہے، اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن عظیم کی طرف متوجہ ہوتے اور درج ذیل آیات پر غور کرتے ہیں۔

(۱) وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ۝۲۱ [۲۵:۲۱] (فرقان)

(۲) يَسْـَٔــلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۱۵۳ [۴:۱۵۳] (نساء)

(۳) وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَي الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳۸ [۲۸:۳۸] (قصص)

(۴) وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝۹۰ [۱۷:۹۰] اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝۹۱ [۱۷:۹۱] اَوْ

تُسۡقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمۡتَ عَلَيۡنَا كِسَفًا اَوۡ تَاۡتِىَ بِاللّٰهِ وَالۡمَلٰۤٮِٕكَةِ قَبِيۡلًا ۙ‏﴿۹۲﴾

(اسراء)

(۵) هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَالۡمَلٰٓٮِٕكَةُ وَقُضِىَ الۡاَمۡرُ ‌ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۲۱۰﴾ [۲:۲۱۰] (بقرة)

## ترجمہ:

(۱) جو لوگ ہمارے حضور پیش ہونے کی فکر نہیں رکھتے (روز قیامت کے منکر ہیں) وہ کہتے ہیں کیونکہ فرشتے ہم پر نازل ہوتے ہیں یا ہم اپنے پروردگار کو ان آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے؟ انہوں نے اپنے بارے میں بڑا گھمنڈ کیا اور طغیان و سرکشی میں حد سے گزر گئے۔

(۲) اہل کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ آسمان سے ایک کتاب ان پر یکبارگی نازل کردو (یہ تو صرف ایک بہانہ ہے) کیونکہ حضرت موسیٰ سے انہوں نے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا، کہ ہمیں ظاہر بظاہر خدا کی دید کراؤ، اس ظلم اور غلط روش کے سبب آسمانی بجلی نے اُنہیں آ لیا۔ پھر باوجود کہ ان کے لیے روشن دلائل آ چکے تھے، انہوں نے گوسالۂ سامری کو اپنا معبود بنایا، لیکن ہم نے ان کو معاف کردیا اور موسیٰ کو واضح برتری عطا فرمائی۔

(۳) فرعون نے کہا اے زعماء دربار! میں اپنے سوا تمہارے لیے کسی اور خدا کو نہیں جانتا (لیکن تحقیق مزید کی خاطر) اے ہامان میرے لیے زمین پر آگ جلاؤ (اینٹیں پکاؤ) پھر میرے لیے ایک بڑا برُج بنادو تا کہ میں موسیٰؑ کے خدا کا پتہ چلاؤں۔ اگرچہ مجھے گمان ہے کہ موسیٰ جھوٹے ہیں۔

(۴) انہوں نے کہا کہ ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک تو ہمارے لیے (بنجر) زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کردے یا ہم پر آسمان سے سنگریزے گرادے، جیسا کہ تیرا خیال ہے یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ۔

(۵) بہت سے واضح دلائل کے باوجود) کیا وہ مشرک انتظار کررہے ہیں کہ خدا اور فرشتے بادلوں

کے سائے میں ان کے پاس آئیں گے (اور کوئی نئی دلیل دیں گے) جبکہ معاملہ انجام پا چکا اور تمام امور کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

## ہم خدا کو کیوں نہیں دیکھ سکتے:

(۱) پہلی آیت میں کافر ومشرک لوگوں کا قول نقل کیا گیا ہے۔ وہ لوگ یہ خیال کرتے تھے خدا جسم رکھتا ہے اور وہ قابل مشادہ ورویت ہے......ارشادہ ہوا: جو لوگ ہمارے حضور پیش ہونے کی فکر نہیں رکھتے۔ وہ کہتے ہیں کیوں فرشتے ہمارے پاس نہیں آتے (تاکہ ہم پیغام حق کو خود سنیں اور وہ پیغمبر کے گواہ ہوں) یا ہم اپنے پروردگار کو ان آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے (وقال الذین لا یرجون لقآء نالولآ اُنزل علینا الملیکۃ اونریٰ ربنا)۔

ان لوگوں نے پہلے تو فرشتہ وحی کے مشاہدے کا تقاضا کیا پھر اس سے بھی آگے نکلے اور خدا کو دیکھنے کا اظہار کرنے لگے، گویا غیر محسوس اور غیر مجسم خدا ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا معلوم ہوتا ہے کہ باتیں شرک وبت پرستی کے پیشواؤں کی طرف سے ہوتی تھیں جو حقیقت امر کو تو جانتے تھے لیکن عوام الناس کو غافل رکھنے کے لیے سب چیزوں کو حس ومشاہدے کی چار دیواری میں بند کر دیتے تھے۔ وہ اس طرح کی باتیں پیغمبر اکرمؐ کے سامنے کیا کرتے تا کہ اپنے گمان کے مطابق انہیں شکست دیں لہٰذا قرآن نے انہیں ان الفاظ میں یاد کیا کہ وہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور انہیں کسی باز پرس کا احساس ہی نہیں ہے اس لیے آیت کے آخر میں ارشاد ہوا: انہوں نے اپنے بارے میں بڑا گھمنڈ کیا اور طغیان وسرکشی میں حد سے گزر گئے۔ (لقد استکبر وافی انفسھم وعتو عتواً کبیراً)

مفسرین نے آیت زیر بحث کے بعد اس سلسلے کی آیتوں میں آیت ۲۷ کے نشان نزول میں کہا ہے کہ یہ مشرک سرداران قریش کے بارے میں نازل ہوئی۔

بہر حال آیت زیرِ بحث کے ذیل میں یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ ان لوگوں کے اس بہت بڑے مطالبے کا سبب ایک تو ان کا تکبر وغرور تھا۔ دوسرے ان کا طغیان وسرکشی کہ جس میں عناد وعداوت بھی شامل ہے اسی لیے انہوں نے فرمانِ حق سے روگرانی کی تھی یہ صرف مشرکین عرب ہی کا معاملہ نہیں، بلکہ آج بھی مغرور وسرکش ماہرین علوم عصر یہ تصورّ رکھتے ہیں۔ کہ ہر چیز کو تجربی لحاظ سے دیکھا جائے۔ یعنی حسی تجربے کے بغیر کوئی چیز قابل تسلیم نہیں ہے، چنانچہ وہ پکار پکار کر کہتے ہیں کہ جب تک خدا کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ ہم اس کا یقین واعتقاد نہیں کریں گے۔ اس لحاظ سے قدیم وجدید مشرکین کے یہ دونوں گروہ تکبر وغرور میں اندھے ہو کر حس ومادہ کی چار دیواری میں بند ہو کر رہ گئے ہیں حالانکہ حس ووجود اور مادہ ومادیات کے علاوہ کئی عوالم وجود رکھتے ہیں جو صرف دل کی آنکھوں سے ہیں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور خدا بھی حواس کی بجائے دل ہی میں آنے والی ذات ہے۔

## یہی سوال حضرت موسیٰ سے کیا گیا:

(۲) دوسری آیت میں یہود کے حیلے بہانوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اہل کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ آسمان سے ایک کتاب ان پر ایک بارگی نازل کر دو۔ (یسئلك اھل الکتاب ان تنزل علیھم کتاباً من السمآءِ) اس جملے کی تفسیر میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہاں ان لوگوں کی طرف سے طلب کی گئی کتاب سے مراد اوراق کی صورت میں تحریر ہے جس کو وہ آنکھوں سے دیکھیں اور ہاتھوں سے مس کریں[۱]

بجلی نے انہیں آ لیا (فاخذتم الصعقة بظلمھم) ہاں تو ان لوگوں نے بہانے تلاش کر کے اپنے اوپر ظلم کیا، اپنی عقل کو حس وتجربہ کی چاردیواری میں بند کر دیا اور اسے موقع نہ دیا کہ وہ اس محدود دنیا کے علاوہ حقائق کے وسیع عالم کی طرف پرواز کرے۔ اس وجہ سے ان پر آسمانی بجلی گری اور وہ نابود ہو گئے آخرکار حضرت موسیٰ کی دعا سے دوبارہ زندہ ہو گئے۔

لیکن یہ حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ آسمانی بجلی گرنے کے اس خوفناک واقعہ سے گزرنے پر بھی ان کے دل و دماغ میں بیداری پیدا نہیں ہوئی اور جب سامری نے انہیں گوسالہ پرستی کی دعوت دی تو انہوں نے اسے قبول کر لیا جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہوا: پھر باوجود یکہ ان کے پاس روشن دلائل آ چکے تھے۔ انہوں نے گوسالہ سامری کو اپنا معبود بنایا (ثم اتخذوا العجل من بعدِ ما جاءتھم البینٰتُ)

گویا انہوں نے غیر محسوس اور دکھائی نہ دینے والے خدا کو تسلیم وقبول نہ کیا اور ان کی روح اس مادی دنیا کے سوا عالم مجردات کی طرف پرواز کرنے سے قاصر رہی پھر بھی لطف خداوندی ان کے شامل حال ہوا جیسا کہ آخر آیت میں آیا ہے لیکن ہم نے ان کو معاف کر دیا اور موسیٰ کو واضح برتر عطا فرمائی (فعفونا عن ذلك واتینا موسیٰ سلطاناً مبینًا)

سلطان مبین سے مراد وہ واضح سرداری ہے جو خدائے حضرت موسیٰ کو دی اور اس طرح دلیل و منطق کے اعتبار سے مخالفین پر برتری وفوقیت عطا فرمائی، بعض مفسرین نے اسے صرف بحث واستدلال میں کامیابی قرار دیا ہے، جیسا کہ تفسیر مجمع البیان میں علامہ طبرسیؒ نے اسی تشریح کو اختیار کیا ہے[۲]

## مجھے آسمان پر جانے دو کہ خدا کو دیکھوں:

(۳) تیسری آیت میں یہی بات ہم فرعون کی زبان سے سن رہے ہیں جس سے مصر کے لوگوں کے افکار کا پتہ چلتا ہے، فرعون نے یہ گفتگو اس وقت کی جب حضرت موسیٰ کو جادوگروں پر کھلی برتری حاصل ہوئی اور ان کی شہرت مصر کے طول وعرض میں عام ہو گئی تھی۔ فرعون

---

[۱] اس تفسیر کو فی ظلال القرآن جلد ۲ صفحہ ۵۸۷ پر اختیار کیا گیا ہے فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں اسے ایک قول کے عنوان سے ذکر کیا اور مناسب قرار دیا بہرحال اس آیت کی دوسری تفسیر جو یہاں درج کی گئی وہ بھی اس سے منافات نہیں رکھتی

[۲] مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۱۳۴۔

نے سوچا کہ اب کوئی ایسی بات کی جائے کہ لوگوں کے دل ودماغ سے حضرت موسیٰ اوران کے معجزوں کا اثر زائل ہوجائے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا: فرعون نے کہا اے زعماء دربار! میں اپنے سوا تمہارے لیے کسی اور خدا کو نہیں جانتا (وقال فرعون یاایها الملاما علمیت لکم من الہٍ غیری[1])

مگر اس لیے کہ میں اہل تحقیق ہوں لہٰذا احتیاط کا دامن نہیں چھوڑوں گا، میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے کہ جس سے موسیٰ کا صدق وکذب ظاہر ہوجائے...... اے ہامان! میرے لیے زمین پر آگ جلاؤ۔ (اینٹیں پکاؤ) پھر میرے لیے ایک بڑا برن بنادو تا کہ میں موسیٰ کے خدا کا پتہ چلاؤں۔ (فاوقدلی یاھامان علی الطین فاجعل لی صرحاً لعلی اطلع الی الہٍ موسیٰ[2]

اگر چہ مجھے گمان ہے کہ موسیٰ جھوٹے ہیں (وانی لاظنهٔ من الکذبین)۔

اس میں شک نہیں کہ فرعون بڑا ہوشیار آدمی تھا، اس لیے ممکن نہیں کہ وہ اس بات کو سمجھ نہ رہا ہو کہ وہ خدا نہیں ہے اسی طرح وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خداوند آسمان کہنے میں موسیٰ کی مراد یہ ہے کہ خدا خالق آسمان ہے۔ نہ یہ کہ خدا آسمان پر رہتا ہے۔ بالفرض اگر آسمان ہی خدا کی جائے سکونت ہوتو پھر بھی ایک بلند سے بلند مینار کے ذریعے بھی وہاں پہنچا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ اونچے مقام پر سے آسمان کی بلندی ایسی ہی نظر آتی ہے۔ جیسی زمین سے نظر آتی ہے یہ ایسے مسائل نہیں تھے جو فرعون کے علم میں نہ ہوں یا وہ انہیں سمجھتا نہ ہو۔

لیکن فرعون کا مقصد کچھ اورتھا...... وہ چاہتا تھا کہ اس طرح کے مسائل پیدا کرکے لوگوں کے افکار وخیالات کو منتشر کردے جو حضرت موسیٰ کی طرف جھکے جارہے تھے۔ چنانچہ اس کا ارادہ ہوا کہ ایک بلند مینار کی تعمیر شروع کردینے سے وہ عوام کو بہت مدت تک اس میں مشغول رکھ سے گا۔ جب سینکڑوں افراد اس پر کام کرکے مال ودولت بھی کمائیں گے پھر جب یہ مینار بن چکے گا تو وہ خود اس کی بلندی تک پہنچے گا۔ اور واپس آکر بتائے گا کہ مینار کے اوپر جاکر بھی مجھے موسیٰ علیہ السلام کے خدا کا کوئی نشان نہیں ملا۔ تاہم ان سب باتوں سے ایک چیز واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مصر کے عوام کے افکار کتنے پست تھے۔ کہ وہ محسوس ہونے اور نظر آنے والے خدا کے سوا کسی ان دیکھے اور حقیقی خدا کے وجود کو باور ہی نہیں کرتے تھے جس طرح وہ فرعون کو اپنا آلہ ورب مان رہے تھے اس طرح یہ خیال کرتے تھے کہ موسیٰؑ کا خدا بھی ظاہری ومادی جسم رکھنے والا اور اس آسمان کی بلندیوں پر مقیم ہوگا...... ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے اور ماحول میں بت سازی اور بت پرستی کا رواج ہوتا ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں مشرکوں کی گفتگو، حیلے بہانے اور عجیب وغریب اعتراضات ہیں جو وہ رسول اکرمؐ پر وارد کرتے تھے...... قرآن کہتا ہے انہوں نے کہا ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائے گے۔ جب تک تو ہمارے لیے (بنجر) زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کردے۔

(وقالولن نومن لك حتیٰ تفجر لنا من الارض ینبوعاً[3])

---

[1] صاحبانِ لغت کہتے ہیں کہ لفظ ''ملاء'' اس گروہ پر بولا جاتا ہے، جن کا عقیدہ ایک ہو اوران کا ظاہر آنکھوں کو پر کررہا ہو۔ اس کا مادہ ''ملا'' بروزن ''مرذ'' ہے اور اس کے معنی پر ہانا ہے اس لیے یہ لفظ ایک قوم کے روساء اور بادشاہ کے درباریوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[2] ''صرح'' کھوٹ سے پاک، پھر اس کا اطلاق بلند وبالا محلات پر ہوا، اس طرح کہ محل کو ایسا مکمل بنایا جس میں کوئی نقص وعیب نہیں۔

[3] ینبوع کا مادہ نبع بروزن طبع ہے جس کا معنی چشمہ آب ہے۔

بعض مشرکین نے ایک اور بہانہ تراشا اور کہنے لگے: یا ہم پر آسمان سے سنگریزے گرادے جیسا کہ تیرا خیال ہے (او تسقط اسماء کما زعمت علینا کسفاً)...... یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ (او تاتی باللہ والملآئکۃِ قبیلاً[1])

ان مشرکوں کا آخری تقاضا واضح طور پر بتا رہا ہے کہ یہ لوگ خدا کی جسمیت کے قائل ومعتقد تھے اور وہ چہار دانگ عالم میں جسم و مادہ کے علاوہ کسی کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، بعض مفسرین کا خیال ہے کہ فرشتوں کی آمد کے سوال میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ وہ آئیں اور خدا کی مدد کریں[2] یا یہ کہ فرشتے آ کر خدا کی الوہیت کی گواہی دیں اس سے بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ ان بہانہ تراشیوں کے سلسلے میں ان لوگوں کے فکر وخیال کس قدر پست اور لغو تھے۔

## وہ منتظر ہیں کہ خدا ان کے پاس آئے:

(۵) یہاں تک کہ پانچویں اور آخری آیت میں مشرکوں اور کافروں کے پست خیالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: کیا وہ مشرک انتظار کر رہے ہیں کہ خدا اور فرشتے بادلوں کے سائے میں ان کے پاس آئیں گے۔(ھل ینظرون الا ان یاتھم اللہ فی ظللٍ من الغما م والملئکۃُ)[3]

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے اور اس کی تفسیر محکمات کے مطابق کی جانی چاہیے[4]

اس کے علاوہ بعض مفسروں نے اس آیت کی سات مختلف تفسریں بیان کی ہیں[5]

گویا اس آیت کے بارے میں ان کا تصور کچھ اس طرح کا تھا کہ ایک دن ایسا بھی ہوگا۔ جب خدائے تعالیٰ اور اس کے فرشتے بادلوں کے سائے میں زمین پر اُتر پڑیں گے لیکن یہ بات قرآن کی آیتِ صریحہ کے خلاف ہے۔ (کہ خدا جسم وجسمانیات سے مبرا و پاک ہے) لہٰذا اس کی کوئی مناسب حال تاویل ہونی چاہیے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا مفہوم ومطلب ان خیال آرائیوں سے یکسر جدا اور الگ ہے چنانچہ اس میں انکار استفہامی کی صورت میں بات کی گئی ہے۔مثلاً اس طرح کہ کچھ لوگ حصولِ علم میں سستی کرتے ہوں اور آپ ان سے کہیں کہ کیا تمہیں اس وقت کا انتظار ہے کہ علم لقمہ کی صورت میں تمہارے منہ میں ڈالا جائے گا؟

---

[1] لفظ قبیل کبھی بمعنی مقابل کفیل، شاہد اور کبھی جماعت وگروہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور آیت میں تینوں معنی قابلِ قبول ہیں۔

[2] تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۳۵۹۔

[3] مفسرین کا اتفاق ہے کہ ”نظر“ کے معانی میں ایک معنیٰ ”انتظار“ بھی ہے (تفسیر فخر رازی جلد ۵ صفحہ ۲۱۲)

[4] تفسیر المیزان جلد ۲ صفحہ ۱۰۵۔

[5] تفسیر فخر رازی جلد ۵ صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۶۔

مذکورہ آیت بھی یہی کہہ رہی ہے...... کیا ان کو انتظار ہے کہ خدا وفرشتے ان کی ملاقات کو آئیں گے اور ان کے سامنے کھڑے ہوکر گواہی دیں گے؟ ان کا یہ انتظار کس قدر بے بنیاد اور نادرست ہے کہ خدا کا جسم ومکان کا جسم ومکان اور اس کی آمدورفت تو ممکن ہی نہیں ہے پس اس آیت کا مفہوم واضح اور صاف ہے اور اس میں کسی پیچیدہ اور دقیق تفسیر کی قطعاً ضرورت نہیں اور نہ اسے متشابہات میں شمار کرنے کی حاجت ہے۔

آخر آیت میں اس بہانہ ساز گروہ کی تہدید کے لیے کہا گیا...... یہ امر اپنے انجام کی پہنچ گیا(وَ قضی الامر)اوران لوگوں کو یقینا سزا ملے گی گویا کہ وہ انہیں مل چکی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جملے میں فعل ماضی استعمال کیا گیا ہے پھر فرمایا: اورتمام کاموں کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے(والی اللہ تُرجع الامور)

خدا کے مقابل کسی شخص کی کوئی طاقت وہمت نہیں اور نہ اس کے حکم کے سامنے کسی سرتابی کی مجال ہے لہٰذا جب وہ کسی گروہ کو سزا دینے کا ارادہ کرے تو گویا وہ واقع ہوگئی کیونکہ کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔ آیا سزا دیتے جانے کی یہ دھمکی قیامت سے تعلق رکھتی ہے یا اس دُنیا یا ان دونوں سے تعلق رکھتی ہے؟ یہ امر بعید نہیں کہ یہ سزا دنیا وآخرت دونوں ہی سے تعلق رکھتی ہو۔ کیونکہ آیت کے مفہوم میں وسعت ہے اور اس کے محض دنیا یا آخرت تک محدود ہونے کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔

ان پانچوں آیات کی تفسیر میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ طول تاریخ میں انبیاء سابق کی قوموں کے محسوس معبودوں کی طرف میلان کے نتیجے میں وہ نقطۂ توحید سے ہٹ کر عقیدۂ شرک سے وابستہ ہوتی رہی ہیں، یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا پھر وہ قومیں جو علمی وفکری لحاظ سے پسماندہ تھیں۔ یا طاغوتوں اور منکرین خدا کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے باعث خدا شناسی کو محسوسات ہی میں منحصر سمجھتی تھیں...... انہوں نے فطرت خدا شناسی کا رُخ خودساختہ خداؤں اور قسم قسم کے بتوں کی طرف موڑ دیا تھا......

چنانچہ تاریخ انسان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیدہ شرک کا سب سے بڑا عامل یہی رہا ہے کہ لوگ وجود کو صرف محسوس وجود کا تصور ان کے دل ودماغ میں سماتا ہی نہ تھا۔

# توضیحات

## صرف عالمِ محسوسات ہی پر کیوں تکیہ کرتے ہیں؟

یہ ایک واضح بات ہے کہ ابتدائی طور پر انسانی معلومات کی بنیاد حس وحواس پر ہی ہوتی ہے، جب ایک انسان پہلی بار آنکھ کھولتا ہے تو اس کی نظر اس مادی دُنیا پر پڑتی ہے اور وہ اس عالمِ محسوسات سے آشنا ہوتا ہے۔ اس کی توجہ ماوراء حواس موجودات کی طرف سے وقت ہوگی۔ جب وہ مسائل عقلی وفکری اور معاملاتِ روحانی کا تجزیہ وتحلیل کرے گا وگرنہ وہ ایک ایسے وجود کا تصور نہیں کرسکے گا۔ جو مادہ ومدیات اور زبان ومکان سے مبرا ہو اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ فکری وعلمی طور پر پسماندہ قوموں نے بت پرستی کو اپنا مذہب بنا رکھا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف ان کی فطرت انہیں خدا پرستی کی سمت بلا رہی ہے معرفت خدا کا جاذبہ انہیں دعوت دے رہا ہے اور

دوسری طرف وہ اس جہان میں محسوسات و مادیات کا غلبہ دیکھ رہے ہیں اس لیے زبان و مکان سے مبرا خدا کی معرفت ان کے لیے مشکل ہوجاتی ہے۔ پس وہ بت پرستی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور اپنی پیاسی روح کو خیالی معبودوں اور مندروں کے مہنت اور اکثر حاکمان طاغوت بت پرستی کی رسوم سے مالی فائدے حاصل کرتے ہیں اس لیے وہ بھی ان خیالات کو عام کرتے اور آگے بڑھاتے ہیں بلکہ وہ بت سازی و بت پرستی کو اپنے ملک کا سرکاری مذہب بنا ڈالتے ہیں اور اس کو ترقی دیتے ہیں۔

حقیقت میں یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بعض قائلین توحید بھی ان خیالات سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ مثلاً عام لوگ قسم کھاتے وقت کہتے ہیں کہ اس خدا کی قسم جو آسمان میں ہے یا دعا مانگتے ہوئے اپنے ہاتھ اور چہرہ آسمان کی طرف بلند کرتے ہیں...... گویا کہ ایسے خدا کی طرف اشارہ کررہے ہوں جو آسمان میں رہتا ہے اور فرشتے اس کے چاروں طرف کھڑے رہتے ہیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ خدائے تعالیٰ آسمان میں سکونت پذیر نہیں ہے وہ نہیں جانتے کہ ہاتھوں کو بلند کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ خدا وہاں رہتا ہے بلکہ یہ عاجزی اور بے چارگی کی علامت ہے یا جیسا کہ روایات میں ہے کہ وقت دعا ہاتھوں کو اس لیے بلند کیا جاتا ہے کہ تمام نعمتیں آسمان ہی سے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر بارانِ رحمت اور سورج کی روشنی کہ جو انسانی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں...... گویا آسمان کی طرف توجہ خالق کی معنوی بلندی کی طرف توجہ کرنے کے مترادف ہے۔

بہرحال جب تک فکر انسانی میں بلندی نہ آئے۔ اس وقت تک اس کا شرک سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔

مقام غور ہے کہ بنی اسرائیل جن کی تربیت ایک طویل مدت تک حضرت موسیٰؑ ایسے اولوالعزم پیغمبر کے مکتب توحید میں ہوئی۔ انہوں نے فرعون سے نجات اور دریائے نیل کا معجزانہ عبور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا...... اس کے باوجود جب وہ بت پرستوں کے قریب سے گزرے اور بتوں پر نظر پڑی تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے لیے بھی ایسے ہی بت بنوائیں۔ ان کی اس بے ہودہ خواہش پر حضرت موسیٰؑ سخت ناراض ہوئے تو وہ لوگ خاموش ہوگئے۔

لیکن اس واقعہ پر کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حضرت موسیٰؑ الواح توریت لینے کے لیے کوہِ طور پر چلے گئے ایسے میں سامری نے ایک بچھڑے کا بُت بنایا اور بنی اسرائیل کو اس کی پرستش کرنے کی دعوت دی تو اکثریت نے توحید کو چھوڑ کر گوسالہ پرستی شروع کردی بس ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ حضرت ہارون کی قیادت میں نظریہ توحید پر قائم رہا۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علمی و فکری لحاظ سے پسماندہ اقوام میں خدائے تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رہبر کیسی کیسی مشکلات میں گرفتار ہے۔ اصولاً شرک کے آثار کو مٹانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے لوگوں کے فکر و نظر کو بلند کرنا اور انہیں صحیح تربیت دینا بہت ضروری ہے۔

# شرک کا تیسرا سرچشمہ خیالی فوائد ومنافع

## اشارہ:

وہم وخیال اور غلط فہمی وغرور وہ چیزیں ہیں جن پر بت پرستی کی بنیادیں قائم ہوتی تو ہم پرستی اور ضدیت جتنی زیادہ ہوگی بت پرستی کے آثار ونتائج کا دامن اتنا ہی وسیع ہوگا۔ یہاں تک کہ بے جان اور بے شعور موجودات یعنی مٹی اور پتھر کے بت اور چوب وآہن سے بناء ہوئے مجسمے اتنی قدر و قیمت کے لائق سمجھے جاتے ہیں کہ انہیں زمین وآسمان میں تمام قدرتوں کے مالک تصور کیا جاتا ہے۔ اوران کی خیالی قوتوں کے آگے سر جھکائے اور ماتھے ٹیکے جاتے ہیں۔

ہاں بتوں سے حاصل ہونے والی خیالی برکتیں اور فرضی فائدے بت پرستی کے سرچشموں میں سے دوسرا سرچشمہ ہیں اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتے اور آیاتِ ذیل کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(۱) وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّـــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ⑱ [۱۰:۱۸] (یونس)

(۲) وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ؀ [۳۶:۷۴] (یٰسٓ)

(۳) وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ؀ [۱۹:۸۱] (مریم)

(۴) اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ③ [۳۹:۳] (زمر)

## ترجمہ:

(۱) وہ خدا کے بجائے کچھ چیزوں کی پوجا کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ نفع دیتی ہیں اور وہ کہتے ہیں یہ خدا کے ہاں ہمارے شفیع وسفارشی ہیں، کہو......کیا تم خدا کو زمین وآسمان میں ایسی چیز کی خبر دیتے ہو کہ جسے وہ نہیں جانتا؟ وہ ان شریکوں سے پاک ومنزہ ہے جو

وہ اس کے لیے قرار دیتے ہیں۔

(۲) انہوں نے اپنے لیے خدا کے علاوہ کچھ اور معبود بنا رکھے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید ان کی مدد کی جائے گی۔

(۳) انہوں نے اپنے لیے خدا کے سوا معبود بنا رکھے ہیں تا کہ وہ ان کی عزّت کا ذریعہ بنیں۔

(۴) آگاہ رہو کہ دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے وہ لوگ جنہوں نے خدا کے علاوہ اپنے کچھ سرپرست قرار دیئے ہیں، وہ کہتے ہیں ہم ان کی پرستش نہیں کرتے مگر اس لیے کہ وہ ہمیں خدا کے نزدیک کر دیں گے، جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے قیامت کے روز خدائے تعالیٰ ان کے درمیان اس کا فیصلہ کر دے گا۔ بیشک خدا جھوٹوں اور کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

## مفردات کی تشریح:

''شفعاء''، شفیع کی جمع ہے، اس کا مادہ ''شفع'' بروزن ''نفع'' ہے مصباح اللغۃ کے بقول اس کا معنی ایک چیز کو دوسری میں ضم کرنا اور ملانا ہے۔ مضردات راغب کے مطابق اس کا مطلب ایک چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملانا ہے۔ مقابیس اللغۃ میں ہے کہ اس کا معنی دو چیزوں میں قرب و نزدیکی ہے۔

بہر حال ان سب معانی کی بازگشت ایک معنی کی طرف ہے، اب اس لفظ کا استعمال ایک کمزور فرد کا کسی طاقتور شخص کے ساتھ تمسک کرنے کے معنی میں ہے تا کہ وہ اس کی مدد کرے اور اس کے لیے نجات کا وسیلہ بنے، آیت زیر بحث اور دیگر آیات میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔

عدد ''شفع'' بہ معنی زوج بہ مقابل ''وتر'' بمعنی فرد کے آتا ہے۔

''زلفی'' کا مادہ ''زلف'' بروزن ''ظرف'' ہے اور اس کا اطلاق درجہ منزلت میں قرب پر ہوتا ہے کبھی اسے ''قدم'' کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے کیونکہ قدم اٹھانے سے مقصد و منزل قریب تر آتی ہے۔ آیات زیر بحث میں اس سے قرب معنوی بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور مشرکین بتوں کے ذریعے ایسا ہی قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن بعض محققین کے نزدیک ''زلفی'' کا معنی قرب کامل ہے جس کا مطلب قرب کا بلندترین مقام حاصل کرنا ہے۔[1]

مگر اس مقام پر اس لفظ کے استعمال کے پیشِ نظر اس کا یہ مفہوم بعید نظر آتا ہے۔

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

یہ لفظ رات کی پہلی ساعتوں کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے اقم الصلوٰۃ طرفی النھار وزلفاً من اللیل۔ یعنی نماز دن کے دونوں سروں اور رات کے اوائل میں قائم کرو۔'' (ھود۔ ۱۱۴)

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

## بت ہمارے شفیع ہیں:

(۱) پہلی آیت میں بت پرستوں کے مشہور مفروضے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: یہ لوگ خدا کے بجائے کچھ چیزوں (بتوں) کی پوجا کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ نفع دیتی ہیں اور وہ کہتے ہیں یہ خدا کے ہاں ہمارے شفیع وسفارشی ہیں۔ گویا قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں (ویعبدون من دون اللہ مالا یضر ھم ولا ینفعھم ویقولون ھولاءِ شفعآؤنا عنداللہ۔)

اب ایک سوال سامنے آتا ہے کہ وہ لوگ ان بے جان مجسموں کو کیونکر درگاہ خداوندی میں اپنا شفیع وسفارشی سمجھ رہے تھے؟ اس کے جواب میں بعض مفکرین کا خیال ہے کہ مشرکین کا اعتقاد یہ تھا کہ بتوں کی پوجا خدا ہی کی عبادت ہے اور اس کے تقرب کا ذریعہ ہے...... یہ عقیدہ مختلف وجوہات کی بناء پر پیدا ہوا تھا۔

ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہم خدا کی عبادت کرنے کے لائق نہیں۔ لائق نہیں کیونکہ وہ بڑی بلند وبرتر ذات ہے۔ اس لیے ہم ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں تا کہ ان کے واسطے سے ہم اس کے نزدیک ہوسکیں۔ بعض کو سوچ یہ تھی کہ فرشتے خدا کی بارگاہ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ہم اس لیے بتوں کی پوجا کرتے ہیں کہ یہ ان کے مظہر ہیں ہم فرشتوں کی مورتیوں کو پوجتے ہیں تا کہ ان کے وسیلے سے قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔

کچھ مشرکین کہا کرتے کہ ہم خدا ہی کی عبادت کرتے ہیں اور یہ بت ہمارے لیے بمنزلہ قبلہ کے ہیں۔ جیسے مسلمان عبادت کے وقت اپنے قبلہ کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ جب کہ بعض یہ کہتے ہیں کہ ہر بت کے پاس ایک شیطان ہوتا ہے ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو وہ شیطان ہماری مراد پوری کردیتا ہے۔...... اگر بتوں کی پوجا نہ کی جائے وہی شیطان خدا کے حکم سے انسان کو گمراہ اور بدبخت بنادیتا ہے اسی طرح کے اور بھی خرافات ہیں جن کے لوگ قائل ہیں[1]

(۲) دوسری آیت میں مشرکین کے ایک اور مفروضے کا تذکرہ ہورہا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: انہوں نے اپنے لیے خدا کے علاوہ کچھ معبود بنا رکھے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید ان کی مدد کی جائے گی (واتخذوا من دون اللہ الھۃ لعلھم ینصرون)۔

وہ تمنا رکھتے تھے کہ یہ بت مشکلوں مصیبتوں اور جنگوں بیماریوں میں ان کی مدد کریں، قحط اور خشک سالی میں وہ ان کی فریاد کو پہنچیں اور عالم آخرت میں ان کے حمایتی بن کر آئیں ........... یہ ان لوگوں کی کتنی بڑی غلط فہمی تھی۔ لیکن معاملہ بالکل الٹ ہوگیا کیونکہ بتوں کو کسی طرح

[1] بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۱۹۷۔

کا خطرہ ہوتا تو یہ لوگ خود ان کی مدد کو دوڑ پڑتے اور ان کے دشمنوں سے ان کا دفاع کرتے تھے، جیسے حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں آیا ہے: قالوا حرقوہُ وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین ۔یعنی انہوں نے کہا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔ اگر تم کوئی کام کرنے والے ہو۔(انبیا۔۶۸)

ان کا یہ عقیدہ کہ بت ان کی مدد کریں گے ایک وہم وخیال سے زیادہ کچھ نہ تھا کیونکہ اس کی اصل واساس علمی پسماندگی اور فکری پستی ہے۔یہی وہ چیز ہے جو طول تاریخ میں بت پرستی کی نمود کا سرچشمہ رہی ہے۔

(۳) تیسری آیت میں یہی معاملہ ایک اور انداز میں بیان ہوا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا: انہوں نے اپنے لیے خدا کے سوا کچھ معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کی عزت کا ذریعہ بنیں(واتخذوا من دونِ اللہ الھة لیکونولھم عزاً)

عزت سے مرتبہ وحیثیت ہی نہیں بلکہ قوت،نصرت اور خدا کے ہاں شفاعت مراد ہے۔یہ بھی محض ان کا خیال ہی ہے کیونکہ اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے اسی سورہ (مریم) میں فرمایا ہے: جب اوہام کے پردے اُٹھیں گے تو عقل کی حکومت ہوگی اور بت پرستوں کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوگا وہ ان بتوں کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے خلاف کھڑے ہوجائیں گے۔جیسے سورۂ انعام کی آیت ۲۳ ر میں ہے کہ قیامت کے روز بت پرست کہیں گے(واللہ ربنا ما کنا مشرکین)قسم اس خدا کی جو ہمارا پروردگار ہے کہ ہم مشرک نہ تھے۔

(۴) چوتھی اور آخری آیت میں (الا للہ الدین الخالص) خالص دین خدا ہی کے لیے ہے کا اعلان کرنے کے بعد مشرکوں کو دھمکی دیتے ہوئے فرمایا: وہ لوگ جنہوں نے خدا کے علاوہ اپنے کچھ سرپرست قرار دے رکھے ہیں۔وہ کہتے ہیں۔ہم ان کی پرستش نہیں کرتے مگر اس لیے کہ وہ ہمیں خدا کے نزدیک کردیں گے جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے خدائے تعالٰی قیامت کے روز ان کے درمیان اس کا فیصلہ کردے گا، بے شک خدا جھوٹوں اور کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔(والذین اتخذو امن دونہٖ اولیآءُ ما نعبدوھم الا لیقروبانا الی اللہ زُلفی ان اللہ یحکم بینھم فیما ھم فیہ یختلفون ان اللہ لایھدی من ھو کاذِب کفارٌ[1])

# توضیحات

## ۱۔مفروضہ شفاعت کا سرچشمہ

بت پرستی کے فعل کو دیکھ کر ہر عقلمند انسان حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کیونکہ ممکن ہے کہ ایک عاقل شخص مٹی اور پتھر کے بتوں کے سامنے سر

---

[1] بہت سے مفسرین کا کہنا ہے کہ والذین"مبتداء ہے اور ان اللہ یحکم بینھم"اس کی خبر ہے۔نیز جملہ ما نعبدوھم میں ایک محذوف ہے جو بمنزلہ حال کے ہے۔ (قآئلین ما نعبدھم)

جھکائے (جو اس نے خود ہی بنائے ہوں) اگر معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس پر غور کرے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ بت پرستی ایک احمقانہ عمل ہے لیکن جب ہم اس کے اسباب وعلل پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ محض سطحی سا نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ خیال، اوہام، عادات اور غلط فہمیاں عقلی دلائل کے طور پر سامنے آتی ہیں جن سے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

فخر الدین رازی سورہ یونس کی آیت ۱۸ کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں کس طرح بتوں کو بارگاہ الٰہی میں شفیع تصور کیا گیا؟ اس کی تحلیل میں کئی ایک اقوال نقل کیے ہیں۔

(۱) ایک گروہ کا اعتقاد ہے کہ دنیا کی ولایات وممالک میں ہر ولایت وملک کی سرپرست ایک روح ہوتی ہے چونکہ ہر روح تک رسائی (ان کے بقول) ممکن نہیں ہے اس لئے بت بنا کر انہیں اس روح کا مظہر قرار دیا گیا اور ان کی عبادت شروع کردی گئی جب کہ اصلاً اسی روح کی عبادت کی جارہی ہے پھر یہ خیال باندھ لیا گیا کہ یہ روح خدا کی مطیع اور اس کی عبادت گزار ہے۔

(۲) ایک اور گروہ ستارہ پرستی کرتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں ستارے ہی خدا کی عبادت کرنے کے اہل ہیں نہ کہ خود وہ لوگ......اور جب انہوں نے دیکھا کہ ستارے ہمہ وقت موجود نہیں رہتے کہ ان میں طلوع وغروب کا سلسلہ جاری ہے، تب ان لوگوں نے ہر ستارے کی ایک شکل قرار دے کر اس کے نام پر بت بنالیا اور ان بتوں کی پوجا کرنے لگ گئے جب کہ اصل میں وہ ان ستاروں کی پرستش تھی۔

(۳) ہر بت کے لیے ایک خاص طلسم ہے۔یعنی نقش بناتے اور وہ اس کے سامنے پیش کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس نقش کے ذریعے ان کو اس بت کا قرب حاصل ہوتا ہے طلسم سحر وجادو کی ایک قسم ہے، اس میں پڑھے جانے والے افسوس اور نقوش واشکال شامل ہیں، بعض لوگوں کا نظریہ ہے۔کہ ان طلسمات کے وسیلے سے آسمانی قوتیں زمین پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کی عجیب وغریب اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔وہ لوگ مختلف چیزوں پر یہ نقوش بناتے ہیں اور یہ تصور کرتے تھے کہ ان کے ذریعے سے موذی جانور اور دیگر امراض وبلیات ہم سے دور رہیں گے) [1]

(۴) انبیاء اولیاء کی مزعومہ صورتوں کے بت بنائے گئے اور وہ اس امید پر ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے کہ وہ خدا کے حضور ہماری شفاعت وسفارش کریں گے۔

(۵) وہ لوگ یہ تصور رکھتے تھے کہ خدا ایک بزرگ تر نور ہے اور فرشتے چھوٹے چھوٹے انوار ہیں لہٰذا وہ خدا کو ایک بہت بڑے بت کی صورت میں مجسم کرتے اور فرشتوں کے ناموں پر کئی چھوٹے بت بناتے تھے۔

(۶) بت پرستوں میں سے بعض لوگ حلول کا نظریہ رکھتے تھے۔یعنی وہ یہ اعتقاد ظاہر کرتے کہ خدا بعض اجسام میں حلول کرتا ہے اور وہ ان بتوں میں بھی داخل ہوتا ہے......اس لیے وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے [2]

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ بت پرستی حضرت نوحؑ کے زمانے میں شروع ہوئی......وہ یوں کہ حضرت نوحؑ کے پانچ بیٹے تھے، ود،

---

[1] مزید تشریح کے لیے دائرۃ المعارف، ''دہ خدا، جلد ۲ ۱۳ اور دائرۃ المعارف ''مصاحب'' جلد دوم میں مادہ ''طلسم'' کا مطالعہ کریں۔

[2] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۷ صفحہ ۶۰ (معمولی تلخیص کے ساتھ)

سواع، یعوق، یغوث، نسر...... ان میں سے ''وِدّ'' فوت ہو گئے تو لوگ بڑے غمگین ہوئے اور ہر وقت ان کی قبر پر بیٹھے رہتے۔ تب شیطان نے ان سے کہا کہ آؤ میں تمہیں ''وِدّ'' کا مجسمہ بنا دوں کہ جب تم فرزند نوح کو دیکھنا چاہو تو اسے دیکھ کر اس کی یاد تازہ کر لیا کرو گے، انہوں نے کہا: ہاں ایسا ہی کرو، اس وقت ابلیس نے ''وِدّ'' کا مجسمہ بنایا تھا۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور حضرت نوحؑ کا جو بیٹا بھی فوت ہوتا، اس کا بت بنا لیا جاتا۔ یونہی وقت گزرتا رہا اور شیطان نے ان لوگوں کو باور کرا دیا کہ تمہارے بزرگ انہی بتوں کی پوجا کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا تم بھی ایسا ہی کرتے ہو...... یہ وہ وقت تھا جب خدا نے حضرت نوحؑ کو حکم دیا کہ وہ اس بت پرستی کو روکیں [1]

## ۲۔ عربوں میں بت پرستی کا رواج

وہ پہلا شخص جس نے اہل عرب میں بت پرستی شروع کی وہ بنو خزاعہ کا ایک فرد ''عمرو بن لحی'' تھا وہ اپنے کسی کام سے شام ہو گیا اور وہاں ہونے والی بت پرستی کو دیکھا اس نے ان لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں...... ان سے بارش طلب کرتے ہیں تو بارش ہو جاتی ہے اور ان سے مدد مانگتے ہیں تو وہ مشکلوں میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

عمرو بن لحی نے اہل شام سے کہا، اگر ممکن ہو تو ایک بت مجھے بھی دو۔ تاکہ عرب کے لوگ بھی بُت پرستی سے نفع حاصل کریں انہوں نے اسے ایک بت ''ہبل'' دیا جو انسانی شکل میں تھا اور عقیق سے بنایا گیا تھا۔ وہ یہ بت لے کر شام سے مکہ پہنچا اور اسے کعبہ کے اندر نصب کر کے لوگوں کو اس کی عبادت پر آمادہ کیا۔ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ سفر سے واپس آنے والے افراد پہلے ان بتوں کی زیارت کرتے اور پھر اپنے گھروں کو جاتے تھے [2]

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بت پرستی کا اصل سبب یہ ہے کہ ان وقتوں میں افراد انسانی کے نزدیک خدا کی ذات اس سے بلند و برتر تھی کہ ہم جیسے اس کی عبادت کریں۔ چنانچہ ایک درمیانی واسطہ کے طور پر بت بنائے وہ ان کے ذریعے خدا کا تقرب حاصل کرنا چاہتے تھے یا صورت یہ تھی کہ ان کے خیال میں خدا حواس و عقل سے ماوراء ذات ہے جس کی پرستش نہیں کیا جا سکتی۔

لہٰذا انہوں نے چاہا کہ ان محسوس موجودات (بتوں) کے وسیلے سے اس کا تقرب حاصل ہے۔

چند ایک تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ بنی اسماعیل یعنی اہل مکہ میں بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب ان میں سے کوئی شخص سفر پر جاتا تو مکہ سے شدید محبت کی بناء پر وہ اپنے ہمراہ وہاں سے ایک پتھر لے جاتا۔ پھر وہ جہاں جہاں قیام کرتا، اس پتھر کو سامنے رکھتا اور اس

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۴، صفحہ ۲۶۔

[2] روح البیان جلد ۴ صفحہ ۲۶، بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۴۸ روایت ۱، ۷، ۸، بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۲۰۰۔ عمرو بن لحی خزاعی کے شام سے نامبارک سوغات لانے کا واقعہ، سیرت ابنِ ہشام جلد اوّل صفحہ ۷۸ پر بھی اسی طرح کا واقعہ بیان ہوا ہے۔

کا طواف کر لیتا تھا۔ جیسے کعبہ کا طواف کر رہا ہو...... پھر وقت گزرنے کے ساتھ ان کی یہ عادت بت پرستی کی شکل اختیار کر گئی [1]

تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: بت پرستوں کا خیال تھا کہ ہماری بشریت، ہمارے گناہ اور ہمارے برے افعال ایسی رکاوٹیں ہیں جو ہمیں رب الارباب تک پہنچنے نہیں دیتے۔ کیونکہ اس کی ذات اعلیٰ وارفع اور پاک و پاکیزہ ہے پس ہم میں اس میں کوئی نسبت ہی نہیں...... لہٰذا ہم اس کو محبوب ترین چیزوں کے ذریعے سے اس کا تقرب حاصل کر سکتے ہیں، وہ چیزیں ہمارے وہی خدایان زمینی ہیں۔ جن کے ذمے دنیا کی خلق وتدبیر کا کام ہے پس ہم ان کی شکلیں اور مورتیاں بنا کر ان کو پوجا کریں اور ان کے نزدیک ہوں تا کہ وہ خدائے بزرگ کے ہاں ہمارے شفیع وسفارشی بنیں، اس طرح ان کی خاطر سے ہمیں خیر وفلاح حاصل ہوگی اور ضرر و تکلیف ہم سے دور رہے گی...... گویا وہ ان بتوں کی پوجا اس لیے کرتے کہ ان کے دیوتا خوش ہوں اور خدا کے ہاں ان کی سفارش کریں، کبھی وہ خود ان بتوں ہی کو شفیع وسفارشی قرار دے لیتے ہیں [2]

بہرحال ان لوگوں نے ان اوہام اور غلط اندیشیوں کے ذریعے سے اپنی گمراہیوں اور بے ہودہ رسوم کو عقلی اور منطقی طور پر درست ثابت کرنا چاہا لیکن اصل میں انہوں نے ضلالت کو ہدایت اور شیطانی وسوسوں کو عقلی دلائل کا نام دے رکھا تھا۔

## (۳)......شرک وبت پرستی کے دیگر عوامل

شرک وبت پرستی ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے اور دیگر مشکل مسائل کی طرح اس کا بھی کوئی ایک عامل نہیں ہے، بلکہ یہ چیز بہت سے عوامل کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ قومیں سورج، چاند اور ستاروں کی پوجا کرتی ہیں۔ بعض اقوام آگ کی پجاری بنی ہوئی ہیں اور بعض نے بڑے دریا کو اپنا معبود بنایا، جیسے مصر میں دریائے نیل اور ہندوستان میں دریائے گنگا کو پوجا گیا۔ یعنی جس جس چیزوں کو اپنے لیے فائدہ بخش دیکھا یا اس کی بڑائی کا مشاہدہ کیا اسے مقدس قرار دے دیا اور پھر یہ تقدس...... ان کے نزدیک...... اس قدر بڑھا کہ اس چیز کے لیے رُوح خاص کے قائل ہو گئے اور اسے بھی اپنے خداؤں کی صف میں شامل کر لیا۔

ایک اور تعبیر کے مطابق شرک کرنے والے عالم اسباب میں گم ہو کر رہ گئے اور انہوں نے ان اسباب کو پیدا کرنے والے (مسبب الاسباب) خدائے واحد کو فراموش کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسی نظر نہ رکھتے جو وجود کائنات کے اصل سبب تک پہنچ سکے، وہ اس فکر وفہم سے عاری تھے جو سبب کی کہنہ واصلیت کو پا سکتی ہو...... پس ان کے مفروضوں، غلط اندیشیوں اور خام خیالیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بت پرستی اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔

[1] سیرت ابن ہشام جلد اوّل صفحہ ۷۹۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۰ صفحہ ۲۷ سورہ یونسؑ۔ آیت ۱۸ کے ذیل میں۔

# شرک کا چوتھا اور پانچواں سرچشمہ
# تقلید و استعمار

## اشارہ:

بت پرستی کے ایک سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہونے کا سب سے بڑا سبب تقلید ہے اور تقلید ہی کی بدولت اس میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ قرآن نے بھی بار بار یہی کہا ہے کہ بت پرستی کی نمود اور فروغ میں تقلید کا بہت بڑا حصہ ہے بلکہ بعض موقعوں پر تو اسے مشرکین عرب کی طرف سے اپنے شرک بت پرستی کی ایک مستقل دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

بت پرست معاشرے میں پرورش پانے، باپ داداوٴں کا طریقہ اپنانے اور بچپن میں سُنی ہوئی باتوں سے اثر پذیر ہونے سے جیسے عوامل ایک دوسرے کے معاون بنتے ہیں تو ایک بے ہودہ اور بے بنیاد فعل یعنی لکڑی اور پتھر کے بت جو محض ناکارہ ہوتے ہیں...... انہیں ان لوگوں کی نظروں میں ایک قابلِ قدر اور مقدس وجود کے طور پر متعارف کرا دیتے ہیں۔

اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن مجید کی طرف نظر کرتے اور آیاتِ ذیل کی آواز پر کان لگاتے ہیں:

(۱) بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ﴿۲۲﴾ [۴۳:۲۲]
وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا
وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴿۲۳﴾ [۴۳:۲۳] (زخرف)

(۲) قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ﴿۷۱﴾ [۲۶:۷۱] قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ
اِذْ تَدْعُوْنَ﴿۷۲﴾ [۲۶:۷۲] اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ﴿۷۳﴾ [۲۶:۷۳] قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ
اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ﴿۷۴﴾ [۲۶:۷۴] (شعراء)

(۳) قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى
الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ﴿۷۸﴾ [۱۰:۷۸] (یونس)

(۴) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ
اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴿۱۷۰﴾ [۲:۱۷۰] (بقرہ)

(۵)وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُنَا بَيِّنَٰتٍ قَالُوا۟ مَا هَٰذَآ إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَن يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ ءَابَآؤُكُمْ ۚ [۳۴:۴۳](سبا)[1]

## ترجمہ:

(۱) بلکہ وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے آباءواجداد کو جس مذہب پر پایا ہم کو بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت کی گئی ہے، اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا، مگر یہ کہ وہاں کے مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک مذہب پر پایا ہے، اور ہم انہی کے آثار کی پیروی کرتے ہیں۔

(۲) انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی پوجا کرتے اور انہی کے قدموں میں پڑے رہتے ہیں۔ اس نے کہا جب انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں یا تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے پایا ہے۔

(۳) (فرعون کے ساتھی موسیٰؑ سے) کہنے لگے کیا تو اس لے آیا ہے کہ ہمیں اس (پنتھ) سے پھیر دے جس پر ہمارے باپ دادا رہے اور تم اس ملک میں حکومت وریاست حاصل کرو، ہم تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(۴) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں۔ ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے پر چلیں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، لیکن اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کام نہ لیا ہو اور راہ راست پر نہ رہے ہوں تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کرتے رہیں گے؟

(۵) جب ہماری واضح آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بس ایک ایسا

[1] ان آیات کے مضمون کے ساتھ ملتی جلتی اور بھی آیات ہیں، بوجہ اختصار ان پر اکتفاء کیا گیا ہے، ملاحظہ ہوں سورہ اعراف آیت ۷۰، ۱۷۳م سورۂ ابراہیم آیت ۱۰، سورہ ہود آیت ۶۲

شخص ہے جو تمہیں ان کی پرستش کرنے سے روکنا چاہتا ہے، جن کی پرستش تمہارے باپ دادا کیا کرتے تھے۔

## مفردات کی تشریح:

''صنم'' راغب اصفہانی المفردات میں کہتا ہے کہ ''صنم'' ایسا مجسمہ ہے جسے چاندی تانبے یا لکڑی سے بناتے اور اس کی پوجا کرتے تھے، وہ لوگ اسے تقرب الٰہی کا وسیلہ تصور کرتے تھے، لسان العرب میں ہے کہ لفظ دراصل ''کلمہ'' ''شمن'' سے لیا گیا ہے جو فارسی، آرامی یا عبرانی زبان سے ہے[1]

بعض اہلِ لغت کا نظریہ ہے کہ ''صنم'' اور ''وثن'' کے درمیان فرق یہ ہے کہ ''صنم'' ان بتوں کو کہا جاتا ہے جو خاص شکل وصورت رکھتے ہیں اور ''وثن'' وہ بت ہیں جو کسی خاص شکل میں نہ ہوں۔

''اب'' یہ لفظ ''باپ'' کے معنی میں ہے، کبھی یہ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی چیز کے وجود میں آنے کا سبب ہو یا اس کی اصلاح کرے یا اسے ظاہر کرے، لیکن یہ معانی مجازی وکنائی ہیں۔ اس سبب سے کہ ''باپ'' اپنے بچوں کو روزی بہم پہنچاتا ہے اس لفظ کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے۔

کلیات ابوالوفا میں ہے پہلی شریعتوں میں لفظ ''اب'' کا اطلاق ''خدا'' پر کیا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ اس مخلوقات کی پیدائش کا سبب ہے پھر بہت سے جاہل اور بے خبر لوگوں نے اس ''اب'' کو والدہ اور جسمانی باپ کے معنی میں قرار دے لیا اور خدا کو ''اب'' کہہ کر کفر کی راہ اختیار کر لی۔

کتاب ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں اس مادہ کو تربیت کے معنی میں استعمال کیے جانے کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس اعتبار سے اس لفظ کے مصداق بہت سے ہیں مثلاً خداوندِ متعال، والد پیغمبر، معلم، چچا اور دادا وغیرہ، پس لفظ ''اب'' میں پدر اور باپ کے معنی کے لحاظ سے بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

## بت پرستی ہمارے اسلاف کا دستور ہے:

(۱) مشرکین عرب میں ایک گروہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتا اور ان کی پرستش کرتا تھا۔ پہلی آیت میں ان کے اس جاہلانہ خیال کو کئی طرح سے روک گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: تم لوگ بیٹوں کی پیدائش پر خوش ہوتے اور بیٹیوں کی ولادت پر ناراحت ہوتے ہو...... پھر خدا کے لیے بیٹیوں کے قائل کیوں ہوئے ہو؟ تاہم یہ جواب ان لوگوں کی عقل وفکر کی سطح کے مطابق دیا گیا ہے۔

---

[1] لغت فارسی ''شمن'' کے معنی بت پرست کے ہیں نہ کہ بت دیکھیں فرہنگ معین اور غیاث اللغات۔

کبھی فرشتوں اور بتوں کی پرستش پر ان کے کمزور دلائل کا ذکر کیا اور ان کا جواب دیا گیا اور آخر کار ان کی اس دلیل کا ذکر کیا ہے" بلکہ وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے آباء واجداد کو جس مذہب پر پایا ہم کو بھی انہی کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت کی گئی ہے(بل قالو انا وجدنا اٰباءَ نا علیٰ امۃٍ وانا علیٰ اثارھم مھتدون[1])

لیکن اس کے بعد قرآن بلا فاصلہ پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ کورانہ تقلید اور پہلے لوگوں کے عقائد ونظریات کی بلاقید شرط پیروی نیز اس قسم کے کمزور اور بے اصل عذر صرف مشرکین عرب ہی پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ "اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک مذہب پر پایا ہے۔اور ہم انہی کے آثار کی پیروی کرتے ہیں(و کذالك ما ارسلنا من قبلك فی قریۃٍ من نذیرٍ الا قال مترفوھا انا وجدنا اٰباءنا علی اُمۃٍ وانا علیٰ اثارھم مقتدونَ)

معلوم ہوا کہ بت پرستی کے ایک سے دوسری نسل میں منتقل ہونے کا بڑا سبب آندھی تقلید یعنی اپنے باپ دادا کی غلط روش کو بلاقید وشرط قبول کرنا ہے گویا یہ عقل وتدبیر سے کام نہ لینا، تلاش وتحقیق کی زحمت نہ اُٹھانا اور پہلے لوگوں کی فضولیات کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

"مترفون" مغرور دولت مندوں کی بطور خاص نشاندہی کرنے کی بقول مفسرین یہ وجہ ہے کہ دُنیا سے محبت، قسم قسم کی مادی لذات سے رغبت، عافیت کوشی وسہل پسندی اور تحقیق وجستجو کی زحمت نہ اُٹھانا یہ سب دولت مند لوگوں کی بُری صفات ہیں اور یہی اندھی تقلید اور بے سوچے سمجھے کسی کی پیروی کرنے کے اسباب ہیں جو خاص وعام سب کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں۔

اگر وہ ثروت مند لوگ ان تاریکیوں سے باہر آجاتے تو حق وحقیقت تک پہنچنا اور ان کو پہچاننا کچھ بھی مشکل نہ تھا...... چنانچہ پیغمبر اکرمؐ کا فرمان ہے: ہر گناہ وغلطی کا سرچشمہ دُنیا کی محبت ہے(حب الدنیا راس کل خطیئۃٍ)[2]

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں ان کا یہ قول نقل ہوا"......ہم کو ان کے آثار کی پیروی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے" جب کہ دوسری آیت میں ان کا یہ قول آیا ہے"ہم ان کے آثار کی پیروی کرتے ہیں" ممکن ہے تعبیر کا یہ فرق علت ومعلول کے طور پر ہو۔یعنی ان کا مدعا یہ ہو کہ ہم اپنے اسلاف کی پیروی اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا طریقہ حق وہدایت سے تعلق رکھتا ہے۔

لیکن قرآن ان آیات کے مضامین کو آگے بڑھاتے ہوئے مضبوط دلائل کے ساتھ ان کے اس خیال باطل کی تردید کرتا ہے اور انبیاءؑ سابق کی زبانی نقل کرتا ہے کہ انہوں نے مشرکین کو اس کورانہ تقلید پر ٹوکتے ہوئے کہا تم نے اپنے بڑوں کو جس طریقہ پر کار بند پایا اگر ہم اس سے بہتر وبرتر آئین حیات لائے ہوں تو کیا پھر بھی اس کا انکار کرو گے؟" اس پر انہوں نے بڑے تعجب وغرور سے کہا تم جو آئین

---

[1] اُمۃٍ کا لفظ مفسرین کے بقول اس آیت میں ایک آئین ودستور کے معنی میں ہے کہ جس پر ایک قوم کا اجماع ہو،لیکن بعض علماء اسے جماعت اور گروہ کے معنی میں لیتے ہیں، تاہم اس مقام پر بناء پر مشہور پہلے معنی ہی کو ترجیح حاصل ہے۔اگرچہ قرآن کی دیگر آیات میں لفظ"امۃ" جماعت کے لیے آیا ہے اور اس کا ایک معنی گناہ بھی لیا جاتا ہے۔

[2] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۲۰۶ تفسیر رُوح البیان اور تفسیر المیز ان میں بھی اس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

لے کر آئے ہو، ہم اس کا انکار کرتے ہیں''

البتہ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، تقلید کی کئی ایک اقسام ہیں یعنی ایک تقلید اپنی جگہ پر مفید اور نفع بخش ہے کہ جس کے ذریعے علوم وفنون ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں، دوسری تقلید وہ ہے جو فضول اور احمقانہ ہے کہ اس سے بے بنیاد اور بے فائدہ رسوم اور طرح طرح کی بُری عادات واطوار غلط اعتقادات ونظریات آئندہ نسلوں میں سرایت کرتے ہیں......ان تقلیدوں میں سے ہر ایک کی خاص علامات اور نشانیاں ہیں۔ جن کی طرف ہم آیندہ صفحات میں اشارہ کریں گے۔

(۲) دوسری آیت میں بابل کے بُت پرستوں سے حضرت ابراہیمؑ کے مبارزہ کا ذکر ہے، آپ نے نہایت بلیغ انداز میں ان سے سوال کیا: یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم لوگ پرستش کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: انہوں نے کہا ہم ان بتوں کی پوجا کرتے اور انہی کے قدموں میں پڑے رہتے ہیں۔ (قالوا نعبد اصناماً فنظل لها عاكفين)۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف بت پرستی کا اقرار کیا بلکہ اس پر فخر کا اظہار بھی کر رہے تھے۔

حضرت ابراہیم نے ایک کڑا سوال کر کے ان کا ناطقہ ہی بند کر دیا......انہوں نے کہا جب انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں یا تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں۔ (قال هل يسمعونكم اذ تدعون ـ او ينفعونكم اويجرون) یعنی اگر یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچانے کے قابل نہیں ہیں تو کم از کم اپنے پجاریوں کی آواز ہی سنتے ہوتے، ورنہ اس عبادت اور پوجا کا کیا فائدہ ہے۔ ہاں وہ لوگ یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے تھے کہ یہ لکڑی اور پتھر کے بت ان کی دعا و پکار اور تضرع وزاری کو سنتے ہیں اور نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے کہ یہ ان کو کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے اسلاف کورانہ تقلید کا سہارا لیا: انہوں نے جواب دیا...... بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے (قالو بل وجدنآ اٰبآءَ كذلك يفعلون) ایسا بے پایہ جواب دینا اگرچہ موجب ندامت ہے، لیکن ان کے لیے ان کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔

ان آیات کے سلسلہء بیان میں حضرت ابراہیمؑ ایک محکم اور جاندار دلیل سے ان مشرکین کو لاجواب کر دیتے ہیں......فرماتے ہیں: یہ بت جن کو پرستش تمہارے اسلاف کرتے تھے اور تم بھی کر رہے ہو۔ یہ سب میرے دشمن ہیں اور میں ان کا دشمن ہوں) اور میں تو صرف اس ذات کی عبادت کرتا ہوں جو سبھی اہل جہان کا پروردگار ہے۔ میری پیدائش میری ہدایت میری خورد ونوش میرے بیماری وشفا۔ میری زندگی موت اور بالآخر بخشش کرنے والا وہی ہے۔ یعنی ایک ایسی ہستی لائق پرستش ہے جو ساری کائنات کا خالق اور تمام فوائد ومنافع کا مالک ہے۔ نہ ایسے بے جان اور بے شعور مجسمے کو جو نہ اپنے اور نہ کسی اور کے کام آسکتے ہیں۔

(۳) تیسری آیت کہ جس میں قومِ فرعون کی زبانی بات کی گئی ہے۔ اس میں یہی مضمون ایک دوسرے انداز میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا: (فرعون کے ساتھی موسیٰؑ سے) کہنے لگے کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس (پنتھ) سے پھروے جس پر ہمارے باپ دادا رہے اور تم اس ملک میں حکومت وریاست حاصل کرو (قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا عليه ابائنا وتكون لكما الكبريآءُ

فی الارض[1])

چونکہ معاملہ اسی طرح ہے لہٰذا ہم تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے(وما نحن لکما بمومنین)

درحقیقت ان کے پاس اپنے اس آئین زندگی اور اعتقاد وعمل کی حقانیت و پاکیزگی کی صرف یہی دلیل ہے کہ یہ ہمارے بزرگوں کا طریقہ اوران کی رسم وراہ ہے، انہوں نے حضرت موسیٰ وہارونؑ پر الزام لگایا کہ تم دونوں شرک وبت پرستی کی مخالفت اورتوحید کی دعوت کے ذریعے سے محض حکومت وریاست تک پہنچنا چاہتے ہو۔ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو فرعون کے درباریوں نے کی ہے۔اس میں انہوں نے موسیٰؑ وہارونؑ کی دعوت توحید کے مقابلے کے لیے دو شیطانی راہیں نکالی ہیں۔

(۱) جاہل عوام کے جذبات کو برانگیختہ کیا ہے کہ تمہارے بزرگوں کا دین خطرے میں ہے۔

(۲) عوام میں موسیٰؑ وہارونؑ کی طرف سے بدظنی پیدا کی ہے۔کہ ان کا مقصد حکومت پر قبضہ کرنا ہے ورنہ شرک وتوحید کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

جابر حکومتیں اور طاغوتی حکمران عوام کو بے وقوف بنانے اور اپنے اقتدار غلبہ کو قائم رکھنے کے لیے یہی دو راستے اختیار کرتے ہیں، جیسے سورۃ طٰہٰ کی آیت ۶۳ میں اس کا بڑی صراحت سے ذکر کیا گیا ہے(قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ [۲۰:۶۳])انہوں نے کہا کہ یہ دونوں(موسیٰؑ وہارونؑ)ضرور جادوگر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے وطن سے نکال باہر کریں اور تمہارے بہترین(اور قابل فخر)مذہب کو مٹا ڈالیں۔"

## بت پرست ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے رہے:

(۴) چوتھی آیت میں اسی بیان کو مشرکین مکہ کے ہمیشگی جواب کے طور پر ذکر کیا اور فرمایا: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو تو(ہمیشہ)جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

(واذا قیل لھم اتبعوا ماانزل اللہ قالو بل نتبع ما الفینا علیہ اٰبآئنا)۔

درحقیقت ہر مخالف اور دُشمن کی گفتگو ایسی ہی ہوتی ہے کہ جب کوئی جواب بن نہ پڑے تو تقلید آباء کا سہارا لیتا ہے پھر تقلید بھی کورکورانہ اور بے سوچے سمجھے کی گئی اور جن کی تقلید کی ہے وہ گمراہ اور بے خبر لوگ ہیں لیکن وہ اس تقلید پر فخر بھی کرتے ہیں، جب کہ پیغمبروں کی طرف سے اپنی تبلیغ ودعوت کی حقانیت پر دیئے جانے والے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

قرآن کریم ایک مختصر سے جملہ میں مشرکین کی اس کمزور اور بودی دلیل کو رد کرتے ہوئے ایک سوال اٹھاتا ہے"لیکن اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کام نہ لیا ہو اور راہ راست پر نہ رہے ہوں تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی(تقلید)کرتے رہیں گے؟(اولو کان اٰباؤھم

---

[1] لتلفتنا۔اس کا مادہ"لفت"بروزن"حرف"ہے کہ جس کے معنی کسی چیز سے ہٹانا یا اس کی طرف متوجہ کرنا ہے اگر یہ"عن"کے ساتھ متعدی ہو تو اس کے معنی پھر جانا ہیں اور اگر"الی"کے ساتھ آئے تو اس کے معنی توجہ کرنا ہوں گے۔

لا یعقلون شیاءً ولا یھتدون[1]

یعنی اگر ان کی تقلید ''جاہل کے عالم کی تقلید کرنے'' کے مطابق ہوتی تو قابل قبول تھی لیکن وہاں یہ صورت نہیں تھی بلکہ ان کی تقلید ''جاہل کے جاہل کی تقلید کرنے'' کی شکل میں تھی کہ ایک گمراہ دوسرے گمراہ کی تقلید و پیروی کر رہا تھا۔ چنانچہ مشرکین مکہ کی تقلید آباء یہ تھی کہ بہت سے اندھے ایک اندھے کی لاٹھی پکڑے ہوئے تھے اور وہ انہیں تباہی کے گھڑھے کی طرف لیے جا رہا تھا۔

اس آیت اور اس سے پہلے کی آیات کا انداز بتاتا ہے کہ یہاں مشرکین عرب کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، بعض لوگوں نے جو یہ احتمال دیا ہے کہ ان آیات کو روئے سخن یہود کی طرف ہے اور انہوں نے اس ضمن میں ابن عباس سے اس کا شانِ نزول بھی نقل کیا ہے، لیکن یہ بعید نظر آتا ہے (غور کریں)۔

پانچویں اور آخری آیت بھی مشرکین عرب کے بارے میں ہے: جب ہماری واضح آیات (بذریعہ پیغمبر) ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ (پیغمبر) بس ایک ایسا شخص ہے جو تمہیں ان کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے، جن کی پرستش تمہارے باپ دادا کرتے تھے (واذا تتلیٰ علیھم اٰیتنا بیناتٍ قالو ما ھذا الا رجلٌ یرید ان یصد کم عما کان یعبدو آباؤ کم)

قرآن کہتا ہے یہ بُری عجیب بات ہے کہ مشرکین آیات بینات (واضح آیات، نشانیوں اور محکم دلائل) کے مقابلے میں تقلید آباء جیسی بے اصل حجت لاتے ہیں اور پیغمبر اکرم کی اس قدر تحقیر کرتے ہیں کہ انہیں ''رجل'' یعنی ایک شخص کہہ کر پکارتے ہیں اور عام لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی خاطر ہمارے بزرگ کہنے کی بجائے تمہارے بزرگ کہتے ہیں۔ اور ان کی تقلید کا واسطہ دیتے ہیں تاکہ پیغمبر اکرمؐ کے مقابل ان کے تعصب اور دشمنی کو ابھاریں۔

ان تمام آیات پر نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ بت پرستی وسعت اور اس کے آئندہ نسلوں تک پہنچنے کا اہم اور بڑا ذریعہ تقلید ہی ہے۔ جب پیغمبر اکرمؐ نے بت پرستوں کی روک ٹوک کی تو سورۂ سباء کی آیت ۴۳ اور زخرف کی آیت ۲۲ کے مطابق ان لوگوں نے آپ کے جواب میں اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے تقلید آباء کو بطور دلیل پیش کیا۔ مزید یہ کہ زمانہ موسیٰؑ (سورۂ یونس'' آیت ۷۸) عہد ابراہیمؑ (سورۂ شعراء۔ آیت ۷۰ تا ۷۴) عصر ہود (سورۂ اعراف۔ آیت ۷۰) اور ایام صالحؑ (سورۂ ہود۔ آیت ۶۲) کے مطابق مشرک و بت پرست سب لوگ اسی تقلید آباء پر ہی تکیہ کرتے رہے ہیں۔

تقلید آباء کا یہ بہانہ صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ سورۂ زخرف کی آیت ۲۳ کے پیش نظر مشرکین اٹھ کھڑے ہوتے تھے، وہ لوگ ہر عہد میں پیغمبران الٰہی کی دعوت سے انکار کرتے ہوئے اپنے آباء کی تقلید پر قائم رہنے اور ان کے طریقے پر چلنے کی آواز بلند کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ تقلید بت پرستی کے پیدا ہونے کا سبب نہیں بلکہ یہ اس کے دوام اور ایک سے دوسری نسل تک پہنچنے کا ایک بڑا عامل ہے۔

---

[1] یہ آیت ایک محذوف جملہ رکھتی ہے اور اصل میں اس کی صورت یہ ہے: ایتبعون الفو علیه اباٰئھم فی کل حالٍ وفی کل شیءٍ ولو کان اٰبائوھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون''

# توضیحات

## (۱) تقلید، اقوام کی ترقی یا انحطاط کا عامل:

اگر جاہل لوگ تقلید کے طور پر عالم و دانش مند افراد کی طرف رجوع کریں تو بلا شک اس سے معاشرے میں تکامل آتا ہے بلکہ اس سے علوم و فنون۔ اعلیٰ آداب و رسوم اور بہترین تربیتی مسائل ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ بچے اپنی تمام معلومات معاشرے سے اسی طریقے سے حاصل کرتے ہیں اور اسی تقلید سے صنعت و حرفت میں ترقی اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اگر تقلید میں معاشرہ ساز اور مثبت رُوح نہ ہو تو معاشرے میں تکاملی حرکت کا وجود نا پید ہو جاتا ہے۔

مثبت تقلید کی مثال خالص پانی جیسی ہے کہ جو انسانی زندگی کی اساس ہے لیکن اگر یہی پانی مختلف کثافتوں سے آلودہ ہو جائے تو کئی ایک بیماریوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک جاہل دوسرے جاہل کی تقلید کرے یا ایک عالم کسی جاہل کی تقلید کرے تو اس سے فساد و بگاڑ بڑھ جاتا ہے۔ ناپسندیدہ عادات عام ہوتی ہیں۔ فکری بے راہ روی اور قسم قسم کے خرافات اور انحرافات ایک سے دوسری نسل اور ایک سے دوسری قوم تک پہنچتے رہیں گے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ تقلید کاہلی اور تعصب سے جنم لیتی ہے۔ جو لوگ تن آسانی کے باعث تحقیق و تلاش کی زحمت اٹھانا نہیں چاہتے وہ تقلید کی طرف رُخ کر لیتے ہیں۔ پھر ایسے متعصب اور ضدیت پسند افراد جو دوسری قوموں کی قوت و شوکت اور عروج و ترقی کے علل و اسباب کو جاننے اور انہیں اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتے وہ اپنی قوم کی منفی سوچوں اور کمزور نظریوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں پس یہی وہ تقلید ہے جو تعصب اور جہالت سے ملی ہوئی اور پستی کی طرف لے جانے والی ہے۔ نیز یہی وہ کورانہ تقلید ہے جو طول تاریخ میں شرک و بت پرستی کے فروغ کا ایک بڑا عامل رہی ہے[1]

## (۲)......ہوائے نفس اور شیطانی وسوسے

آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا پرستی بھی شرک و بت پرستی کے عوامل میں سے ہے، جیسا کہ ہم قصہ سامری میں دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: میں نے کچھ چیزیں دیکھیں جو یہ لوگ نہیں دیکھ سکے۔ میں نے فرستادہ خدا (جبریل) کے آثار پائے، پھر انہیں اپنے ذہن سے دور ہٹا دیا اور بت پرستی کی طرف لوٹ گیا۔ اس طرح میرے نفس نے اس چیز کو میری نظروں میں پسندیدہ بنا دیا (و کذالك سولت لی نفسی)

علاوہ ازیں آیاتِ قرآن سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فریب ہائے شیطانی اور اس کی طرف سے دلوں میں ڈالے جانے والے وسوسے

---

[1] بحث ہائے اقسامِ تقلید، شرائط تقلید ممدوح کورانہ تقلید کے اسباب اور لفظ ''تقلید'' کی شرح کے لیے اس تفسیر کی جلد اوّل میں ''حجاب تقلید'' کے باب کا مطالعہ کریں۔

بھی بت پرستی کا نمود یا اس کی بقاء ووسعت میں ایک عامل کی حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ قصہ بلقیس میں ایا تا ہے۔وجدتھا وقومھا یسجدون للشمس من دون اللہ وزین لھم الشیطان اعمالھم فصدھم عن السبیل فھم لایھتدون یعنی نے ملکہ سبا اوراس کی قوم کواس حال میں پایا کہ وہ خدا کو چھوڑ کر سورج کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، شیطان نے ان کے اعمال کوان کی نظروں میں پسندیدہ بنایا اورانہیں سیدھے راستے سے ہٹا دیا۔لہٰذا وہ راہ ہدایت کونہیں جانتے۔(نمل۔۲۴)

لیکن یادرہے کہ ہوائے نفس اورشیطانی وسوسے اصل میں وہم وخیال، اندھی تقلید اورتعصب وضدیت سے نمود پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم نے ہوائے نفس کا الگ سے ذکرنہیں کیا ہے۔

## (۳)......بت پرستی غلامی اوراستعمار کا عامل ہے:

شرک وبت پرستی ہمیشہ جابروں اورآمروں کا ہتھیار رہا ہے۔اورکے وجوہات یہ ہیں۔

(۱) عوام کی علمی وفکری سطح جتنی پست ہوگئی اسی قدروہ جہلا طاغوتوں کے آلۂ کار بنے رہیں گے۔اس لیے استعمال تحریکیں ہمیشہ جاہل ونادان لوگوں میں پروان چڑھتی ہیں، استعماری سدا اس کوکوشش میں رہتے ہیں کہ بے چارے عوام پر علم کے دروازے بندرہیں تحقیق وجستجو کی کھڑکی نہ کھلنے پائے اوروہ ہمیشہ ہمیشہ اندھی تقلید کی ذلتوں میں پڑے رہ جائیں جیسا کہ قرآن فرعون کے بارے میں کہتا ہے(فاستخف قومه فاطاعوئه) اس نے اپنی قوم کو ذہنی طور پر پست کردیا اوروہ اس کی اطاعت میں لگے رہے۔ (زخرف ۵۴)

بت پرستی کی بنیاد جھوٹے وہم اور بے سروپا خیالات ہیں لہٰذا یہ عوام کو بے وقوف بنانے کا ایک بڑا موثر ذریعہ ہے، اسی لیے بت پرستی جابرحکام کے ہاتھوں میں ایک کارآمد ہتھیار رہا ہے۔

(۲) شرک لوگوں میں اختلاف وانتشار کا سبب ہے جو ہرگروہ کو کسی نہ کسی چیز کی پرستش کرنے کی دعوت دیتا ہے......کچھ لوگ سورج کی پرستش کرتے،بعض چاندکو پوجتے اوربعض ہبل، لات یا عزیٰ کی پوجا کیا کرتے،حتیٰ کہ عرب میں ایک چھوٹی سی قوم قسم قسم کے بتوں کی پوجا کرنے کے باعث سینکڑوں گروہوں میں تقسیم ہوچکی تھی،لیکن توحید ایک ایسا حلقۂ اتصال ہے جس نے ان کے دِلوں کوجوڑ کر ان کے خیالات میں یکسانیت پیدا کرکے انہیں اتحاد واتفاق کی نعمت سے ہم کنار کردیا۔

یہ یادرہے کہ جب تک اختلاف وافتراق کا بازار گرم رہے گا اس وقت تک استعمار کوآنکھوں سُکھ کلیجے ٹھنڈک ہے،کیونکہ پھوٹ ڈالو اورحکومت کرو، استعمار واستثمار (لوگوں کوغلام بنانے اوراُن کی کمائی کھانے) کے لیے ایک قدیم ترین اصول ہے۔اس بناء پر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ فرعونوں،نمرودوں اورابوجہلوں نے ہمیشہ بت پرستی کی طرف داری میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

(۳) متکبرحکمران ہمیشہ اس بات کے خواہاں رہے ہیں کہ عوام ان کے آگے اس طرح جھکیں جیسے خدا کے سامنے جھکتے ہیں اوران کے احکام کومقدس فرمان کی طرح بے چون وچراں تسلیم کریں۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ لکڑی اور پتھر کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں میں سے زندہ خداؤں کو ماننے کے لیے بے عذر آمادہ ہو جاتے ہیں، اس لیے ہم دیکھ رہے ہیں کہ فرعون نے مصر میں اعلان کیا (انا ربکم الاعلیٰ) یعنی میں تمہارا سب سے بڑا خدا ہوں (نازعات۔ ۲۴) اس طرح فرعون نے خود کو تمام بتوں سے بڑا معبود قرار دیا۔

ان تین وجوہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ استعماری افکار ہمیشہ شرک و بت پرستی کی حمایت کرتے اور اسے فروغ دیتے رہے ہیں لیکن طریق انبیاء کہ جو جبر و استبداد اور ضعف و غلامی کی جڑیں کاٹتا رہا ہے وہ توحید و یکتا پرستی اور بیداری و آ گاہی کا طریق راستہ ہے۔

اس مقام پر ہم ایک بار پھر حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی حدیث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا: ان بنی اُمیة اطلقو اللناس تعلیم الایمان ولم یطلقو العلیم الشرك لکی اذا حملوهم علیه لم یعرفوه[1]

یعنی بنی اُمیہ نے لوگوں کو اسلام و ایمان کی تعلیم حاصل کرنے کی آزادی دے رکھی تھی لیکن انہیں شرک کے بارے میں معلومات کے حصول کا موقع نہ دیا تاکہ جب چاہیں ان پر شرک کے رسوم ٹھونس دیں اور وہ سمجھ ہی نہ پائیں۔

یہ امر قرآن کریم میں صراحتاً تو نہیں مگر اشارتاً موجود ہے۔ جیسا کہ سورۂ سباء کی آیت ۳۱ میں ہے: جب ظالمین (مشرکین) دربارِ خداوندی میں حاضر ہوں گے اور ایک دوسرے کے خلاف باتیں کریں گے تو جو لوگ دنیا میں کمزور اور دبے ہوئے تھے وہ ان جابروں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن بن جاتے (ولو ترٰی اذالظالمون موقوفون عندربهم یرجع بعضهم الیٰ بعضٍ نِ القول یقول الذین استضعفوا اللذین استکبروا لولا انتهم لکنا مومنین)۔

## (۴)۔ عوامل شرک کے متعلق آخری بات:

ان تمام مباحث سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ دیگر اجتماعی امور کی طرح شرک و بت پرستی کا بھی کوئی ایک عامل نہیں ہے، بلکہ بہت سے عوامل کے نتیجے میں شرک کی نمود اور نشوونما ہوئی ہے...... ان میں انسان کی محسوسات سے رغبت اور محسوس خدا کی خواہش کے علاوہ علمی و فکری طور پر پسماندہ معاشروں میں فرضی قوتوں کے سہارے ڈھونڈنے کے باعث بت پرستی اور شرک کی بنیاد پڑتی ہے۔ مثلاً شفاعت ،عزت اور تقرب الٰہی میں بتوں کے موثر ہونے کا فرضیہ یہ تو ہم کہ براہِ راست خدا کی عبادت نہیں کی جا سکتی، لہٰذا اس کے لیے کچھ وسائط ہونا ضروری ہیں اور انبیاءؑ و صلحاء کے نام پر بنائے ہوئے مجسموں کی طہارت و برکت کا نظریہ اور اسی طرح کے دیگر خیالات کے تحت شرک وجود میں آیا اور پروان چڑھا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اپنے آباء کی اندھی تقلید اور خداشناسی کے ضمن میں ضروری تحقیق و تلاش پر لوگوں کے آمادہ نہ ہونے، نیز جابر حکمرانوں کی طرف سے عوام کی شرک و بت پرستی سے رغبت کا غلط فائدہ اٹھانے اور اپنے شیطانی مقاصد کو پورا کرنے کی کوششیں بھی طول تاریخ میں شرک و بت پرستی کی پیدائش اور اس کے فروغ کا باعث بنتی رہی ہیں۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۱۵ مطبوعہ بیروت۔

شرک وبت پرستی کی پیدائش اوراس کی بقاء کے ان قوی اسباب وذرایع کے مقابلے میں انبیاء کا توحیدی راستہ ہمیشہ کھلا رہا ہے جس پر قائم رہتے ہوئے ایک طرف وہ انسانوں کو محسوسات کی چار دیواری سے نکل کر مادہ سے بلند تر دنیا کی تسخیر کے لیے علمی وفکری پرواز کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ دوسری طرف سے انہیں خدا کی براہ راست عبادت کرنے، وہم وخیال کی باتوں سے آزاد ہونے، خدا کی بارگاہ میں اس کو سارے جہان کا پروردگار سمجھتے ہوئے سر جھکانے اور ہر حال میں اس کی پناہ حاصل کرنے کی تعلیم دے کر انسانیت کے بلند مقام پر پہنچاتے تھے۔ تیسری جہت سے انبیاء نے بنی نوعِ انسان کو جاہلانہ تقلید کی دیوار توڑنے، عالم ہستی کے بارے میں تحقیق وجستجو کرنے اور خدائے تعالیٰ کی آفاقی وانفسی آیات ونشانیوں کو جانتے پہچاننے کا شوق دلایا۔ انبیاء کے پیغام کی چوتھی جہت یہ ہے کہ انہوں نے انسانوں کو نا اتفاقی اور تفرقہ بازی کے بتوں کو نابود کرنے، اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے، جابروں کی غلامی اور استحصالیوں کے پنجوں سے نکلنے کی ترغیب اور حوصلہ دیا۔

یہ ہیں کفر وایمان اور شرک وتوحید کے اصلی خدوخال!

اپنی اس گفتگو کو ہم تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی کے ان ارشادات کے ساتھ تمام کرتے ہیں۔ جو انہوں نے سورۂ ہود کی آیات ۳۶ تا ۳۹ کے ذیل میں ...... بت پرستی کیسے شروع ہوئی ...... کے عنوان سے رقم فرمائے ہیں!

گذشتہ مباحث سے معلوم ہوا کہ انسان ہمیشہ معنوی چیزوں کو مجسم کرنے اور غیر محسوس چیز کو محسوس ہونے والی چیز کے قالب میں ڈھالنے کے لیے مجسمہ سازی، تصویر کشی اور نقاشی کے جھنجھٹ میں پڑا رہا ہے۔ اس کے علاوہ فطری طور پر وہ ہر طاقت اور بلندی کے سامنے جھکتا اور اس کا احترام کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسان معاشروں میں بت پرستی ہمیشہ جاری وساری رہی ہے، یہ گمراہی نہ صرف ترقی یافتہ معاشروں میں موجود ہے بلکہ وہ انسانی گروہ جنہوں نے اپنی زندگی کی بنیاد انکار خدا پر رکھی ہے۔ وہ بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ جیسا کہ ان کے ہاں بڑی شخصیتوں کے مجسمے نظر آتے ہیں اور وہ ان کے سامنے اسی طرح جھکتے اور ان کا احترام کرتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر زمانہ قدیم کے انسانوں کی بُت پرستی یاد آنے لگتی ہے، قطع نظر اس سے آج بھی مشرق ومغرب میں کروڑوں انسان بُت پرستی کو اپنائے ہوئے ہیں۔

اس سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ وہ لوگ بطور یادگار اپنے بزرگوں اور نامور افراد کے مجسمے بناتے یا ان کی لاشوں کو محفوظ کر لیتے تھے اور پھر احتراماً ان کے آگے جھکتے اور کورنش بجالاتے تھے اسی بنا پر آج بھی بت کدوں اور عجائب گھروں میں بہت سے بت دیکھے جا سکتے ہیں جو مختلف قوموں کے دینی پیشواؤں کے نام پر بنائے گئے ہیں ...... جیسے گوتم بدھ اور برہما جی کے مجسمے سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

ان لوگوں کا مردہ افراد کے مجسموں اور بتوں کے آگے حاضری بھرنا ان شواہد میں سے ہے جو یہ بتاتے ہیں کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ افراد مرنے کے بعد ان سے دور نہیں ہوتے اور ان کی رُوحیں یہاں موجود رہتی ہیں نیز یہ کہ موت کے بعد ان کی توجہات اور افعال اور بھی کامل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ مادی جسم اور مادی اسباب کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ پھر یہ اعتقاد یہاں تک راسخ ہو جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں فرعونِ مصر باوجودیکہ اس کے بت کی پوجا ہو رہی تھی اور وہ دعوائے خدائی کرتا تھا تاہم قوت وبرکت کے حصول کی خاطر وہ بھی دوسرے بتوں

کی پوجا کرتا تھا[۱]

ہاں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم اس بحث کے آخر میں اس عجیب اور حیرت انگیز نکتے کی طرف اشارہ کریں جس کا ذکر مشہور مغربی مورخ ویل ڈورانٹ نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ نیز ہمارے زمانے میں دوسرے ملکوں کا سفر کرنے والے لوگوں نے اپنے مشاہدات کے ضمن میں اس کی تائید کی ہے کہ وہاں بعض بت ایسے بھی ہیں جو مرد وزن کی شرمگاہوں کی صورت میں ہیں اور اکثر لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔

ویل ڈورانٹ لکھتا ہے۔

وہ پہلی چیز جس کی پرستش کی گئی شاید وہ ''چاند'' تھا کہ جو بلند مقام پر موجود رہتا ہے۔ اور چاند عورتوں کا محبوب ترین معبود تھا اور وہ اسے اپنا خاص خدا سمجھ کر اس کی پوجا کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ چاند فضائے عالم پر حکومت کرتا ہے۔ اور برف وبارش اسی سے حاصل ہوتی ہے، حتیٰ کہ قدیم روایتوں کے مطابق مینڈک بھی بارش کے لیے چاند ہی کے آگے تضرع وزاری کرتے ہیں۔

وہ اس سلسلے میں مفصل بیان کے بعد اور سورج، زمین، پہاڑوں اور دریاؤں کی پرستش کیے جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے۔

چونکہ قدیم ادوار کے لوگ اس بات سے بے خبر تھے کہ انسانی نطفے کا انعقاد ''اسپرم'' اور ''اوول'' کی باہمی آمیزش سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ یہ تصور کرتے تھے کہ انسان کی یہ عجیب پیدائش مرد وزن کی جنسی آلتوں سے ہورہی ہے، وہ یہ بھی باور کرتے تھے یہ ان آلتوں میں ایک رُوح پوشیدہ ہے جو ایک انسان کی عجیب وغریب پیدائش کا سرچشمہ ہے پس ان کا یہی مفروضہ آہستہ آہستہ اس کی بنیاد بن گیا کہ وہ ان ہر دو انسانی آلتوں کی الوہیت کے قائل ہوئے اور ان کی شکلوں کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش کرنے لگے۔

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ویل ڈورانٹ یہ بھی لکھتا ہے کہ قدیم اقوام میں کوئی ایسی قوم نہیں ہوئی جو ان دونوں انسانی آلتوں کو پوجتی نہ رہی ہو۔[۲]

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے اشارہ کیا ہے کہ اب بھی جاپان اور بھارت میں بڑے فخر وناز کے ساتھ مرد وزن کی آلتوں کی شکل کے بتوں کو پوجا کی جاتی ہے۔

اس بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اگر انسان انبیاء کی تعلیمات سے انحراف کرے تو کیسے کیسے بدبودار گڑھوں میں جا پڑتا ہے اور کیسے کیسے مضحکہ خیز اور شرمناک افعال انجام دینے لگتا ہے۔

اس دنیا میں رہنے والے پاکیزہ دین کے پیروکار توحید پرست مسلمین ومومنین اس پر جتنا بھی شکر ادا کریں وہ کم ہے کہ انبیاء کی تعلیمات نے انہیں شرک وبت پرستی کی آلودگی اور ایسے ہی دیگر بدترین طریقوں اور راستوں کی طرف جانے سے بچائے رکھا ہے۔

---

[۱] تفسیر المیزان جلد ۱۰ صفحہ ۲۷۴ (ملخصاً)

[۲] ویل ڈورانٹ۔ تاریخ جلد اصفحہ ۹۵ (ملخصاً)

# اقسام توحید

## (۱)توحید ذات (۲)توحید صفات (۳)توحید عبادت (۴)توحید افعال

### توحید کی بنیادی اقسام:

گذشتہ مباحث میں یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کے مطابق تمام انبیاء اور کتبِ آسمانی کی دعوت و پیغام کی جڑ بنیاد مسئلہ توحید ہی ہے جس کے لیے قرآن نے عقلی و منطقی دلائل دیئے ہیں۔ اب ہم اس مقام پر آ پہنچے ہیں کہ توحید کے مختلف گوشوں اور اس کے گونا گوں اقسام کی طرف متوجہ ہوں، ہماری اس بحث سے ''مسئلہ توحید'' کی اہمیت اور بھی واضح ہو گئی۔

علماء علم کلام کے درمیان یہ چیز معروف ہے کہ توحید کے اصلی اور بنیادی شعبے اور قسمیں چار ہیں۔

(۱)　توحید ذات: خدا کی ذات یکتا اور بے مثل و بے نظیر ہے۔

(۲)　توحید صفات: تمام صفات کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے اور یہ اس کی عین ذات ہیں۔

(۳)　توحید عبادت: عبادت و پرستش بس اسی ذات ہی کے لیے ہے۔

(۴)　توحید افعال: خلقت و آفرینش اور کائنات کا انتظام و تدبر یعنی ہر فعل اور ہر حرکت جو اس وسیع عالم میں ہے وہ اسی ذات واحد کی طرف سے ہے۔(لاموثر فی الوجوء الا اللہ) البتہ جیسا کہ اس کی شرح آگے آئے گی یہ چیز انسان کے بااختیار و مختار ہونے سے کوئی منافات نہیں رکھتی۔

خود ''توحید افعال'' کی بھی کئی اقسام ہیں جن میں سے اہم ترین قسمیں یہ ہیں:

(۱)　توحید خالقیت: خلقت و آفرینش صرف اسی کی طرف سے ہے۔

(۲)　توحید ربوبیت: تدبر عالم تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے۔

(۳)　توحید مالکیت: وہی تکوینی مالک و حاکم ہے۔

(۴)　توحید حاکمیت: تشریع و قانون سازی اسی کا کام ہے۔

(۵)　توحید اطاعت: صرف اسی کے فرمان یا اس کے مامورین کی اطاعت و فرمانبرداری ہو گی۔

یاد رہے کہ خدا کے افعال صرف یہ پانچ ہی نہیں ہیں۔ اس لیے توحید افعالی بھی ان میں منحصر نہیں ہے۔ لیکن اس کی پانچ اقسام ایسی ہیں کہ اصلی و بنیادی تقسیم انہی میں آ جاتی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ایک اور نقطہ نظر سے ہم توحید کو دو قسموں یعنی توحید خاص اور توحید عام میں بھی تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱)　توحید خاص: اس میں توحید کی وہی قسمیں شامل ہیں جن کو اس طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے:

(۲) توحید عام: اس کے مختلف پہلو ہیں جن کو اس طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے:

(الف) توحید در نبوت: سارے انبیاء ایک ہی ہدف و مقصد کے لیے سر گرمِ عمل رہے اور ان کا لائحہ عمل ایک ہی تھا، لہٰذا اساس دعوت اور ان کی ماموریت کے لحاظ سے ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے (لا نفرق بین احد من رسلہ)

(ب) توحید در معاد: سب انسان قیامت کے روز ایک ہی عدالت میں حاضر ہوں گے۔

(ج) توحید در امامت: سب آئمہ ایک ہی بات کہتے رہے ایک ہی حقیقت کی پیروی کرتے رہے اور وہ سب ایک ہی نور تھے۔

(د) توحید در نظم و عدالت: تمام انسانوں کے لیے خدائی قانون ایک جیسا ہی ہے۔

(ر) توحید در جامعہ انسانی: خدا کے سب بندے ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں، ان میں رنگ، نسل اور زبان کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور سبھی مل کر ایک ہی معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔

اس مختصر مقدمے کے بعد ہم آیاتِ قرآن کی طرف توجہ کرتے اور توحید کی اقسام میں سے ہر ایک کا جداگانہ تذکرہ کرتے ہیں۔

# توحید ذات و صفات

## اشارہ:

جب توحید ذات کا ذکر ہو تو اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی کوئی شبیہ،نظیر اور مثال نہیں اور وہ ہر لحاظ سے واحد و یکتا اور یگانہ ولاشریک ہے۔

چونکہ گزشتہ مباحث میں معمولاً ذات کا ذکر ہوا اور جن آیات قرآن پر نظر کی گئی وہ بھی توحید ذات ہی سے متعلق تھیں،اس لیے اب ہم اس سے صرف نظر کر رہے ہیں اور یہاں از روئے قرآن خود مسئلہ توحید کی تحقیق کریں گے۔

سب سے پہلے ان آیات پر توجہ کریں:

(۱) لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ۝۱۱ [۴۲:۱۱] (شوریٰ)

(۲) لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهُوۡا عَمَّا يَقُوۡلُوۡنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۝۷۳

(مائدہ)

(۳) قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمۡ يَلِدۡ ۙ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ ۝۳ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴ [۱۱۲:۴] (سورہ اخلاص)

## ترجمہ:

(۱) کوئی اس کی مثل نہیں اور وہ سننے دیکھنے والا ہے۔

(۲) جن لوگوں نے کہا کہ خدا تین میں سے ایک ہے۔وہ کافر ہو گئے،خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں،اگر انہوں نے اپنی اس بات کو ترک نہ کیا تو ان کافروں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔

(۳) کہو......خدا یکتا و یگانہ ہے،خدا بے نیاز ہے نہ اس کی کوئی اولاد ہے،نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کی کوئی شبیہ و مثال نہیں۔

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

## اے وہ ذاتِ جو وہم وخیال سے بلند تر ہے:

(۱) پہلی آیت مختصر الفاظ میں توحید ذاتی کا ذکر کر رہی ہے ،اس میں توحید کی گویا مکمل اور بولتی ہوئی تفسیر ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔(لیس کمثلہٖ شیءٍ)

یہ درست ہے کہ توحید ذات ایک ایسی چیز ہے جو خیال وقیاس اور وہم وگمان سے بلند ہے اور اس ذات کی اصلیت کو سمجھنا ہمارے لیے غیر ممکن ہے کیونکہ ہم ایسی چیزوں کا تصور کر سکتے ہیں جن کی مثل ہم نے دیکھ رکھی ہو یا دیکھی ہوئی چیزوں کا تجزیہ کرنے سے ان دیکھی چیزوں کو جانتے سمجھتے ہیں ،لیکن وہ چیز کہ جس کی کوئی مثال موجود نہ ہو وہ ہمارے وہم وعقل میں نہیں آتی ۔ہم اس ذات کے بارے میں بس اتنا ہی جانتے سمجھتے ہیں ،لیکن وہ چیز کہ جس کی کوئی مثال موجود نہ ہو وہ ہمارے وہم وعقل میں نہیں آتی ۔ہم اس ذات کے بارے مُں بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ ''موجود'' ہے اور اس دُنیا کی وسعتوں میں اس کے افعال اور آثار کو دیکھ کر اس کے اوصاف سے اجمالی واقفیت حاصل کرتے ہیں ،حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان حتیٰ کہ انبیاء ومرسلین اور ملائکہ مقربین بھی اس ذاتِ مقدس کی واقعیت سے شناسا نہیں ہیں ۔

چنانچہ اسی بات کا اعتراف ہی اس کے بارے میں انسان کی معرفت کا آخری درجہ ہے، جیسا کہ ایک مشہور حدیث میں ہے۔ (ماعرفناك حق معرفتك) ''ہم نے تجھے نہیں پہچانا جیسے تجھ کو پہچاننے کا حق ہے۔'' پس پیغمبر اکرمؐ کا یہ فرمان خدا کی نسبت انسان کے عرفان کا آخری نقطہ ہے۔

اس کی واضح دلیل موجود ہے جیسا کہ بحث توحید میں بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے لامتناہی اور غیر محدود ہے لہٰذا خدا کو اس کے غیر کے ذریعے سے نہیں پہچانا جا سکتا۔ جب ہماری عقل وفکر محدود ہے تو وہ ایک غیر محدود حقیقت کو کیسے پا سکتی ہے؟

اس تفسیر کے پیشِ نظر کلمہ کاف جملہ (لیس کمثلہٖ شیءٍ) میں زاہد ہے[1] یعنی کوئی ایسی چیز وجود نہیں رکھتی جو اس ذات کبریاء کی مانند ہو...... ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کے وجود، علم اور قدرت کی کوئی نشانی اس عالم ممکنات میں ظاہر ہو جائے لیکن کائنات میں کوئی بھی مخلوق اس کی مثل نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔

لیکن بعض علماء جو کاف کو زائدہ نہیں سمجھتے انہوں نے کہا ہے: آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مثل خدا جیسی کوئی چیز نہیں اور اس صورت میں مثل کا معنی ذات ہوگا، جیسے ہم کہتے ''تیرے مثل اس غلط راہ پر قدم نہیں بڑھائے گا (یعنی تجھ یہ کام نہیں کرنا چاہیے) بعض کا کہنا ہے کہ یہ ''مثل'' صفات کے معنوں میں ہے کوئی وجود خدا جیسے اوصاف نہیں رکھا، ظاہر ہے کہ ہمارے بحث میں ان تینوں تفسیروں کا نتیجہ ایک ہی ہے

---

[1] تفسیر روح المعانی آیا ہے کہ بعض مفسرین اس آیت میں لفظ ''مثل'' کو زاہدہ تصور کرتے ہیں لیکن ابوحیان نے اس کی تدرید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''لغتِ عرب میں اسم کبھی زائدہ نہیں لا یا جاتا۔

اگر چہ وہ مختلف طریقوں سے اس مطلب تک پہنچتی ہیں۔

یہاں اس حدیث کی طرف توجہ کرنا چاہیے جس میں ہم یوں پڑھتے ہیں: ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے یہ سوال کیا۔(ما راس العلم) یعنی علم کا اعلیٰ ترین مرحلہ کونسا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا (معرفة الله حق معرفته) خدا کی شناخت کرنا جیسا کہ شناخت کا حق ہے۔ پھر فرمایا ان تعرفهٔ بلا مثالٍ لا شبة و تعرفجه الها واحدًا خالقاً قادرًا اوّلا واٰخراً وظاهراً وباطناً لا کفوله ولا مثل له فذالك معرفةُ اله حق معرفته[1] یعنی جان لو کہ اس کی نہ مثال ہے نہ شبیہ......وہ معبود، یکتا، خالق، قادر، اوّل، آخر، ظاہر اور باطن ہے، اس کی نہ کوئی مثال ہے نہ نظیر پس یہ ہے کہ معرفتِ خدا جیسے معرفت کا حق ہے۔

واضح ہے کہ ''حق معرفت'' نسبتی حیثیت رکھتا ہے۔ ویسے اس کی معرفت تک تو کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا۔

نہ بروا ج ذاتش پرد مرغ وہی

نہ برذیل وصفش رسد دست فہم

چوخا صا دریں راہ فرس رندہ اند

بہ ''لااحصٰی'' ازتک فرد ماندہ اند

(۲) جولوگ کہتے ہیں کہ خدا تین اقانیم میں سے ایک اقنوم ہے[2]

دوسری آیت میں قرآن ان کو کافر قرار دے رہا ہے (لقدْ کفر الذین قالو ان الله ثالثِ ثلاثةٍ) اس طرف توجہ کرنا چاہیے کہ یہ آیت نہیں کہتی کہ جو تین خداؤں کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ کافر ہیں بلکہ وہ کہہ رہی ہے کہ جو لوگ خدا کو تیسری اصل یا تیسری ذات تصور کرتے ہیں وہ کافر ہیں۔

مفسرین نے اس کا مطلب سمجھنے کیلئے کئی راہیں اختیار کی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو خدا کو ''اب'' ''ابن'' روح القدس تین میں سے ایک جوہر سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تعدد کے باوجود وہ واحد و یکتا ہے جیسے لفظ ''خورشید'' کہ اس میں سورج کا وجود، روشنی اور حرارت تینوں ہی شامل ہیں اور وہ وجودی طور پر ایک ہی ہے[3]

ایک اور تعبیر کے مطابق اس آیت میں اسی عقیدہ توحید در تثلیث'' کا ذکر ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر چہ خدا تین ہیں لیکن وہ ایک ہی ہیں (تاہم یہ بات غیر معقول ہے کیونکہ تین کا عدد کبھی ایک کے برابر نہیں ہوتا مگر یہ کہ ان دونوں اعداد میں سے ایک حقیقی اور دوسرا مجازی ہو)

تفسیر قرطبی میں کہا گیا ہے۔ کہ یہ آیت نصاریٰ کے خاص فرقوں کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی ملکیہ یا ملکانیہ یعقوبیہ اور نسطوریہ کہ جو

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۱۴۔

[2] ''اقنوم'' کے معنی اصل اور ذات کے ہیں اور اس کی جمع اقانیم ہے، یہ وہ تعبیر ہے جو مسیحی حضرات تین خداؤں اور مسئلہ تثلیث کے لیے پیش کرتے ہیں۔

[3] تفسیر فخر رازی جلد ۱۲ صفحہ ۶۰۔

معتقد ہیں کہ ''اب'' ''ابن'' ''روح القدس'' (باپ خدا۔ بیٹا خدا۔ روح القدس) تینوں ایک ہی ذات ہیں [۱]

لیکن ظاہراً یہ اشتباہ ہے، کیونکہ یہ عقیدہ تو تمام مسیحیوں کا ہے کہ وہ ''تثلیث میں توحید'' کے قائل ہیں علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ تینوں میں سے ہر ایک خدا ہے خدا کا فقط ان میں سے ہر ایک پر منطبق ہے اور (باپ۔ بیٹا، روح القدس) تین ہیں لیکن دراصل ایک ہی ہیں [۲]

مگر ظاہر آیت سے مراد کچھ اور ہے، اصل بات یہ ہے کہ خدا کو تیسرا اقرار دینا کفر ہے بلکہ خدا کو مادی موجودات کے مانند اور ہم پلہ تصور کرنا اور تیسری ذات شمار کرنا یا بہ الفاظ دیگر اس میں وحدت عددی کا قائل ہونا کفر ہے (غور کریں)

اس مفہوم و مطلب کی عمدہ تشریح امیر المومنینؑ کے ایک فرمان میں موجود ہے۔

جنگِ جمل کے دوران ایک اعرابی حضرت امیر المومنینؑ کی خدمت میں آیا اور کہا: یا حضرت! کیا آپ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے؟ اچانک لوگوں نے اس پر ہجوم کیا اور کہنے لگے: اے اعرابی! کیا تو نہیں دیکھتا کہ امیر المومنینؑ بہت سے اہم مسائل کی طرف متوجہ ہیں اور پھر ہر بات کا ایک موقع ہوتا ہے۔

لیکن امیر المومنینؑ نے فرمایا: (دعوہ فان الذی یریدہ الاعرابی هو الذی نریدہ من القوم) اس کو چھوڑ دو کہ کچھ یہ اعرابی ہم سے پوچھ رہا ہے وہی چیز ہم اپنے دشمن گروہ میں دیکھنا چاہتے ہیں (وہ توحید ہی ہے کہ جس کی خاطر ہم ان سے جنگ کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا: اے اعرابی! یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے تو اس کے چار معنی ہیں، ان میں سے دو معنی ایسے ہیں جو خدا کے بارے میں درست اور روا نہیں اور دو معنی وہ ہیں جو اس ذات کے لیے ثابت اور مسلم ہیں۔

وہ دو معنی جو اس کے لیے روا نہیں، یہ ہیں کہ کوئی کہے ''خدا واحد ہے'' اور اس کا مقصد واحد عددی ہو یا یہ درست نہیں ...... اس لیے کہ جو چیز جیسی دوسری نہیں رکھتی وہ اعداد میں داخل نہیں ہوتی اور اس کے بارے میں ایک۔ دو کے اعداد غیر ضروری ہیں) پھر کیا تو نہی دیکھتا کہ جو یہ کہتا ہے کہ انہ ثالث ثلاثةٍ یعنی خدا تین میں تیسرا ہے، قرآن اسے کافر گردانتا ہے۔ اسی طرح جو یہ کہے کہ وہ واحد ہے اور اس کے خیال میں واحد نوعی کی بات ہو تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کی مثال اور شبیہ متصور ہو سکتی ہے۔ جب کہ وہ کسی نوع میں شمار ہونے سے بلند و برتر ہے۔

ہاں توحید کے دو معنی جو خدا کی شان کے لائق ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ کوئی کہے ''وہ واحد ہے'' یعنی اس کی کوئی مثال و شبیہ نہیں ہے اور ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے دوسرا معنی جو توحید الٰہی کے لیے مناسب ہے وہ یہ ہے کہ کوئی کہے خداوند متعال احدی المعنی یعنی اس کی ذات میں وہم، عقل اور خارج میں ہرگز تقسیم نہیں ہو سکتی یقیناً ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے [۳]

---

[۱] تفسیر قرطبی جلد ۴ صفحہ ۲۲۴۶ اور یہی بات دیگر تفسیروں جیسے رُوح البیان والمنار میں بھی اس آیت کے ذیل میں آئی ہے۔

[۲] تفسیر المیزان جلد ۶ صفحہ ۷۳۔

[۳] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۰۶ حدیث ۱

(۳) آیات کے تیسرے اور آخری مجموعے میں جو سورۂ اخلاص میں شامل ہیں......خدائے تعالیٰ کی یگانگی و یکتائی کو بطریق احسن بیان کیا گیا ہے۔ان آیتوں میں وہ جامعیت پائی جاتی ہے کہ یہ بیک وقت نصاریٰ کی تثلیث کو نابود کرتی ہیں مجوس (آتش پرست پارسیوں) کے عقیدۂ ثنویت (دوگانہ پرستی) کی نفی کرتی ہیں اور مشرکین کے متعدد معبودوں (دیوتاؤں) کے مقابل خدا کی وحدانیت کو ثابت کرتی ہیں سب سے پہلے فرمایا کہو......خدا یکتا و یگانہ ہے(قل هو الله احد)

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے توحید کے متعلق مختلف سوالات کیے جاتے تھے، آپ کو حکم دیا گیا کہ ان سب کا جواب ایک مختصر سی آیت میں دے دیں، جس کے الفاظ کم اور معانی بہت زیادہ ہیں یعنی یہ قلیل کلمات بہت سے مضامین اور کثیر دلائل پر مشتمل ہیں۔

''احد'' اصل میں ''وحد'' تھا جس کا مادہ ''وحدت'' ہے اس کا واؤ ہمزہ میں تبدیل ہوگیا اور یوں، ''وحد'' سے ''احد'' بن گیا ہے اس لیے بعض علماء کے نزدیک ''واحد'' اور ''احد'' کا معنی ایک ہی ہے بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہوا ہے کہ ان دونوں لفظوں کا معنی ایک ایسی ذات ہے، جس کی کوئی مثال نہیں[۱]

لیکن بعض لوگوں نے ''واحد'' اور ''احد'' میں فرق کیا اور کہا ہے کہ ''احد'' خدا کی خاص صفات میں سے ہے اور یہ انسان یا کسی اور شے پر نہیں بولا جاتا، بعض کا کہنا ہے کہ ''واحد'' نفی و اثبات دونوں میں استعمال ہوتا ہے جب کہ ''احد'' صرف نفی کے لیے لایا جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ''احد'' میں وحدتِ ذات اور ''واحد'' میں وحدت صفات کی طرف اشارہ ہے، ''احد'' اس ذات پر بولا جائے گا، جو کثرت کو قبول نہ کرتی ہو، یعنی خارج اور ذہن میں اس کے لیے کثرت کا شائبہ نہیں لہٰذا اسے شمار نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن ''واحد'' کے بعد دو اور تین کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''احد'' اس ذات کے بسیط ہونے اور ہر قسم کے اجزاء سے پاک و منزہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جبکہ ''واحد'' اس کی یکتائی اور بے مثل و بے مانند ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

لیکن ان چاروں تفسیروں میں سے کسی کے لیے بھی کوئی واضح دلیل نہیں ہے، مثلاً اتوار کو یوم الاحد کہتے ہیں اور قرآن میں خدا کو ''الٰہ واحد'' کہا گیا ہے (بقرہ۔ ۱۶۳) اسی طرح ''احد'' اثبات کی صورت میں بھی آیا ہے جیسے آیت زیر بحث اور دیگر آیاتِ قرآن میں[۲] ہے

بہر حال قول صحیح یہی ہے کہ ''احد'' ''احد'' دونوں ایک ہی معنی رکھتے ہیں، بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ''الله احد'' خدائے تعالیٰ کی معرفت کے لیے کامل ترین جملہ ہے جو عقل انسانی میں آسکتی ہے۔ کیونکہ ''الٰہ'' میں ایسی ذات کی طرف اشارہ ہے جو تمام صفات کمال یعنی تمام صفات ثبوتیہ کو چاہے۔ اور ''احد'' اس ذات سے تمام صفات سلبیہ کی نفی پر دلالت کرتا[۳] ہے۔

قرآن مجید ان آیات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے: خدا قائم بالذات، بے نیاز ہے، ہر حاجت مند اسی کی طرف توجہ کرتا اور اسکی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے (الله الصمد)

---

[۱] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۲۲۔

[۲] مثلاً سورۂ توبہ آیت ، سورۂ نساء آیت ۴۳، سورۂ مریم آیت ۲۶، سورۂ بقرہ آیت ۱۸۰ سورۂ کہف آیت ۱۹ وغیرہ ہم۔

[۳] تفسیر فخر ارازی جلد ۳۲ صفحہ ۱۸۰

''صمد'' مقاییس اللغۃ کے مطابق اس میں بنیادی طور پر دو چیزیں شامل ہیں...... پر ہونا، قصد و ارادہ رکھنا اور استحکام و صلابت...... جب یہ لفظ خدا کے لیے بولا جائے تو مطلق استغناء اور کامل بے نیازی مقصود ہوتی ہے، کیونکہ تمام حاجت منداس کی طرف رجوع کرتے ہیں، نیز اس سے خدا کا واجب الوجود اور قائم بالذات ہونا مراد ہوتا ہے۔

ممکن ہے ان دونوں باتوں کی بنیاد ایک ہی ہو اور اس سے بھی ایسی ذات مراد ہو جس میں استحکام و صلابت اور قیام بالذات پایا جاتا ہے۔ اس طرح وہ ذات کامل طور پر بے نیاز ہوگی کہ سبھی نیاز منداس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے لفظ ''صمد'' کے ذریعے تمام صفات ثبوتیہ و سلبیہ کی طرف اشارہ پایا جائے گا یہی وجہ ہے کہ روایات میں ''صمد'' کے بہت سے معنی ذکر کیے گئے ہیں جو خدا کی کسی نہ کسی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہیں[1]

بہر حال اس ایت کا پہلی آیت سے رابطہ و تعلق پوشیدہ نہیں کہ جس میں خدا کی وحدانیت کا تذکرہ ہوا ہے، اس لیے کہ ''واجب الوجود'' بے نیاز ہوگا اور تمام محتاجوں کا اس کی طرف رجوع کرنا ضروری اور ایسی ذات کی یکتائی و یگانگت اس کا لازمہ ہے۔

اس سے اگلی آیت بھی حقیقت توحید پر زور دیتی ہے کیونکہ یہ نصاریٰ کے تین خداؤں (باپ، بیٹا، روح القدس) کے عقیدے کی تردید کرتی ہے، یہودیوں کی طرف سے عزیز کے خدا کا بیٹا ہونے کو باطل قرار دیتی اور مشرکین عرب کے اس نظریئے کی تغلیط کرتی ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں چنانچہ ان بے اصل اعتقادات اور ایسے ہی دیگر مفروضات کی نفی کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ نہ تو اس کی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے(لم یلد ولم یولد)

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ جو وجود فرزند یا باپ رکھتا ہو یقیناً اس کی مثال اور شبیہ بھی ہوتی ہے، کیونکہ باپ اور بیٹے کی مماثلت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے لہٰذا ایسا وجود یکتا و بے نظیر نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اس بیان کو مکمل کرنے کے لیے فرماتا ہے۔ اس کی کوئی شبیہ و مثال نہیں ہے(وَلم یکن له کفواً احدٌ)

اس ترتیب کے ساتھ اس سورۃ کی آیات خداوند کریم کی یکتائی و یگانگی اس ذات کی واحدانیت اور اس کی مثل و نظیر کے نہ ہونے کی تاکید پر تاکید کرتی چلی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر اس سورۃ کی ہر آیت اپنے سے پہلی آیت کی تفسیر کرتی ہے اور مجموعی طور پر توحید ذات کو جامع اور کامل طریقے سے واضح کرتے ہوئے توحید کے شجر ثمر دار کو اس کے تمام تر شاخ و برگ کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲۷ میں سورۂ اخلاص کی تفسیر میں لفظ ''صمد'' پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے۔

# توضیحات

## (۱) توحید ذات کا گہرا مفہوم:

بہت سے لوگ توحید کے معنی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور دو نہیں ہیں۔ جیسا کہ امیر المومنینؑ کی فرمودہ حدیث میں آیا ہے جو انہیں آیات کی تفسیر میں مذکور ہوئی۔ توحید کے لیے یہ تعبیر درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مفہوم واحد عددی ہے (یعنی خدا کے ساتھ کسی دوسرے کا تصور ممکن نہیں لیکن وہ وجود خارجی نہیں رکھتا) یقیناً یہ قول درست نہیں اور صحیح یہ ہوگا کہ کہا جائے...... خدا ایک ہے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کا تصور نہیں آتا۔ بہ الفاظ دیگر خدا کی کوئی مثل، نظیر اور شبیہ نہیں ہے کہ نہ کوئی چیز اس جیسی ہے اور نہ وہ کسی چیز جیسا ہے اس لیے کہ ایک بے نہایت ولا محدود وجود اسی صفت کا مالک ہوتا ہے۔

اسی دلیل کے مطابق ہم ایک حدیث میں بھی دیکھتے ہیں کہ امام جعفر صادق نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا (ای شئی الله ا کبر) اللہ اکبر کا کیا مطلب ہے؟ اس نے عرض کیا (الله ا کبر من کل شيءٍ) خدا ہر چیز سے بڑا ہے۔ امامؑ نے فرمایا (فکان ثم شيءٍ فیکون ا کبر منه) آیا کوئی چیز اس کی مانند ہے کہ خدا اس سے بڑا ہے؟ صحابی نے عرض کیا: (فما هو) پھر اللہ اکبر کا مطلب کیا ہے؟ فرمایا (الله ا کبر من ان یوصف) خدا اس سے بلند ہے کہ اس کا وصف بیان ہو سکے[1]

## (۲) توحید صفات کا مفہوم:

جب ہم کہتے کہیں توحید کی ایک شاخ ''توحید صفات'' بھی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ جس طرح اپنی ذات میں ازلی وابدی ہے اسی طرح اس کی صفات...... علم، قدرت، ارادہ وغیرہ بھی ازلی وابدی ہیں۔ دیگر یہ کہ اس کی یہ صفات زائد بر ذات نہیں بلکہ عین ذات ہیں اور پھر یہ صفات ایک دوسری سے جدا نہیں یعنی علم وقدرت وغیرہ باہم ایک ہی ہیں اور عین ذات بھی ہیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ جب ہم اپنی طرف نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ابتداء ہم صفات سے عاری تھے اور پیدائش کے وقت علم وقدرت وغیرہ نہیں رکھتے تھے۔ بعد میں ہم آہستہ آہستہ پلے بڑھے تو یہ صفات پیدا ہوئیں، الہٰذا ہم کہتے ہیں کہ ہماری یہ صفات ہماری ذات پر زائد ہیں اور ممکن ہے کہ ایسا وقت بھی آجائے کہ ہم تو ہوں مگر یہ زور بازو اور علم ودانش ہم میں موجود نہ ہوں۔ نیز یہ بھی واضح ہے کہ یہ علم وقدرت ہمارے اندر جدا جدا ہیں۔ یعنی قوت بازوؤں میں ہے اور علم ہماری رُوح میں جاگزیں ہے۔

لیکن خدا کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں ایسا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے، اس کی تمام ذات علم اور وہ بذاتہٖ قدرت ہے پس اس کی سب صفات مرکز وحدت میں باہم یگانگت رکھتی ہیں۔ البتہ ہم مانتے ہیں کہ ہم ایسی صفت سے عاری ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے اس مطلب

---

[1] معانی الاخبار شیخ صدوق صفحہ ۱۱ حدیث ۱۔

ومفہوم کو سمجھنا بہت مشکل ہے اور سوائے عقلی دلائل کے اس تک ہماری رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں۔

## (۳) توحید صفات کی دلیل:

مخلوقات کی صفات میں گم ہوجانا اور توحید صفات کے مفہوم کو سمجھ نہ پانا ہی اس کا سبب بنا کر بہت سے ماہرین علم کلامِ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں صحیح راستے سے دُور جا پڑے، ان میں سے ایک گروہ ''کرامیہ'' کا ہے جو محمد بن کرام سیستانی کے پیرو ہیں...... وہ کہتے ہیں کہ آغاز میں خدا کسی صفت سے متصف نہ تھا اور بعد کے زمانہ میں وہ تمام صفات کا مالک بنا ہے۔

یہ قول یہ گفتار اس قدر غلط ہے اور ناپسندیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ باور نہیں کرسکتا کہ ایک شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ شروعات میں خدا عاجز وناتواں تھا اور بعد میں صاحب قدرت ہوا پھر یہ قدرت کس نے اسے دی اور کس نے اسے علم آگاہی سے ہم کنار کیا؟

اس سلسلے میں یہ احتمال دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی مراد صفاتِ فعلی رہی ہیں۔ جیسے خالقیت اور رازقیت کہ جن کے لیے ضروری ہے کہ خدا کسی چیز پر قدرت ہونا، اس کو وجود میں لانے سے الگ ہے)۔

لیکن توحید صفات پر گفتگو کرنے کا صفاتِ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہمارا رُوئے سخن خدائے تعالیٰ کی صفات ذات میں سے علم وقدرت کی طرف ہے، جیسا کہ آگے تفصیل سے بیان ہوگا۔ صفات ذات اور صفات فعل کا معاملہ باہم گرا الگ الگ ہے۔ صفات فعل ایسی ہیں کہ ہماری عقل افعال خداوندی کا مشاہدہ کرنے کے بعد ان سے واقف ہوتی اور اور انہیں ذات الٰہی سے نسبت دیتی ہے۔ (اس چیز کی شرح آپ کو اسی کتاب میں ملے گی)

آیات قرآن میں وحدت صفات کے اثبات کی طرف واضح ترین اشارہ (لیس کمثلهٖ شیٌٔ) اور (قل هو الله احد......) ہے کہ جن کی تفسیر اوپر گزر چکی ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ذاتِ مقدس میں کسی طرح کی دوئی کا گزر نہیں ہے۔

اس بارے میں عقلی دلائل کو رُو سے درج ذیل نکایت پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے:

(۱) گذشتہ مباحث سے ثابت ہو چکا ہے کہ خدائے تعالیٰ ایک ایسا وجود ہے جو ہر جہت سے لامحدود ہے اس دلیل کے مطابق کوئی صفت کمال اس کے وجود سے باہر نہیں اور جو کچھ بھی ہے وہ اس کی ذات میں جمع ہے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری صفات حادث ہیں، یعنی ہم میں آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم وجودی طور پر محدود ہیں اور اسی محدودیت کے باعث اوصاف وکمالات ہماری ذات سے باہر ہیں۔ کہ وقتاً فوقتاً ہم انہیں حاصل کرتے ہیں، لیکن ذات الٰہی کہ جو کمالِ مطلق ہے تو کوئی وصف کیونکر اس سے باہر تصوّر کیا جاسکتا ہے؟

(۲) اگر ہم اس کی صفات کے زائد بر ذات ہونے کے قائل ہوجائیں اور اس کی صفات مثل علم وقدرت کو اس سے الگ سمجھیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے مرکب یعنی جو ہر وعرض بلکہ بہت سے عوارض کا مجموعہ تصور کیا جائے حالانکہ سابقہ بیانات میں ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی ذات میں عقلی وخارجی کسی طرح کی ترکیب وتقسیم نہیں ہے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں بڑے ہی لطیف انداز میں توحید صفات کی طرف اسی طرح اشارہ فرمایا ہے۔

وكمال الاخلاصِ لهٗ نفي الصفاتِ عنه ، لشهادة كل صفةٍ انها غير الموصوفِ وشهادة كل موصوفٍ انه غير الصفَةِ، فمن وصف الله سبحانهٗ فقدْ قرنَهٗ. ومن قرنهٗ فقد ثناهٗ، ومن ثناهٗ فقد جزأهٗ، ومن جزأهٗ فقد جهلهٗ.

کمال اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے۔ کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے، ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی چیز ہے، لہٰذا جس نے ذاتِ الٰہی کے لیے صفات تسلیم کیں اس نے ذاتِ کا دوسرا ساتھی مان لیا جس نے اس کی ذات کا کوئی اور ساتھی مانا اس نے دوئی پیدا کی جس نے دوائی پیدا کی، اس نے اس کے لیے جز بنا ڈالا اور جس نے اس کے لیے جزء مان لیا وہ اسے جان نہیں سکا۔

امیر المومنینؑ اس مختصر سی عبارت میں نہایت مدلل طریقے سے خداوند تعالیٰ سے نفی صفات (جیسے ممکنات کی صفات جو زائد بر ذات ہیں) کے بعد واضح طور بیان فرماتے ہیں کہ جو خدا کی ایسی صفات کا قائل ہو وہ اسے قابلِ تقسیم یا مرکب تصور کرتا ہے اور یہ اس کی انتہائی جہالت اور معرفت سے دور ہونے کی علامت ہے۔

# توحید در عبادت

## اشارہ:

اقسامِ توحید میں سب سے اہم توحید در عبادت ہے، اس کے سوا ہم کسی کی پرستش نہیں کرتے، اس کے غیر کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے اور اس کے بغیر کسی کے آگے سر بہ سجود نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دعوتِ انبیاء کی بنیاد اور آئین (اسلامی) کی پہلی شق یہی مسئلہ توحید در عبادت ہے، اور مشرکین کے ساتھ بحث و تکرار کا محور بھی یہی ہے۔

توحید عبادت، توحید ذات و صفات کا لازمہ ہے۔ کیونکہ جب یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ وہ واجب الوجود اور اس کا غیر ممکن الوجود اور محتاج ہے تو پھر اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ عبادت صرف اور صرف اسی کی ہو۔ وہی کمال مطلق ہے کوئی اور نہیں۔ عبادت کا مقصد کمال کی طرف جانا ہے لہٰذا عبادت اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیات قرآن دعوت توحید سے بھری ہوئی ہیں، ان میں دیئے گئے اس اہم پیغام تک رسائی کے لیے ہم چند آیات کا بطور خاص ذکر رہے ہیں اور اس ضمن کچھ اور آیتوں کو بھی سامنے لائیں گے۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کے حضور پیش ہوتے اور آیات ذیل کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(۱) وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ۚ
فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ هَدَى اللّٰهُ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ حَقَّتۡ عَلَيۡهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ
فَانْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۳۶ [۱۶:۳۶] (نحل)

(۲) وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا
فَاعۡبُدُوۡنِ ۝۲۵ (انبیاء)

(۳) لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖ فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ
غَيۡرُهٗ ؕ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ۝۵۹ [۷:۵۹] (اعراف)

(۴) وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا
يُشۡرِكُوۡنَ ۝۳۱ [۹:۳۱]

(۵) قُلۡ اِنِّىۡ نُهِيۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ

اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ۝۵۶

(انعام)

(۶) وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۝۹۹﴿الحجر: ۹۹﴾

(۷) وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۥ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۝۵﴿البينة: ۵﴾

(۸) وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۝۳۶﴿مريم: ۳۶﴾

(۹) يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ۝۵۶ ﴿العنكبوت: ۵۶﴾

(۱۰) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴿النور: ۵۵﴾

(۱۱) وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝۸۰ [۳:۸۰] ﴿آل عمران: ۸۰﴾

(۱۲) وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۝۱۵ ﴿الرعد: ۱۵﴾

## ترجمہ:

(۱) ہم نے ہرامت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور طاغوت سے اجتناب برتیں، ان میں ایک گروہ کو خدا نے ہدایت دی اور ایک گروہ پر گمراہی چھا گئی، پس تم روئے زمین پر چلو پھرو، اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

(۲) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ جس کی طرف یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں اس لیے میری ہی عبادت کرو۔

(۳) ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا اے میری قوم! تم لوگ صرف خدائے یگانہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (اگر تم کوئی اور راہ اپناؤ گے تو) میں تمہارے اوپر عذاب کے بڑے دن سے ڈرتا ہوں۔

(۴) انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اس سے پاک ومنزہ ہے، جیسے وہ اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔

(۵) (اے نبی) کہو کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے، جنہیں خدا کے سوا تم پکارتے ہو، کہو کہ میں تمہاری ہوا وہوس کی پیروی نہیں کرتا، ایسا کروں تو گمراہ ہو جاؤں گا، اور ہدایت پانے والوں سے نہ ہوں گا۔

(۶) اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتا رہ...... یہاں تک کہ تجھے یقین (موت) آ جائے۔

(۷) اور انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ اپنے دلوں کو خالص کر کے اور یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں، نماز قائم کریں اور زکات دیں۔ یہی نہایت سیدھا اور صحیح دین ہے۔

(۸) اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

(۹) اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی بندگی کرتے رہو۔

(۱۰) وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح بجالاتے ہیں، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ یقیناً وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطا کی تھی۔

(۱۱) وہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم انبیاء اور فرشتوں کو اپنے معبود بنا لو، کیا وہ تمہیں کفر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔

(۱۲) جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی یا مجبوری سے خدا کے لیے سجدہ ریز ہے۔ اسی طرح ان رات اور ان کے سائے (بھی سجدہ گزار ہیں)

# مفردات کی تشریح:

''عبادت'' و ''عبودیت'' ہر دو کا معنی اظہار خضوع و فروتنی ہے۔

المفردات میں راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ ان ہر دو الفاظ کا عمیق ترین مفہوم یہ ہے کہ اس ذات کے سامنے انتہائی خضوع و عاجزی کرنا کہ جس کے انعام و اکرام بے انتہا ہوں......یعنی خداوند قدوس۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کی اساس لفظ ''عبد'' ہے جس کا معنی ''بندہ'' ہے البتہ کبھی اس کا اطلاق ہر انسان پر ہوتا ہے خواہ وہ آزاد یا غلام ہو (جیسے لسان العرب و کتاب العین میں ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ سبھی انسان خدا کے بندے ہیں اور کبھی لفظ ''عبد'' خاص طور غلام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ راغب اصفہانی مزید کہتا ہے کہ ''عبد'' کی چار اقسام ہیں:

(۱) ''عبد'' بہ معنی غلام جن کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔

(۲) ''عبد'' بہ معنی مخلوق۔

(۳) ''عبد'' بہ معنی خادم جو مقام خدمت و عبودیت میں ہو، اس کی دو قسمیں ہیں۔

۔بندہ خدا......بندۂ دنیا......لہٰذا کبھی عباد الرحمان کہا جاتا ہے۔ اور کبھی عبید الدنیا۔

(۴) مجمع البحرین میں ہے کہ ''عبد'' کبھی حزب و گروہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے۔

آیہ شریفہ: فادخلی فی عبادی (فجر۔۲۹) یعنی میرے بندوں کے گروہ میں داخل ہو جا یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ''عبادت'' کی دو اقسام ہیں۔

(۵) عبادت اختیاری......جس کا آیاتِ قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔

(۲) عبادت غیر اختیاری......جیسے قرآن میں آیا ہے۔ وان من شیءٍ الا یسبح بحمدِہٖ۔

(اسراء ۴۴) یعنی ہر موجود خدا کی حمد کر رہا ہے۔

مجمع البحرین میں طریحی کہتے ہیں، حکماء کے نزدیک عبادت کی تین قسمیں ہیں:

(۱) جسمانی عبادت......جیسے نماز، روزہ......

(۲) روحانی عبادت......جیسے توحید، نبوت، معاد وغیرہم عقائد دینی پر یقین رکھنا۔

(۳) اجتماعی عبادت......جیسے دشمن کے خلاف جہاد اور مجاہدین کی کمک کرنا۔

طاغوت ''مبالغے'' کا صیغہ ہے اور اس کا مادہ ''طغیان'' [1] ہے جس کا معنی حد سے تجاوز ہے۔ لہٰذا لفظ طاغوت کا اطلاق ہر سرکش اور

---

[1] بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ یہ لفظ اصل میں ''طغووت'' تھا پھر لام الفعل کو عین الفعل کی جگہ لایا گیا اور ''واؤ'' ماقبل مفتوح ''الف'' میں تبدیل ہوا اور یہ ''طاغوت'' ہو گیا۔

متجاوز پر ہوتا ہے جیسے شیطان، جادوگر، ظالم حاکم اور غلط حاکم اور غلط راستے کو بھی طاغوت کہا جاتا ہے ہے، یہ لفظ مفرد و جمع ہر دو صورتوں میں مستعمل ہے۔

مجمع البیان میں طبرسی نے آیۃ الکرسی کی تفسیر میں ''طاغوت'' کے پانچ معنی ذکر کیے ہیں یعنی شیطان، کاہن، جادوگر سرکش جن و بشر بت......لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام اقوال کی بازگشت، ایک ہی جامع مفہوم کی طرف ہے کہ جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے۔

# آیات کی جمع آوری تفسیر

## معبود فقط وہی ہے:

(۱) پہلی آیت میں ''توحید عبادت'' کو تمام انبیاء کا بنیادی ہدف ومقصد قرار دیا گیا ہے، فرمایا: ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور طاغوت سے اجتناب برتیں۔

(ولقد بعثنا فی کل امۃٍ رسولاً ان اعبدواللہ واجتنبو الطاغوت)

یہ قول ان لوگوں کے جواب میں ہے جن کا تذکرہ اس سے پہلی آیت (۳۵ نحل) میں آیا ہے، ان کا کہنا تھا کہ خدا یہ چاہتا ہے ہم بت پرستی کریں اور وہ ہمارے اس عمل پر راضی ہے۔ ان کے اس بے اصل نظریئے کے رد میں قرآن کہتا ہے'' بلا استثناء تمام انبیاء کی دعوت و تبلیغ وعبادت خدا کے لیے تھی سبھی نے غیر خدا کی پرستش سے روکا، یہ کیسی جھوٹی نسبت ہے جو تم خدا کی طرف دے رہے ہو، پھر فرماتا ہے کہ ''انبیاء کی دعوت کے بعد لوگوں کے دو گروہ بن گئے...... پہلا گروہ ان کا مخالف تھا جس پر گمراہی چھا گئی۔(ومنھم من حقت علیہ الضللۃ)

پھر حکم دیا جا رہا ہے، پس تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا(فسیروا فی الارض فانظرو کیف کان عاقبۃُ المکذِبین) ہاں یہ لوگ توحید سے منہ موڑ کر طاغوت کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔ تو گمراہی کی بدبختیوں نے انہیں گیر لیا اور وہ تاریکیوں میں ڈوب گئے۔ یوں عذاب الٰہی نے انہیں آ پکڑا۔

یہاں ایک نکتہ لائق توجہ ہے کہ لوگوں کے ہدایت پانے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے کیونکہ جب تک اس کی توفیق اور امداد شامل حال نہ ہو، کوئی شخص اپنی ہمت سے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا اس کے مقابلے گمراہی کی نسبت خود ان لوگوں کی طرف ہے کہ یہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ تھا۔

(۲) دوسری آیت میں اسی چیز کا ذکر ایک اور انداز سے ہو رہا ہے جو ایک قاعدہ کلیہ اور اصل دائمی کی صورت میں ہے، جیسا کہ فرماتا ہے'': ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ جس کی طرف یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں اس لیے میری ہی عبادت کرو، (وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ الانوحی الیہ انہ لاالہ الاانافاعبدونِ)

توجہ رہے کہ ''نوحی'' فعل مضارع ہے جو ''استمرار ودوام'' کی دلیل ہے یعنی ''توحید عبادت'' کا دائمی حکم سب انبیاء کو دیا گیا اور سب کی دعوت کا بنیادی اصول یہی تھا وہ اپنی پوری دعوت میں یہ پیغام پہنچانے اور اسی کی تبلیغ کرنے پر مامور تھے لہٰذا مسئلہ ''توحید عبادت'' ایک قاعدہ

کلیہ اوراساس وبنیاد کے طور پر تمام انبیاء کے وقتوں میں پیشِ نظراور ریز عمل رہا ہے۔

(۳) تیسری آیت میں سب سے پہلے اولوالعزم پیغمبر شیخ الانبیاء نوحؑ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان کی دعوت کے آغاز سے اختتام تک توحیدِ عبادت اور بتوں سے دوری کے سوا کوئی اور مسئلہ امیت نہیں رکھتا تھا، جیسا کہ فرماتا ہے ہے: ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا کہ اے میرے قوم! تم لوگ صرف خدائے یگانہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (لقد ارسلنا نوحاً الیٰ قومیه فقال یٰقومِ اعبدو الله مالکم من الٰہٍ غیرہٗ)

اس جملے سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ بت پرستی سعادت انسانی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے یہی وجہ ہے کہ باغ توحید کے باغبان پیغمبروں نے رُوح انسانی کی سرزمین میں فضیلت کے پھولوں کی آبیاری اور پورش کے لیے ہر کام سے پہلے گرہ ہمت باندھی تا کہ توحید کے ہتھوڑے سے اس راستے کے پتھر کو چکنا چور کر دیا جائے، خاص طور پر حضرت نوح کے زمانے میں قسم قسم کے بت موجود تھے جیسا کہ سورۂ نوح کی آیت ۲۳ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ودّ سواع، یغوث، یعوق اور نسر سمیت پانچ مشہور بت تھے، جو بالترتیب مرد، شیر، گھوڑے اور باز کی شکل میں تھے۔ وہ لوگ ان کی پرستش کرتے اور اس پر فخر بھی کیا کرتے تھے۔

جب حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ یہ لوگ بت پرستی پر اصرار کرتے ہیں تو آپ نے انہیں عذاب الٰہی سے ڈرایا جیسے اس آیت کے آخر میں ہے، تمہاری اس گمراہی اور بت پرستی کی وجہ سے میں "تمہارے اُوپر عذاب کے بڑے دن سے ڈرتا ہوں، ظاہری طور پر عذابِ عظیم سے مراد وہی تباہ کن طوفان تھا جس نے اس قوم کو گھیر لیا سابقہ اقوام میں سے کسی کو ایسا عذاب نہ ہوا تھا کہ جو اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہو اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے قیامت کے دن کا عذاب مراد ہے۔(انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم [۱])

تفسیر المیزان میں ہے کہ اس چھوٹی سی آیت میں اصول دین میں سے دو اصلوں کا یکجا ذکر ہوا ہے۔ یعنی توحید اور معاد [۲]

تیسری اصل یعنی نبوت کا ذکر(یٰقوم لیس بی ضلالة) میں آیا ہے۔

چوتھی آیت میں یہود ونصاریٰ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے جو راہ توحید سے منحرف ہو چکے ہیں۔

یہود نے اپنے احبار (علماء دین اور نصاریٰ نے راہبوں (تارک دنیا افراد) اور حضرت مسیحؑ کو معبود قرار دے رکھا ہے، پھر کہتا ہے یہ سب کچھ انہوں نے اس کے باوجود کیا ہے کہ اُنہیں خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش کرنے کا حکم نہیں دیا گیا (وما امروا الا لیعبدو الٰها وّاحِدًا) پھر مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے (لاالٰہ الا ھو) یعنی اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اس کے ساتھ ہی باردیگر تاکید کے طور پر فرمایا: وہ اس سے پاک ومنزہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔(سبحانه عما یشرکون) بہر حال یہ آئین ودستور کہ جس کی بنیاد حضرت نوحؑ نے رکھی، ان کے بعد ہونے والے اولوالعزم پیغمبروں ...... حضرت موسیٰؑ

---

[۱] یہ دونوں تفسریں مفسرین کے ہاں واضح طور پر ذکر ہوئی ہیں، ان میں سے تفسیر فخر رازی جلد ۱۴ صفحہ ۱۴۹ میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

[۲] تفسیر المیزان جلد ۸ صفحہ ۱۸۰۔

وحضرت عیسیٰؑ...... نے بھی پوری کوشش سے اسے رواج دیا اور آگے بڑھایا۔

یہ صحیح ہے کہ مسیحی لوگ حضرت مسیحؑ کی پرستش کرتے تھے اور کر رہے ہیں۔لیکن نہ تو یہودی اپنے احبار کی پرستش کرتے اور نہ مسیحی اپنے راہبوں کی پرستش کرتے تھے مگر اس لیے کہ وہ دین میں ان افراد کی طرف سے کی گئی تحریفوں کے باوجود بلا قید وشرط ان کی اطاعت و پیروی کرتے تھے۔ان کے اس عمل کو بت پرستی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی بناء پر احادیث میں آیا ہے: اما واللہ ماصاموا لھم ولا صلوا ولکنھم احلوا لھم حراماً وحر موعلیھم حلالا فاتبعوھم وعبدُوھم من حیث لا یشعرون[1]

یعنی آگاہ رہو کہ بخدا وہ (یہود ونصاریٰ) اپنے مذہبی پیشواؤں کے لیے نہ روزہ رکھتے اور نہ نماز پڑھتے تھے،لیکن یہ کہ وہ پیشوا اپنے پیروکاروں کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیتے۔پس وہ ان کی پیروی کرتے اور یوں وہ ان کی پرستش کرتے تھے جب کہ وہ جانتے نہ تھے۔اس موضوع کی مزید تشریح انشاءاللہ توحید اطاعت'' کی بحث میں آئے گی۔

## میں غیر خدا کی پرستش نہیں کرتا:

(۵)　پانچویں آیت میں ''توحید عبادت'' کے سلسلے میں بات پیغمبر اکرمؐ تک آ پہنچی ہے اور خداوند تعالیٰ انہیں حکم دیتا ہے: (اے نبی) کہو کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے جنہیں خدا کے سوا تم پکارتے ہو (قل انی نھیت ان اعبدالذین تدعون من دون اللہ)۔

''الذین'' کی تعبیر جو عام طور جمع مذکر عاقل کے لیے آتی ہے۔یہ مشرکوں کے معبودوں کے لیے یا تو اس وجہ سے آئی ہے کہ وہ لوگ اپنے وہم وگمان میں بتوں کو عقل وروح سے متصف تصور کرتے تھے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے معبودوں میں مسیحؑ ،فرشتوں اور جنوں جیسی ذی شعور شخصیات شامل تھیں۔

پھر یہ بتانے کے لیے کہ خدا کی طرف سے پیغمبر کو غیر خدا کی پرستش سے منع کرنے کی دلیل کیا ہے؟ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتا ہے: کہو کہ میں تمہاری ہوا وہوس کی پیروی نہیں کرتا ایسا کروں تو گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوں گا۔(قل لا اتبع اھواء کم قد ضللت اذاً وّما انا من المھتدین)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بت پرستی کی بنیادیں خواہشوں کی پیروی اور وہم وخیال ہی پر کھڑی ہوا کرتی ہیں یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خواہشوں کے پیچھے چلنے کا نتیجہ گمراہی ہے اور اس طریقے سے نیک بختی اور راہ راست ہرگز نصیب نہیں ہوتی۔

(۶)　چھٹی آیت میں بھی رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ ہی کی طرف ہے،انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدائے یگانہ کی عبادت کرنے اور شرک وبت پرستی کی ہر شکل سے دوری پر ثابت قدم رہیں جیسا کہ فرماتا ہے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتا رہ...... یہاں تک کہ تجھے یقین

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۰۹۔

(موت) آجائے (واعبد ربك حتیٰ یأتیك الیقین)

مفسرین نے عمومی طور پر زیر بحث آیت میں آنے والے لفظ ''یقین'' کو ''مرگ'' کے معنی میں تصور کیا ہے۔اور اس حضرت عیسیٰؑ کی گفتار کے مشابہ قرار دیا ہے خدا نے مجھے نماز وزکات کی وصیت کی ہے جب تک کہ میں زندہ ہوں، (واوصانی بالصلوٰۃ والزکاتِ مادمت حیاً)......(مریم۔۳۱) اور قرآن میں ایک اور مقام پر ہم اہل دوزخ کا قول دیکھتے ہیں (وما کنا نکذب بیوم الدین حتیٰ اتانا الیقینُ) یعنی ہم قیامت کے دن کا متواتر انکار کرتے رہے، یہاں تک کہ ہماری موت آپہنچی۔

اسلامی روایت میں بھی مرگ کو ''یقین'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ہم امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: لم یخلق اللہ یقینا لاشك فیه اشبهُ بشكٍ لایقین فیه من الموتَ۔

خدا نے ایسا کوئی یقین پیدا نہیں کیا کہ جس میں شک کی آمیزش نہ ہو، مثلاً موت کہ اس میں اس طرح شک رہتا ہے، گویا اس کے ساتھ یقین کا ہرگز تعلق نہیں ہے (یہ اس لیے فرمایا کہ لوگ موت سے یوں بے پرواہیں کہ موت کی آمد کو باور نہیں کرتے)[1]

موت کو یقین سے تعبیر کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے، جیسے مذکورہ بالا حدیث میں آیا ہے کہ سبھی انسان موت پر یقین رکھتے ہیں اور اس میں کسی مذہب ومسلک کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے وقت (غفلت کے) پردے اُٹھ جاتے ہیں اور حقائق آشکارا ہو جاتے ہیں، اس طرح ایسے بہت سے امور کا یقین ہو جاتا ہے جن کے بارے میں انسان اس سے پہلے شک وشبہ میں رہا کرتا ہے (بہر حال ان دونوں تفسیروں میں جمع بھی ممکن ہے۔

(۷) ساتویں آیت میں یہی مضمون بعض اضافوں کے ساتھ سامنے آتا ہے اس میں اہل کتاب کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہوا ہے جو مرکز توحید سے منحرف ہو کر عبادت وعبودیت میں خدا کے ساتھ دیگر شرکاء کے قائل ہو گئے۔ارشاد ہوتا ہے اور انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ اپنے دلوں کو خالص کرکے اور یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں۔(وما اُمرُوا الا لیعبدوا اللہ مخلصین له الدین حنفاءَ[2])

یہ بات قابل توجہ ہے کہ تمام ادامر الٰہی کو مخلصانہ عبادت میں شامل کرنے کے بعد نماز قائم کرنے اور زکات دینے کا حکم فرمایا ہے (ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام احکام دینی کی اساس وبنیاد عبادت میں اخلاص پر قائم ہوتی ہے پھر یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ آیت کے آخر میں یہ اضافہ کرتا ہے، یہی نہایت سیدھا اور صحیح دین ہے، (وذلك دین القیمة[3])

---

[1] تحف العقول صفحہ ۲۷۱۔

[2] المفردات میں راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ ''حنف'' بروزن ''کنف'' کا معنی ضلالت وگمراہی کو ترک کرکے سیدھے راستے پر آجانا ہے دین اسلام کو بھی اسی لیے دینِ حنیف کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو صراطِ مستقیم سے گمراہی کی طرف جانے سے باز رکھتا ہے۔

[3] المفردات میں راغب اصفہانی کا قول ہے کہ ''قیم مادۃ'' ''قیام'' سے قیام ثابت اور مستقیم کے معنی میں ہے، یہاں یہ لفظ ایسی اُمت کے لیے ہے جو عدل وانصاف کے لیے قیام کرتی ہے۔جیسے آیت کونو قوامین بالقسط میں آیا ہے۔

(۸) آٹھویں آیت میں یہی نکتہ حضرت عیسیٰؑ کی زبانی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: (اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے (وان اللہ ربی وربکم فاعبدوہُ ھذا صراطٌ مستقیمٌ)

ہم جانتے ہیں کہ دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم ایک ہی ہوتا ہے جب کہ غیر مستقیم اور ٹیڑھے خطوط بہت سے ہو سکتے ہیں، خط توحید بھی بس ایک ہی ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہوگا وہ شرک و بت پرستی میں داخل سمجھا جائے گا۔

''مستقیم کا مادہ'' استقامت'' ہے اور اصل میں یہ ''قیام'' سے لیا گیا ہے۔ چونکہ انسان کھڑے ہونے کی حالت میں بالکل سیدھا ہوتا ہے، اس لیے یہ لفظ ہر قسم کے انحراف سے مبرا صاف سیدھے اور معتدل راستے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن نے سورۂ حمد میں ''صراطِ مستقیم'' کے مقابل ''مغضوب علیہم) وہ لوگ جن پر خدا کا غضب ہوا اور (ضالین) جو گمراہ ہوئے ان کا ذکر کیا ہے۔ پہلے گروہ میں وہ گمراہ لوگ ہیں جو اپنی گمراہی پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی اور دوسروں کی گمراہی کو درست قرار دیتے اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔ دوسرے گروہ میں ایسے گمراہ لوگ شامل ہیں جو بے خبر اور سادہ دل ہیں کہ اوروں کی دیکھا دیکھی اس راہ پر چل رہے ہیں۔

## جس جگہ خدا کی عبادت نہ کرسکوں وہاں سے ہجرت کر جاؤ:

(۹) نویں آیت میں ایک نئے نکتے کی طرف اشارہ ہے۔یعنی ایک وطن یا مقام جس کے ساتھ محبت ہے اگر اس میں سکونت رکھنا خدا کی عبادت میں مانع ہو (توحید عبادت پر عمل نہ ہو سکے) تو اس مقام اور وطن سے ہجرت کو جانا چاہیے۔ جیسا کہ فرمایا۔اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے۔ پس تم میری ہی بندگی کرتے رہو۔(یعبادی الذین اٰمنوا ان ارضی واسعةٌ فایایَ فاعبدونِ)

ہاں! خدا کی زمین وسیع ہے۔لہٰذا کسی وقت بھی گھر، وطن اور کنبہ، برادری میں رہنے کی مجبوری یا ان کی محبت کے باعث شرک و بت پرستی کے ماحول میں رہ کر خدا کی بندگی اور توحیدِ عبادت کے اہم فریضے کو ترک نہ ہونے دیا جائے بلکہ ہر مومن وموحد کا وظیفہ و ذمہ داری ہے کہ ایسی حالت میں وہ اس جگہ سے ہجرت اختیار کرے اور ایسی سرزمین پر چلا جائے جہاں چراغ توحید ضوفشاں ہو، تاکہ آغازِ اسلام میں ہجرت کرنے والے مہاجرین کی طرح اپنے دامن کو شرک و بت پرستی سے آلودہ نہ ہونے دے اور ضروری قوت و طاقت فراہم کر کے اپنے وطن مالوف میں لوٹ آئے۔

اس آیت میں (یاعبادی) اے میرے بندو (ارضی) میری زمین (فایای فاعبدونِ) پس تم میری ہی بندگی کرتے رہو۔ یہ سب ایسی تعبیرات ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں خدا کی رحمت شامل ہے جو موحدوں اور توحید پرستوں پر ہر جگہ اور ہر حال میں سایہ فگن

رہتی ہے اور اس ذاتِ مقدس کی حمایت ان کے ساتھ ہوتی ہے[1]

توجہ رہے کہ کہ اس آیت میں مخاطب خدا کے عباد یعنی اس کے بندے ہیں لیکن پھر سے انہیں خدائے واحد کی عبادت و پرستش کا حکم دیا جا رہا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں تا زندگی توحید پرستی لے راستے پر گامزن رہنا چاہیے اور اسے ذرہ بھر انحراف نہ کرنا چاہیے یہ اعادہ تکرار ایسا ہی ہے جیسے خدا کے بندے باوجود راہ ہدایت کی پیروی کرنے کے ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝'' یعنی ہمیں سیدھی راہ پر قائم رکھ۔ کہہ کر اس سے ہردم طلب ہدایت وتوفیق کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ ان کے عمل میں کوئی کجی وخامی پیدا ہونے نہ پائے۔

زیر بحث آیت سورہ عنکبوت کی ہے اور مفسرین کہتے ہیں کہ اس سورے کی پہلی گیارہ آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی، یہ مکہ کے ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو اظہار اسلام تو کرتے تھے لیکن مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اس سے اگلی آیت (کل نفسٍ ذائقة الموت) بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ آخر کار سبھی کو مرجانا ہے۔ زن وفرزند اور مال وطن سے جدا ہونا ہے۔ پس ہجرت سے پہلوتہی کرنے والے یہ لوگ سمجھ لیں کہ اس طرح وہ اپنے کنبہ مال اور وطن سے ہمیشہ آسودہ خاطر نہیں رہ سکیں گے بلکہ موت انہیں ان سب سے جدا کردے گی، پس ان کا ہجرت نہ کرنا غلط فہمی اور نادانی کی بات ہے کیونکہ وہ مکہ میں بھی ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔[2]

(۱۰) دسویں آیت میں بھی ایک نئے نکتے کا ذکر ہوا ہے اس میں سارے مومنین کو یہ نوید دی جارہی ہے۔

کہ تم روئے زمین کے ملکوں کے مالک وحاکم بن جاؤ گے جیسا کہ توحید نے ساری کائنات کو روشن کردیا ہے اور خدا کے سوا کسی اور معبود کی عبادت نہیں ہوسکتی اس بیان میں مومنین کو توحید پر ایمان لانے اور توحید عبادت پر قائم رہنے کے باعث تبریک اور خوشخبری دی جارہی ہے جیسا کہ فرمایا'' وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالح بجالاتے ہیں۔ ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ یقیناوہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطاء کی تھی (وعدہ اللہ الذین امنو منکم وعملو الصّٰلحٰتِ لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم )۔

جو لوگ اس سے پہلے زمین کے وارث بنے وہ کون تھے؟ اس میں مفسرین نے بہت کچھ بحث وگفتگو کی ہے لیکن ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہی ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے قیام اور فرعون کی تباہی وغرقابی کے بعد اس زمانہ میں آباد زمین کے بہترین خطوں اور علاقوں کے مالک وحاکم بنے تھے جیسے قرآن مجید سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۷ میں بیان فرماتا ہے (واورثنا القوم الذین کانو یستضعفون مشارق الارض ومغاربھا التی بارکنا فیھا) یعنی ہم نے ایک کمزور جماعت (بنی اسرائیل) کو (خدا پر ایمان لانے اور اخلاص ظاہر کرنے کے بعد) مشرق ومغرب کی پربرکت زمین کا وارث وحاکم بنایا

(۱۱) گیارہویں آیت میں ایک اور پہلو سے توحیدِ عبادت کی توجیہ کی گئی ہے وہ اس طرح کہ مجسمے اور مورتیاں تو مٹی اور پتھر کے بے

---

[1] فایای فاعبدون من مفعول کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ جو حصر کا فائدہ دیتا ہے یعنی عبادت صرف اور صرف خدا ہی کی ہے اور اس کے سوا کوئی اور دوسرا لائق عبادت وپرستش نہیں ہے۔

[2] تفسیر روح البیان، تفسیر روح المعانی، تفسیر قرطبی میں آیت زیر بحث کے ذیل میں اسی طرف اشارہ ہوا ہے۔

حقیقت ٹکڑے ہیں ان کا تو کیا ذکر خود ملائکہ مقربین اور انبیاء ومرسلین بھی یہ منزلت نہیں رکھتے کہ ان کی عبادت و پرستش کی جائے ۔فرماتا ہے وہ تمھیں حکم نہیں دیتا کہ تم ابیاء اور فرشتوں کو اپنے معبود بنالو کیا وہ تمھیں کفر کی طرف دعوت دیتا ہے جب کہ تم مسلمان ہوچکے ہو۔(ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکۃ والنبین اربابا ایامرکم بالکفر بعد اذانتم مسلمون)[1] بھال اور پرورش میں کوشاں ہو جیسا کہ رب الدار''رب الابل'' جن کا مطلب گھر اور انٹوں کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ غیر خدا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورۂ یوسف کی آیت ۴۲۔۵۰ میں لفظ ''رب'' مصر کے بادشاہ کے لیے آیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں عموماً اس لفظ کو بڑے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

لیکن قرآن میں لفظ ''رب'' سینکڑوں مرتبہ آیا اور قریباً ہر مقام پر اس سے خدائے تعالیٰ کی ذات مقدس ہی مراد ہے کیونکہ درحقیقت ہر چیز کا مالک اور پرورش کرنے والا وہی ہے یہاں اہم بات یہ ہے کہ بہت سی اقوام کچھ چھوٹے خداؤں کی قائل رہی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو ''رب النوع'' کہتی اور خداوند تعالیٰ کو رب الارباب'' (خداؤں کا خدا) کہتی ہیں ۔اسی طرح بعض قومیں انبیاء اور فرشتگان کے متعلق بھی یہی عقیدہ رکھتی ہیں۔لیکن مذکورہ بالا آیات ان باطل عقائد کی صریحاً نفی کرتے ہوئے ثابت کررہی ہیں کہ ''رب'' اور رب الارباب'' خدائے قدوس ہی ہے۔اس کے علاوہ کسی کو ''رب'' تصور کرنا اور ماننا کفر محض اور اسلام کے خلاف ہے۔

(۱۲) بارہویں اور آخری آیت میں اس تمام بحث کے نتیجے کے طور پر فیصلہ کن گفتگو کی گئی ہے، کہ توحید عبادت صرف انسانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ''جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی یا مجبوری سے خدا کے لیے سجدہ ریز ہیں، اسی طرح دن رات اور ان کے سائے بھی سجدہ گذار ہیں۔(وللہ یسجد من فی السموٰتِ والارض طوعاً و کرھا وظللھم بالغدُو والاصالِ)۔

اگرچہ لفظ ''من'' باشعور مخلوق کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس سے بعض مفسرین نے خیال کیا کہ آیت میں انسانوں اور فرشتوں کی عبادت کا تذکرہ ہوا ہے لیکن اس آیت کی ایک اور قرائت بھی ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عاقل وغیرہ عاقل جمادات، حیوانات، نباتات......تمام موجودات کی طرف اشارہ ہے اور سجدہ بھی عام داخل ہے جو انسان اور دیگر ذی شعور مخلوق بجالاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے:

(۱) طوعاً و کرہا (خوشی و مجبوری) سے ظاہر ہے کہ سجدہ کے عمومی معنی مراد ہیں۔

(۲) ظلال (سایہ) کی شرکت بتاتی ہے یہاں عمومی عبادت کا ذکر ہے۔

(۳) دیگر آیات میں یہ بات واضح طور پر آئی ہے۔

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہے۔

---

[1] اس بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۴ صفحہ ۵۲۷ (فارسی) میں حکومت جہاں مستضعفان کے عنوان سے مفصل بحث ہوئی ہے اس کا ایک نمونہ فتح مکہ کے بعد پیغمبر اکرم کی حکومت کی شکل میں سامنے آیا اور اس کا مکمل ترین نمونہ حضرت قائم آل محمدؑ (ارواحنا فداہ) کے ظہور کے وقت ساری دنیا دیکھے گی جو کمزوروں کی عالمی؟ حکومت ہوگی۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴿النحل: ۴۹﴾

درخت اور ستارے سجدہ کرتے ہیں۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ﴿الرحمن: ۶﴾

معلوم ہوا کہ تمام موجودات عالم خدائے تعالیٰ کے سامنے سربہ سجود ہیں اور تکوینی طور پر اس کی فرمانبرداری کررہے ہیں۔ان میں مومنین سجدہ تکوینی کے علاوہ سجدہ تشریعی بھی کررہے ہیں جو ان کے ارادہ واختیار سے تعلق رکھتا ہے۔[1]

اس سجدہ کی عمومیت یہاں تک کہ اس میں ظلال اور سایوں کی شرکت واقعاً حیرت انگیز ہے کیونکہ وہ عدم کا پہلو رکھتے ہیں، دراصل سایہ اس جگہ پر ہوتا ہے۔ جہاں روشنی نہ پہنچ رہی ہو۔لیکن اس بناء پر کہ سایہ اجسام کے تابع ہے،اس میں وجودی پہلو بھی پایا جاتا ہے۔قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ سائے جو مشابہ وجود ہیں وہ بارگاہ الٰہی میں سجدہ کررہے ہیں تو پھر حقیقی موجودات کی سجدہ گزاری میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔مشہا بہت کا اصلیت سے ایک طرح کا تعلق ہوتا ہے،جیسا کہ ہم کہتے ہیں فلاں شخص کی فلاں سے ایسی شدید دشمنی ہے کہ وہ اس کے سائے پر بھی تیر بارانی کرتا ہے۔علاوہ ازیں سائے عموماً زمین پر ہوتے ہیں اور ان کی اس حالت کو سجدے سے تعبیر کرنا ان کی کیفیت کی بڑی عمدہ تصویر کشی ہے۔

سائے ساتھ یہ جو صبح وشام (بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ) کا ذکر ہوا ہے۔تو ممکن ہے یہ سائے کا وصف ہو اور ان دو وقتوں کا انتخاب اس لیے کیا کہ ان میں ہر چیز کا سایہ طویل ہوتا ہے جب کہ دوپہر کے وقت سایہ نسبتاً چھوٹا اور بعض اوقات معدوم بھی ہوتا ہے اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ صبح وشام کا ذکر موجودات عالم (آسمانی وزمینی ) کے وصف میں آیا ہو اور اس کا مقصد سجدے کا دوام ظاہر کرنا ہو، جیسے ہم روزمرہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں کے کان میں صبح وشام یہ بات پہنچانا چاہیے۔یعنی یہ بات اس سے ہمیشہ کہتے۔

ان آیات کی جمع آوری اور تفسیر سے یہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے کہ توحید عبادت اتنی اہم چیز ہے کہ انبیاء کی دعوت کا آغاز اسی سے ہوا اور یہی ان کی تعلیمات کا اصل اصول تھا۔نیز اولوالعزم انبیاء کی دعوت وتبلیغ کی بنیاد اسی پر قائم ہوئی اور رسول کریمؐ بھی تاحین حیات مختلف پیرایوں میں اس کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔

توحید عبادت ہی صراطِ مستقیم کی طرف لے جانے والا وسیلہ ہے، یہاں تک کہ بشرط ضرورت اس کی خاطر ترک وطن کرنا اور شرک وبُت پرستی کے ماحول کو چھوڑ کر وہاں سے ہجرت کر جانا چاہیے۔

وہ وقت جب عادلانہ الٰہی حکومت اس دنیا میں قائم ہوگئی۔اس کی اہم خصوصیات میں سے بڑی خصوصیت توحیدِ عبادت ہے جو سارے جہان میں ظہور پذیر ہوگئی۔اس بابرکت عہد میں نہ صرف انسان بلکہ تمام موجوداتِ عالم خدائے یگانہ کے آستان پر جبین سائی

---

[1] پہلی صورت میں جارومجرور کا تعلق ایک مقدر فعل یا وصف سے ہے (اس کا امتیاز اقرب کی طرف لوٹتا ہے ) دوسری صورت میں جارومجرور کا تعلق یسجد کے فلع سے ہے اس کا امتیاز یہ ہے کہ خود مذکور ہے۔

کریں گے اگر چہ وہ زبان قال سے تسبیح نہ کریں، اور اپنے اختیار سے سجدہ نہ کریں تو بھی زبانِ حال سے اس کی تسبیح اور تکوینی طور پر اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں گے۔

# توضیحات

## (۱) توحید عبادت کا شجر میوہ دار:

اس نکتے پر توجہ دینا ضروری ہے کہ خضوع وخشوع اور ادب واحترام کے کئی مراتب ہیں، ان میں سے سب سے اعلیٰ اور آخری درجہ یہی عبادت و پرستش ہے۔

یہ ایک واضح سی بات ہے کہ اگر کوئی انسان کسی کے لیے اس قدر احترام کا قائل ہو کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے گر جائے۔ سرزمین پر رکھ دے اور سجدہ ریز ہو جائے تو لازماً وہ اس کے فرمان پر سرِ تسلیم خم کردے گا۔ کیا ممکن ہے کہ وہ اس کی لامحدود تعریف اور پرستش کرنے کے باوجود اس کا حکم نہ مانے؟ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی انسان عباداتِ خالص کی روح سے واقف ہو جائے تو گویا اس نے خدا کی اطاعت کی طرف بہت بڑا قدم اُٹھایا، اس نے نیکیاں کمانے اور برائیوں سے بچنے کا راستہ اپنا لیا ہے اس طرح کی عبادت اگر استمرار و ہمیشگی رکھتی ہو تو یہ انسان کی روحانی تربیت اور تکامل کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی قسم کی مخلصانہ عبادت اگر استمرار و ہمیشگی رکھتی ہو تو یہ انسان کی روحانی تربیت اور تکامل کا سبب بن جاتی ہے۔

اسی قسم کی مخلصانہ عبادت میں عشقِ محبوب بھی شامل ہوتا ہے جو عبادت کرنے والے کو اس معشوقِ حقیقی کی سمت لیے لیے جاتا ہے اور اس کمال مطلق کی طرف یہ حرکت وسفر بدی کی پستیوں اور گناہ کی آلودگیوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنتا ہے اس بناء پر توحید عبادت کا مسئلہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ کہ قرآن نے اس کا واضح اعلان کرنا ضروری سمجھا......(ان الذین یستکبرون عن عبادتی سید خلون جھنم داخرین مومن۔ ٦٠) یعنی جو لوگ میری عبادت سے سر پھیرتے ہیں وہ جلد ہی ذلت کے ساتھ جہنم میں وارد ہوں گے۔

عبادت کرنے والا شخص اپنے انتہائی عجز ودل سوزی کے ساتھ خدا کی رضا وتقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا اور مانتا ہے کہ قرب خداوندی عمل ہی کے ذریعے نصیب ہوسکتا ہے، لہٰذا وہ اس کے ہر حکم وفرمان کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے توحید عبادت پر اعتقاد رکھنے اور خدا کی عبادت بجالانے والا بندہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ خدا کو اپنا معبود اور معشوق بنانے کا میاب ہو جائے۔ اس لیے وہ اس کی صفات کمال و جمال کو اپنے وجود پر منعکس کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ طریقہ عمل انسان کی اصلاح اور اس کے تکامل میں اتنا موثر ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں۔

## ۲۔رُوح عبادت اورافراط وتفریط سے پرہیز:

اکثر مسائل کی طرح عبادت کے معنی میں بھی افراط وتفریط پیدا ہوگئی ہے۔یہاں تک کہ بعض لوگوں نے (مالکیت وربوبیت کا تصور نہ رکھتے ہوئے) غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز قرار دے دیا ہے اوراس کے لیے فرشتوں کے سجدہ برائے آدمؑ اور برادرانِ یوسف کے سجدہ برائے یوسفؑ کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔اس کے مقابل کچھ لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ وائمہ دین کی طرف ہر قسم کی توجہ،توسل اور طلب شفاعت کو شرک اور ایسا کرنے والے کو مشرک کہا ہے،لیکن درحقیقت یہ دونوں نظریئے صحیح نہیں ہیں۔

اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے۔جیسا کہ اس بحث کے آغاز میں بتایا جاچکا ہے کہ علماء لغت کی تشریح کے مطابق حقیقت عبادت معبود کے سامنے خضوع وخشوع،بے انتہا تواضع اور تذلل ہے اسلامی نظریئے کی رو سے یہ سب کچھ خدا کے لیے مخصوص ہے اور کسی دوسرے کے سامنے ایسا کرنا شرک درعبادت ہوگا۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خضوع کے مختلف مراتب ہیں مثلاً دستوں کے سامنے خضوع کہ اس کے قابل تکبر ہے اس طرح باعظمت افراد کے لیے خضوع اور ان میں پہلا مقام والدین کا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا نرمی اور ملائمت کے ساتھ ان کے سامنے جھکے رہو۔(وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ﴿الإسراء: ۲۴﴾

خضوع اور عجز کا اس سے بالاتر مرحلہ وہ ہے جو پیغمبروں اور معصوم اماموں کے لیے انجام دیا جانا چاہیے۔

حتیٰ کہ مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنی آواز پیغمبر اکرمؐ کی آواز سے بلند تر کریں۔اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو تم اپنی آواز پیغمبر اکرمؐ کی آواز سے بلند نہ کرو۔ان کے سامنے اونچی آواز سے بات نہ کرو جیسے تم میں سے بعض افراد دوسروں کے ساتھ کیا کرتے ہیں(یاَیہاالذین اٰمنو الا ترفعوا صواتکم فوق صوتِ النبی ولا تجھرواله بِالقول کجھرِ بعضکم لبعضٍ)۔(حجرات۔۲)

لیکن خضوع اور کسی کے سامنے جھکنے،تواضع اور خود کو پست ظاہر کرنے اور تذلیل یعنی اپنے عجز وشکستگی کا اظہار کہ جس کا نام عبادت وعبودیت ہے وہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس کی واضح صورت ''سجدہ'' ہے لہٰذا خضوع مطلق اور انتہائی تذلل (مالکیت وربوبیت کے اعتقاد کے بغیر بھی) عبادت ہے اور وہ صرف خدا ہی کے لیے ہے۔اسی بنا پر غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

تفسیر المنار کے مولف نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں عبادت کی جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

عبادت فقط انتہائی خضوع کا نام نہیں ہے۔بلکہ اس کے ساتھ معبود کی عظمت اس کے تسلط اور کلی احاطہ رکھنے اعتقاد ہونا ضروری ہے وہ تسلط واحاطہ ایسا ہے کہ جس کی اصلیت فہم وادراک سے بلند ہے۔پس یہ ممکن ہے کہ عاشق اپنے معشوق کے سامنے اتنا خضوع کرے کہ اس کا ارادہ وخواہش معشوق کی مرضی میں گم ہوجائے،لیکن پھر بھی اس کو عبادت نہیں کہا جائے گا۔اسی طرح بہت سے افراد کا اپنے حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے انتہائی خضوع بھی عبادت نہیں کہلاتا۔[1]

---

[1] تفسیر المنار جلد ا صفحہ ۵۶۔۵۷۔

بزرگ مفسّر علامہ طباطبائی تفسیر المیز ان میں مذکورہ بالا کلام کے مشابہ بات کہتے ہیں۔

''عبادت فقط خضوع کا نام نہیں ہے بلکہ بندے کا خود کو اپنے پروردگار کا مملوک قرار دینا عبادت ہے، پھر سورۂ بقرہ میں آدم کو فرشتوں کے سجدے......کی بحث میں اس قول کا اعادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''فعل عبادی'' وہ فعل ہے جس میں مولا کی مولویت وحاکمیت اور اپنی عبودیت وبندگی کا اظہار ہوتا ہو۔ لہٰذا ان کے نزدیک غیر خدا کے سامنے وہ سجدہ ممنوع ہے جس میں اس کی ربوبیت کا اعتقاد شامل ہو۔ پس وہ سجدہ جس میں ربوبیت کا تصور نہ ہو اور صرف احترام کا خیال ہو تو اس میں کوئی مانع نہیں۔ لیکن وہ دینی بصیرت اور ذوقِ عبودیت جو دین کے ظاہری احکام کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کا فیصلہ یہ ہے کہ سجدہ خاص خدا ہی کے لیے ہے اور غیر خدا کے سامنے سجدہ نہیں کیا جانا چاہیے[۱]

بہرحال اگر لفظ ''عبادت'' کے بارے میں قرآن، سنت، لغت اور روزمرہ کے استعمالات پر باریک بینی سے نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا لغوی مفہوم ''انتہائی خضوع ہے، جس میں معبود کی مالکیت وربوبیت کے اعتقاد کا کوئی دخل نہیں ہے: لہٰذا اگر کوئی فرد پرانے زمانے کے لوگوں کے مجسموں اور بادشاہوں کے سامنے سجدہ کرے تو یہ بھی عبودیت و پرستش ہی ہوگی۔ نیز اگر کوئی آئمہ علیہم السلام کی عظمت وبزرگی کے پیشِ نظر ان کو سجدہ کرتا ہے تو اسے پرستش ہی سمجھا جائے گا اور یہ ممنوع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن سورۂ حٰم سجدہ کی آیت ۳۷ میں سُورج اور چاند کو سجدہ کرنے سے واضح طور پر منع کرتے ہوئے کہتا ہے۔

(لاتسجدو اللشمسِ ولا للقمر) اور پھر اسی دلیل کے مطابق احادیث وروایات میں بھی بار بار غیر خدا کو سجدہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

ان میں سے سات روایتیں وسائل الشیعہ ابواب سجود باب ۲۷ میں وارد ہوئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ مشرکین سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

'اخبرونی عنکم اذا عبدتم صورمن کان یعبدوالله فسجدتم لهه او سلیتم ووضعتم الوجوه الکریمة علی التراب بالسجودبها فما الذی بقیتم لرب العالمین؛ اما علمتم ان من حق من یلزم تعظیمهُ و عِبادتُهٗ ان لایساوٰی عبیدُهٗ[۲]

یعنی مجھے بتاؤ کہ جب تم خدا کے سامنے عاجز مخلوق کے مجسموں کی پرستش کرتے ہو، ان کی نماز پڑھتے اور ان کو پکارتے ہو، پھر ان کے آگے سجدہ کرنے کے لیے اپنی پیشانی زمین پر رکھتے ہو تو کہو کہ اب رب العالمین کے لیے کیا باقی رہا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ جس کی تعظیم اور عبادت لازم سمجھی جائے، اس کا حق ہے کہ اس کی ناتواں مخلوق کو اس کے برابر نہ سمجھا جائے۔

ایسی بہت سی روایات ہیں جن میں آدم کو فرشتوں کے سجدے اور یوسفؑ کو ان کے بھائیوں کے سجدے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

---

[۱] تفسیر المیزان جلد اصفحہ ۲۲۔ ۱۲۴۔

[۲] وسائل الشعہ جلد ۴ صفحہ ۹۸۵، حدیث ۳۔

ان مواقع پر سجدہ خدا ہی کے لیے تھا اور اس میں شکر کا پہلو نمایاں تھا لیکن آدمؑ و یوسفؑ کا احترام بھی پیشِ نظر رکھا گیا[1]

بعض روایات میں ہے کہ آدمؑ و یوسفؑ بہ منزلہ قبلہ کے تھے کہ رُخ ان کی طرف اور سجدہ خدا کی بارگاہ میں تھا[2]

بعض روایتوں میں کہا گیا ہے کہ جب سجدہ خدا کے حکم سے کیا گیا تو اسی کے لیے شمار ہوگا[3]

ان روایات سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غیر خدا کو سجدہ نہیں کیا جانا چاہیے......علاوہ ازیں علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں اس مضمون کی بہت سی روایتیں نقل فرمائی ہیں[4]

مسلمانوں کی ہجرت حبشہ کے مشہور واقعہ میں مذکور ہے کہ جب ان مہاجرین نے نجاشی کے دربار میں حاضری دی تو مسیحی راہبوں نے ان سے کہا کہ تم لوگ بادشاہ کو سجدہ کرو! اس پر جعفر بن ابی طالب نے صاف صاف کہہ دیا۔لا نسجد الا اللہ یعنی ہم خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔

## (۳)......وہابیوں کی شرک آلود توحید:

حجاز کے موجودہ وہابی حکمران محمد بن الوہاب کے پیروکار ہیں کہ جس نے اپنے افکار ونظریات ابنِ تیمیہ، احمد بن عبدالحمید دمشقی (متوفی ۷۲۸ھ) سے اخذ کیے ہیں۔

محمد بن عبدالوہاب نے ۱۱۶۰ھ سے ۱۳۰۶ (اپنے سال وفات تک) کے درمیانی عرصے میں مختلف مقامات کے رئیسوں اور قبائلی سرداروں کے تعاون سے خانہ بدوش عربوں میں تصبات کی آگ بھڑکائی اور ان کے انبوہ کثیر کی مدد سے اپنے مخالفوں کو زیر کرلیا۔اس طرح وہ حکومت پر دسترس حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے اس نے حجاز و بیرون حجاز میں ہزاروں مسلمانوں کو بے دریغ قتل کردیا۔

اس شخص کے مرنے کے بعد اس کے پیروکار حجاز سے اُٹھ کر عراق پر چڑھ دوڑے اور کربلا تک جا پہنچے۔وہ عید غدیر کا دن تھا۔اس لیے کربلا میں عام تعطیل تھی اور وہاں کے لوگ نجف اشرف گئے ہوئے تھے۔وہابی آوروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور فصیل توڑ کر اس مقدس شہر میں داخل ہوگئے اور وہاں قتل وغارت کا بازار گرم کردیا۔انہوں نے پانچ ہزار مومنین کو قتل کیا۔مرقد حسینؑ سے قیمتی تبرکات اٹھا لیے، کھڑکیاں دروازے اکھاڑے اور عام لوگوں کے گھر لوٹتے ہوئے پلٹ گئے۔

پھر ۱۳۴۴ھ کا نامبارک سال آیا کہ جس میں ان وہابی حکمرانوں نے حجاز میں تمام مزارات مسمار کردیئے جن میں اہل بیتؑ رسولؐ،

---

[1] وسائل الشیعہ جلد صفحہ ۹۸۵،حدیث ۲۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۴ صفحہ ۹۸۵،حدیث ۷۔

[3] وسائل الشیعہ جلد ۴ صفحہ ۹۸۵،حدیث ۴۔

[4] بحار الانوار۔

اصحاب بنی اور دیگر بزرگان کے مزار شامل ہیں......انہوں نے صرف بنی اکرمؐ کا روضہ پاک باقی رہنے دیا ہے۔(شاید اسے جمہور مسلمین کے خوف سے مسمار نہیں کر سکے)۔

وہابیوں کی واضح صفات میں تعصّب، تیز مزاجی، سخت دلی، ظاہر بینی اور ضدیت شامل ہے۔لیکن اس کے باوصف وہ خود کو توحید کے محافظ اور موحد خالص قرار دیتے ہیں۔اپنی اس خود ساختہ توحید پرستی کے نتیجے میں وہ شفاعت، زیارت قبور، اور بزرگان اسلام کو وسیلہ تقرب الٰہی سمجھنے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔لہٰذا مسلمانوں کی بڑی اکثریت یعنی (شیعہ وسنی) ان کے عقائد کی تغلیط کرتے بلکہ کبھی کبھی ان کو کفر سے بھی نسبت دے دیتے ہیں [1]

اس گروہ کے عقائد اعمال پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے، یہاں ہم صرف اتنی ہی گفتگو کریں گے جو توحید عبادت سے تعلق رکھتی ہے۔

وہ کہتے ہیں: کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ پیغمبر اکرمؐ سے طلب شفاعت کرے، کیونکہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے خدا کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو (لاتدعوا مع اللہ اَحَدًا)

الہدیۃ السنیہ کا (وہابی) مولف لکھتا ہے، جو شخص انبیا اور فرشتوں کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ بنائے وہ کافر و مشرک ہے اور اس کا خون و مال مباح ہے، اگر چہ وہ شہادتین کا قائل اور نماز و روزہ کا پابند ہو [2]

انبیاء ائمہ اور صالحین کا وسیلہ پکڑنے اور ان کے مزارات کی زیارت کے بارے میں بھی وہ ایسا ہی نظریہ رکھتا ہے۔

ان سطح بین وہابی لوگوں سے یہ ایک بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔کہ وہ اس دنیا کے موجودات کے اثر و تاثیر کو مستقل سمجھتے ہیں۔اس لیے وہ انہیں خدا کی توحید افعال و توحید عبادی کے مقابل تصور کر لیتے ہیں۔جب کہ یہ طرز فکر بذاتِ خود شرک کے حکم میں داخل ہے۔

## توضیح:

موحدِ کامل کی نظر میں مستقل اور قائم بالذات صرف وجود خدا ہے اور دیگر سبھی موجودات (جو ممکن ہیں) اسی سے وابستہ ہیں جیسے آفتاب کی شعاعیں آفتاب ہی کا وجود ہے۔اور اس سے الگ نہیں ہیں۔کیونکہ ان میں استقلال نہیں یہ اپنے وجود و بقاء میں آفتاب کی محتاج اور اسی سے تعلق رکھتی ہیں۔اسی طرح ہر موجود اور جو کچھ وہ رکھتا ہے یہ اسے خدا ہی سے ملا ہے کہ وہی ذات مسبب الاسباب ہے اور جملہ لاموثر فی

---

[1] مشہور اہل سنت عالم دین احسان عبدالطیف البکری نے "الوہابیۃ فی نظر علماء المسلمین، کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا ہے جس میں محمد بن عبدالوہاب اور وہابی گروہ کے بارے میں بزرگ علماء کے ارشادات مع حوالہ جات تحریر کیے ہیں کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے جو مختلف علماء نے وہابیوں کے ردّ میں لکھی ہیں اور ان کی تعداد پچاس ہے، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں کو اس فرقے سے بہت زیادہ نفرت ہے۔

[2] الہدیۃ السنیہ صفحہ ٦٦۔

الوجود الا اللہ۔ کے معنی بھی یہی ہیں۔ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اسباب کو سببیت سے الگ کر دیں یا ان کے استقلال کے قائل ہو جائیں،ان میں سے کوئی صورت بھی درست نہیں ہے۔چنانچہ پیغمبر اکرمؐ جو شفاعت کریں گے وہ خدا کے اذان واجازت سے ہوگی جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ما من شفیع الا من بعد اذنہ (یونس۔۳)

اسی طرح اگر حضرت عیسیٰ مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔پیدائشی نابیناؤں کو بینائی دیتے ہیں اور لاعلاج بیماروں کو شفاء بخشتے ہیں تو وہ خدا کے اذان وحکم ہی سے یہ کام انجام دیتے ہیں۔یعنی میں خدا کے اذن سے نابیناؤں کو بینا، برص زدوں کو شفایاب اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں(واُبری الاکمہ والابرص واُحیِ الموتیٰ باذن اللہ)(آل عمران۔۴۹)

پھر اگر حضرت سلیمانؑ کے وزیر آصف بن برخیا کہ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے(الذی عندہٗ علمٌ من الکتاب)یعنی وہ شخص جو کتاب میں سے کچھ علم رکھتا ہے،اس کے اندر اتنی قوت ہے کہ بقول قرآن ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے میں حضرت سلیمان کے سامنے لا حاضر کرے خود اس شخص کے بیان کے مطابق یہ کام من فضل ربی میرے پروردگار کے فضل سے ہوا ہے(نمل ۴۰)

لیکن قرآن سے ناآشنا وہابیوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ان بزرگان دین کے یہ افعال مستقل اور ذاتی ہیں۔لہٰذا اس مشکل کو حل کرنے میں انہوں نے بعض ضروریات دین مثلاً شفاعت کا انکار کرنا شروع کر دیا۔یہ بیچارے بزعم خویش پایۂ توحید کو مستحکم کرنے اور توحید پرستی کی بنیاد واستوار کرنے کی کوشش میں گاہے خود ہی شرک کی دلدل میں جا پھنسے اور پھر تعلیم قرآن وضروریات دین سے انکار تک جا پہنچے۔

اس سلسلے میں توحید وشرک کی سرحد، کے عنوان سے استاد مرتضیٰ مطہری شہید نے بڑی مدلل گفتگو فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) جیسے ایک طرح کی وحدت وجود کے حامی اس کے قائل ہیں کہ کوئی موجود بالذات وجودِ خدا میں شریک نہیں، کیونکہ تمام موجودات اس کی مخلوق اور اس سے وابستہ ہیں......ان میں سے کوئی بھی خدا کے مقابلے میں اپنی مستقل حیثیت کا حامل نہیں ہے۔

(۲) مخلوقات کی تاثیر کا اعتقاد اس کی خالقیت میں شرک تصور نہیں کیا جا سکتا(جیس کہ اشاعرہ وجبریہ اس کے قائل ہیں)کیونکہ جس طرح مخلوقات استقلال ذاتی نہیں رکھتے۔اسی طرح وہ تاثیرات میں بھی مستقل نہیں، بلکہ وہ اس ذات مقدس سے وابستہ ہوتے ہیں۔

(۳) اگر ہم مخلوقات کے لیے مستقل تاثیر کے قائل ہو جائیں اور کہیں کہ مخلوقات کا تعلق خدا کے ساتھ ایسا ہے جیسا کہ تعلق ایک مشین یا گھڑی کا اپنے بنانے والے سے ہوتا ہے یعنی یہ چیزیں آغاز میں ایک مانع کی محتاج تھیں،لیکن بعد ازاں چاہے وہ مر جائے تو بھی وہ اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔یہ وہی نظریہ تفویض اور ایک طرح کا شرک ہے(جس پر معتزلہ اعتقاد رکھتے ہیں)

(۴) موجودات کی مافوق الفطرت قوت وقدرت اور اذان الٰہی سے اشیاء عالم میں ان کی تاثیر کا اعتقاد شرک نہیں جیسا کہ وہابی خیال کرتے ہیں۔بلکہ خود ان کا اعتقاد شرک کی ایک بدترین صورت ہے، کیونکہ اگر ان کی تاثیر کا اعتقاد شرک ہے تو پھر ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی شرک ہوگا۔

(۵) اسی طرح ایک ایسے انسان کی قدرت اور تاثیر کا اعتقاد رکھنا بھی شرک نہیں جو اس دنیا سے جا چکا ہو۔کیونکہ موت کے بعد انسان جمادات میں شمار نہیں ہوتا،ان سب باتوں کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہابیوں کا عقیدہ انسان کی مخالفت کا پہلو بھی رکھتا

ہے وہ اس طرح کہ خدانے انسان کوفرشتوں سے برتر گردانا کہ وہ خدا کا خلیفہ اور مسجود ملائکہ ہے، لیکن یہ لوگ اسے ایک حیوان کے مقام پر کھینچ لاتے ہیں۔ یہی وہ مرحلہ ہے کہ جب ہم پیغمبر اکرمؐ کی مشہور حدیث کے مفہوم سے آشنائی حاصل کرتے ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا: عقائد ونظریات میں شرک اس قدر آہستہ سے اور کسی آہٹ کے بغیر داخل ہوتا ہے۔ جیسے تاریک رات میں ایک چیونٹی کسی سخت پتھر پر چلتی ہے[1]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہابی شفاعت اور توسل کی نفی کیلئے جس آیت سے استدلال کرتے ہیں اسی آیت میں ان کے اس ادعاء باطل کا جواب پوشیدہ ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ فلا تدعوا مع الله احدًا خدا کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔ (جن۔۱۸) یعنی کسی کو خدا کی مثل اور اس کے مقابل ایک وجود مستقل سمجھ کر نہ پکارو، لیکن اگر کسی کی تاثیر خدا کے اذان اور اس کے فرمان سے ہوتو (اسے پکار) نہ صرف یہ کہ شرک نہیں ہوگا بلکہ یہ توحید کی تائید ہے کہ ہر چیز اصل توحید کی طرف منتہی ہوتی ہے۔

یہ بعینہ وہی صورت ہے، جیسے فرزندان یعقوبؑ نے اپنے عظیم باپ کے سامنے ایک تجویز پیش کی تھی، جیسے انہوں نے قبول فرمایا۔ فرزندانِ یعقوب نے کہا: یا ابانا استغفرلنا۔ اے بابا! آپ ہمارے لیے مغفرت طلب کریں (یوسفؑ۔۹۷) حضرت یعقوبؑ نے فرمایا: سوف استغفرلکم ربی۔ عنقریب میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے مغفرت طلب کروں گا۔ (یوسف۔۹۸)

یہ ہے توحید عبادت کی حقیقت نہ وہ کہ جو سطح بین وہابیوں کا نظریہ ہے۔ توحید افعالی کی طرف آئندہ صفحات میں اشارہ ہوگا۔

---

[1] کتاب ''مقدمہ ای بر جہاں بینی، صفحہ ۱۱۳ (تلخیص)

# ۴۔توحید افعالی

## (۱)......توحید خالقیت

### اشارہ:

''توحید افعالی'' کا ایک سادہ اور روشن مفہوم یہ ہے کہ سارا جہان فعل خدا ہے، ہر فعل ۔حرکت اور تاثیر کی انتہا خدا ہی کی طرف ہے۔ درحقیقت (لا موثر فی الوجود الا اللہ) خدا کے سوا کوئی موجود مستقل تاثیر نہیں رکھتا۔حتیٰ کہ اگر تلوار کاٹتی ہے آگ جلاتی ہے اور پانی نباتات کو اگاتا ہے تو یہ سب کچھ خدا کے ارادے اور حکم ہی سے ہوتا ہے، خلاصہ یہ کہ ہر موجود کا اثر تاثیر خدا کی طرف سے ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ تمام موجودات اپنے اصل وجود میں خدا سے وابستہ ہیں اور اپنے فعل وتاثیر میں بھی اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

لیکن یہ چیز عالم اسباب اور قانونِ علت کی حاکمیت کی ہرگز نفی نہیں کرتی جیسا کہ امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے(ابی اللہ ان یجری الاشیاء الا باسبابٍ)[1]

خدا نے چاہا کہ تمام امور اسباب کے ذریعے انجام پاتے رہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ توحید افعالی'' کا اعتقاد کسی بھی صورت میں اصل جبر اور انسان کے ارادے کی آزادی کے خلاف نہیں جاتا، خدا نے چاہا تو آئندہ صفحات میں اس پر گفتگو کی جائے گی۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف متوجہ ہوتے اور ''توحید افعالی'' کی اقسام کو محل بحث قرار دیتے ہیں، اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم ''توحید خالقیت'' سے تعلق رکھنے والی مندرجہ ذیل آیات پر نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَیۡءٍ فَاعۡبُدُوۡهُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ وَّكِیۡلٌ ۱۰۲ ﴿الأنعام:۱۰۲﴾

(۲) قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیۡءٍ وَّهُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ۱۶ ﴿الرعد:۱۶﴾

(۳) هَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَیۡرُ اللّٰهِ یَرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰی تُؤۡفَكُوۡنَ ۳ ﴿فاطر:۳﴾

(۴) وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ

---

[1] اصول کافی جلد ا باب معرفتہ الامام......صفحہ ۱۸۳ حدیث،

لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ ﴿العنکبوت: ٦١﴾

(۵) وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ ﴿الصافات: ٩٦﴾

(٦) اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٥٤﴾ ﴿الأعراف: ٥٤﴾ [1]

## ترجمہ:

(۱) وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ ہر چیز کا خالق ہے اسی کی عبادت کرو، وہی ہر شے کا نگہبان ہے۔

(۲) کہہ دو کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ وہ یکتا اور سب پر غالب ہے۔

(۳) کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے؟ وہی تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟

(۴) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور شمس وقمر کو کس نے مسخر کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے، پھر یہ کدھر بہکے جا رہے ہیں؟

(۵) خدا نے تمہیں اور بتوں (کے بنانے میں کام آنے والی چیزوں) کو پیدا کیا۔

(٦) آگاہ ہو کہ خلق اور امراسی (خدا) کے لیے ہے وہی صاحبِ برکت ہے۔ جو عالمین کا پروردگار ہے۔

## مفردات کی تشریح:

''خلق'' المفردات میں راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کا صحیح اندازہ کرنا ہے، اب یہ ایجاد وابداع یعنی اسی چیز بنانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہ ہو۔

مقاییس اللغۃ میں ''خلق'' کے دو معنی درج ہیں (۱) صحیح اندازہ (۲) کسی چیز کا صاف ہونا

---

[1] قرآن میں اس مضمون کی اور آیات بھی ہیں جیسے زمر۔ ٦٢۔ غافر۔ ٦٢۔ حشر۔ ٢٤۔ شوریٰ۔ ٢٩، الٓمٓ سجدہ۔ ۷، لقمان۔ ۱۱، روم۔ ٢٢، رعد۔ ۱٦، یونس۔ ٣٤

اسی لیے صاف وشفاف پتھر کو ''خلقاء'' کہا جاتا ہے اور اندرونی اوصاف کو ''اخلاق'' کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کی آفرینش ہے، بہر حال اس بناء پر کہ خلقت وآفرینش میں اندازہ کیا جاتا ہے۔اس میں تنظیم وزیبائش بھی ہوتی ہے۔لہٰذا یہ ابداعی خلقت یعنی پہلے سے موجود کسی مثال کے بغیر پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

## وہ عرش کا مالک ہے:

(۱) زیرِ بحث پہلی آیت میں صفات جلال وجمال میں سے بعض کا ذکر کرنے کے بعد خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے''(ذلکم اللہ ربکم)'' یعنی یہ بے حقیقت بُت نیز فرشتے اور جن تمہارے معبود نہیں، کیونکہ یہ خود مخلوق ہیں رزق اور تحفظ کے محتاج ہیں، پروردگار تو صرف خدا ہی ہے[۱]

اس کے بعد مزید کہا ہے: اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں (لاالہ الاھو) کیونکہ عبادت وبندگی کیے جانے کے لائق وہی ہے جو سب کا ''رب'' ہو یعنی تمام اشیاء کا مالک، ان کی پرورش اور تدبیر کرنے والا ہو پھر اس پر تاکید کرنے اور ایک ہی معبود کو ماننے کی دوسری دلیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ ہر چیز کا خالق ہے (خالق کل شیءٍ) اور اب نتیجہ کلام کے طور پر کہا کہ جب وہ ان اوصاف کا مالک ہے۔تو ''اسی کی عبادت کرو'' (فاعبدوئه)

اس کے ساتھ ہی اس غرض سے کہ غیر خدا سے ہر قسم کی امید کو قطع کرے، افراد انسانی کو عالم اسباب میں دل لگانے سے باز رکھے اور شرک کی جڑوں کو جلا کر راکھ کر دے...... فرماتا ہے۔وہی ہر چیز کا نگہبان ہے (وھو علی کل شیءٍ و کیلٌ)

لفظ ''شيءٍ'' علماء لغت کے بقول ہر اس چیز کے معنی میں ہے جس سے انسانی علم واطلاع کا تعلق ہوسکتا ہے[۲] لیکن آیت زیر بحث میں اس سے خدا کے علاوہ تمام موجودات مراد لی گئی ہے۔بہر حال اس لفظ کا مفہوم بڑی وسعت رکھتا ہے اس میں موجودات مادی ومجرد، ذہنی وخارجی، جوہر وعرض وغیرہ بلکہ خدا کے سوا ہر معلوم ونامعلوم شے شامل ہے، یہ آیت خدا کی خالقیت کے عام ہونے اور اس کے ہر چیز کا خالق ہونے پر ایک واضح وروشن دلیل ہے۔

اس مقام پر ایک مشہور نزاع واختلاف ہے جو لفظ ''شيء'' میں انسانی اعمال کے شامل ہونے کے خیال سے ایک گروہ میں

---

[۱] ذٰلکم اللہ ربکم کا لفظی ترجمہ ہے ''وہ ہے اللہ تمہارا پروردگار۔ لغت عرب میں ذٰلکم اشارہ بعید کے لیے آتا ہے۔ایسے مقامات پر حد سے زیادہ عظمت کا اظہار ہے جو فکر وخیال سے باہر ہے۔

[۲] شيء ''دراصل ''شاءٍ'' کا مصدر ہے، جو کبھی اسم فاعل (ارادہ کرنے والا) کے معنی میں اور کبھی اسم مفعول (ارادہ شدہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے غور کریں۔

پیدا ہو جیسا کہ قائلین جبر میں سے فخر رازی کہتا ہے: ہمارے اعمال بھی لفظ ''شی ء'' میں داخل ہیں، پس ان کا خالق بھی خدا ہی ہے......وہ اس آیت کو عقیدہ جبر کی دلیل قرار دیتے ہیں لیکن انسان کی آزادی ارادہ کے حامی اس کا واضح اور مدلل جواب دیتے ہیں جس کا ذکر توضیحات میں آئے گا۔

ایک گروہ اس آیت سے اشاعرہ کے مقابل صفات زائد بر ذات کی نفی پر استدلال کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کی صفات زاید بر ذات ہیں، حالانکہ اگر یہ صورت ہو تو وہ صفات لفظ ''شی ء'' کے مفہوم میں داخل ہو کر خدا کی مخلوق قرار پاتی ہیں اور یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ خدا اپنی صفات، مثل علم وقدرت کا خالق ہے۔ نیز یہ چیز اس کے واجب الوجود ہونے کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔

اس ضمن میں بعض اشاعرہ کہتے ہیں ہ ہم اس آیت کے عموم کو تخصیص میں بدل سکتے ہیں۔ یعنی ہم یوں کہیں کہ ''صفاتِ خدا'' خالق کل شی ء'' میں شامل نہیں ہیں! لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آیت کا طرزِ بیان ہر قسم کے استثناء کی نفی کرتا ہے اور خدا نے چاہا تو ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ آیت زیرِ بحث کے متعلق کوئی تخصیص وارد نہیں ہوئی ہے۔

(۲) دوسری آیت مذکورہ بالا آیت کے مضمون کو خدا کی وحدانیت وقہاریت پر تاکید کا اضافہ کرتے ہوئے بیان کرتی اور کہتی ہے ان مشرکوں سے کہو: جن کو تم خدا کے شریک قرار دیتے ہو کیا انہوں نے خدا کی طرح کوئی چیز پیدا کی ہے؟ ان مخلوقات کے بارے میں وہ دھوکہ کھا گئے ہیں، چونکہ وہ ان کے متعلق ایسا دعویٰ ہرگز نہیں کرتے لہٰذا'' کہہ دو کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے، وہ یکتا اور سب پر غالب ہے'' (قل الله خالق کل شیء وهو الواحد القهار)۔

''قہار'' کا مادہ ''قہر'' ہے۔ اس کے اصلی معنی مدمقابل کی تحقیر کے ساتھ اس پر غلبہ پانا ہے۔ اس لیے یہ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ یہاں اس کا صیغہ مبالغہ آیا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی ہر چیز اور ہر فعل میں بلا قید وشرط مطلق طور پر غلبہ وکامیابی حاصل کرنے کے ہیں۔ حتیٰ کہ اس سے مشرکوں کے معبود اور بت بھی مستثنیٰ نہیں ہیں...... پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ خدا کے شریک قرار پاسکیں۔

(۳) تیسری آیت میں ایک بات استفہام انکاری کی صورت میں ذکر ہوئی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے؟ وہ تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے۔ (هل من خالق غیر الله یرزقك من السمآءِ والارض)۔

نہ......اس کے سوا کوئی خالق نہیں کہ جس نے اولاً تمہیں پیدا کیا اور اب تمہاری بقاء وحیات کے لیے اس کی طرف سے تمہیں متواتر روزی مل رہی ہے۔ وہی ہے جو آسمان سے سورج کی حیات بخش روشنی، زندہ رکھنے والی بارش اور رُوح پرور ہوا کے جھونکے بھیجتا ہے۔ وہی ہے جو زمین سے تمہیں سبزیاں میوے، اناج اور قیمتی معدنی ذخائر عطا فرماتا ہے۔

جب اس کے سوا کوئی خالق ورزاق نہیں اور تمہارا آغاز وانجام اسی کے ہاتھ میں ہے تو اس کے سوا کوئی معبود بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو، (لا اله الا هو فانی توفکون)

## بُت پرست بھی خدا کو خالق جہان مانتے ہیں:

(۴) چوتھی آیت میں ''توحید خالقیت'' کا ایک اور انداز سے ذکر ہوا ہے وہ یوں کہ بت پرست بھی اس بات کے معترف ہیں کہ آسمان وزمین کے خالق بت نہیں بلکہ خدا ہی ان کا خالق ہے۔ ارشاد ہوا: اگر آپ ان (مشرکوں) سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور شمس وقمر کو کس نے مسخر کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے (ولئن سالتھم من خلق السمٰوٰتِ والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین اپنے بُتوں کو عبادت یا انسانوں کی تقدیر میں تاثیر رکھنے میں خدا کے شریک وہم پایہ سمجھتے تھے نہ کہ خالقیت میں...... کیونکہ کوئی عاقل انسان ان بتوں کو زمین وآسمان کے خالق نہیں کہتا کہ جو پتھر اور لکڑی سے خود انسانوں نے بنائے اور وہ گویا انسان کی تخلیق ہیں، حتیٰ کہ وہ انبیاء واولیاء کے لیے بھی اس مرتبے کے قائل نہ تھے۔

یہ آیت ضمنی طور پر اس عقیدے کے انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہونے کی طرف ایک اشارہ بھی قرار پاسکتی ہے، لیکن توحید خالقیت اور توحید عبادت میں کوئی تناقض نہیں لہٰذا خدا کو خالق ماننا اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرلینا بہت بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ عبادت کے لائق وہی ہے۔ جو خالق ورازق ہے جس نے آفتاب ومہتاب کو مسخر کیا اور انہیں انسان کا خدمت گذار بنایا، اس لیے خالقیت اور بوبیت میں کوئی جدائی نہیں، نہ ربوبیت اور الوہیت میں کوئی غیریت ہے۔ اس سے واضح تر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہی خالق وہی مدیر جہان اور وہی بندوں کے لیے عبادت اور پرستش کے لائق ہے۔

بعض مفسرین مثلاً تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کے مولف کا خیال ہے کہ مشرکین عرب میں توحید خالقیت کا اعتقاد حضرت ابراہیمؑ جیسے انبیاءؑ کی تعلیمات کے باقی ماندہ اثرات میں سے تھا[1] لیکن اس بات پر مصر ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ عقل ووجدان کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہر انصاف پسند انسان اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اس جہان کو پیدا کرنے والی ایک ہستی لازماً وجود رکھتی ہے جیسا کہ تفسیر روح البیان میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[2]

بہرحال مسئلہ آفرینش اور تسخیر کا ایک ساتھ ذکر کرنے میں دو چیزیں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان میں سے ایک معاملہ خلقت اور دوسرا مسئلہ تدبیر ہے کہ یہ دونوں خدا ہی کے فرمان سے انجام پاتے ہیں۔

اس آیت اور تسخیر سے متعلق دیگر آیات میں ''تسخیر'' سے مراد (آفتاب ومہتاب سے) انسان کے منافع کیلئے کام لینا ہے

''فَاَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ'' کا مادہ ''افک'' بروزن ''فکر'' ہے...... اس کا معنی کسی چیز کو اس کے اصل راستے سے ہٹادینا ہے اس پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ممکن ہے یہ اس چیز کی طرف اشارہ ہو کہ صحیح راستہ یہ ہے کہ خالقیت وتدبیر کا اعتقاد رکھنے کے بعد اس کے سوا کسی کی

---

[1] تفسیر ''فی الظلا القرآن'' جلد ٦ صفحہ ۴٢٨۔

[2] تفسیر روح البیان جلد ٦ صفحہ ۴٨٨

عبادت نہ کی جائے لیکن ان لوگوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کرلیا اور نفسانی وشیطانی خیالوں کے گرداب میں پھنس گئے جس نے انہیں تنکوں کی طرف ادھر سے اُدھر پھینک دیا اور وہ غلط رہوں پر چل پڑے (توجہ رہے کہ مخالف ہواؤں کو مؤتفکات کہا جاتا ہے)

(۵) پانچویں آیت میں بتوں کے مخلوق ہونے کا ذکر ہے جیسا کہ فرمایا: خدا نے تمہیں اور بتوں (کے بنانے میں کام آنے والی چیزوں) کو پیدا کیا (وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ)

یہ اس لئے کہا گیا کہ اس سے پہلی آیت میں توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیمؑ کی زبانی مشرکین سے یوں خطاب ہوا ہے: کیا تم اس چیز کی پرستش کرتے ہو جسے تم نے خود تراشا اور بنایا ہے؟ اس کے بعد آیت زیر بحث میں فرمایا: تم اور تمہارے یہ بت (جو تم نے بنائے) خدا کی مخلوق ہیں، الہٰذا تم مین سے کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں بلکہ یہ بت تو تم سے پست تر ہیں کہ انہیں تم لوگوں نے اپنے ہاتھوں یہ شکل وصورت دی ہے۔

البتہ ان معنوں کے لحاظ سے "ماتعملون" میں "ما" موصولہ ہوگا لیکن بعض علماء نے یہ احتمال دیا ہے یا ان کا اصرار ہے کہ یہ "ما" مصدر یہ ہے مگر اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ قرار پائے گا۔ خدا نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ہے جب کہ یہ مفہوم کئی وجوہ سے مناسب نہیں ہے۔

(۱) اس آیت میں خداوندتعالیٰ مشرکوں کوان کی بت پرستی پر سرزنش کررہا ہے۔ اگر خود خدا ہی ان کے اعمال کا خالق ہے تو یہ سرزنش کس بنا پر ہے۔

(۲) آیت ماقبل میں بتوں کے بارے میں بات ہورہی ہے کہ وہ انہیں اپنے ہاتھوں تراشتے ہیں" مناسب یہی ہے کہ اس آیت میں بھی انہیں کا ذکر ہو ورنہ ربط آیات ٹوٹ جائے گا۔ اسی بناء پر بہت سے مفسرین جیسے زمخشری نے کشاف میں، آلوسی نے روح المعانی میں اور علامہ طباطبائی نے المیزان میں تفسیر اوّل ہی کو ترجیح دی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے یہ کیونکر ممکن ہے کہ بت انسان کی صنعت بھی ہوں اور پھر خدا کی مخلوق بھی ہوں زمخشری نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے: بتوں کا مواد خدا کی مخلوق اور ان کی شکل انسان کی صنعت ہے جنہوں نے ان کو تراشا ہے[1]

لیکن بتوں کی صورت وشکل بھی ایک طرح سے خدا کی مخلوق ہے کیونکہ خدا نے ہی انسان کو قوت، علم اور مہارت دی اگر چہ اس نے ان صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھانے سے منع بھی کررکھا ہے۔

(۶) چھٹی اور آخری آیت میں ہم توحید خالقیت کا ذکر ایک نئے انداز میں پاتے ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے آگاہ رہو کہ خلق اور امر (تدبیر عالم) اسی (خدا) کے لیے ہے۔ (الا لهُ الخلق و الامرُ)

وہی صاحب برکت ہے جو عالمین کا پروردگار ہے (تبرك الله رب العلمين)۔

بلاشک یہ آیت "خلق" اور "امر" کے خدا کی ذات کے لیے حصر وانحصار پر ایک واضح دلیل ہے اس بناء پر یہ آیت بڑی وضاحت کے

---

[1] تفسیر کشاف جلد ۴ صفحہ ۵۱۔

ساتھ ''توحید خالقیت'' کو بیان کر رہی ہے[1]

لیکن اس بارے میں کہ ''امر'' سے کیا مراد ہے...... مفسرین کے درمیان بہت زیادہ بحث و گفتگو رہی ہے، ان میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس سے مراد تدبیر جہان اور وہ نظم و قانون ہے جو یہاں تکوینی طور پر جاری وساری ہے ان کے بیان کا قرینہ وہ کثیر آیات ہیں جن میں یہی بات کہی گئی ہے۔ مثلاً ان فرشتوں کی قسم کہ جو تدبیر امور تدبیر جہان اور وہ نظم و قانون ہے جو یہاں ان فرشتوں کی قسم کہ جو تدبیر امور کرتے ہیں فالمدبراتِ امراً (نازعات، ۵) خدا وہ ہے جس نے دریا کو تمہارے لیے مطیع بنایا تا کہ اس میں اسی کے امر سے کشتیاں حرکت کریں الله الذی سخرلکم البحر التجری الفلك فیه بأمره (جاثیہ ۱۲) ان کے ایسی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

بعض مفسرین نے ''امر'' کو نہی کے مقابل امر تشریعی واحکام الٰہی کے معنی میں تصور کیا ہے، اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوتے ہیں: خلق وآفرینش خدا کے ساتھ مخصوص ہے، اسی کی طرف سے بندوں کے لیے احکام تشریعی صادر ہوتے ہیں، جیسے ایک آیت میں کہا گیا: جو لوگ امرِ خدا کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس سے باز رہیں۔ فلیحذرِ الذین یخالفون عن امرہ (نور، ٦٣)

لفظ ''امر'' کی تیسری تفسیر میں اس سے مراد ''ارادہ'' ہے۔ جیسے خدا جس امر کا ارادہ کرتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے ان الله بالغ امرہ (طلاق ۳)

چوتھی تفسیر میں عالم ''خلق'' سے عالمِ مادہ اور عالم ''امر'' سے عالم مجردات مراد لیا گیا ہے، اس میں یہ آیت پیش نظر رکھی گئی ہے۔ یہ آپ سے رُوح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہیں کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے ویسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی۔ (اسراء، ۸۵)

لیکن یہ بات واضح ہے کہ پہلی تفسیر قرآنی آیات اور زیر بحث آیت کے مضمون سے بھی مناسبت رکھتی ہے۔ کیونکہ قرآن مشرکین کو باور کرانا چاہتا ہے کہ خلقت وآفرینش اور مخلوقات کی تدبیر خدا کے ساتھ مخصوص ہے، پھر ''رب العالمین'' کا جملہ بھی اس کا شاہد ہے۔

پس بتوں کا نہ خلقت میں اور نہ ہی تدبیر و ربوبیت میں کسی طرح کا دخل ہے لہٰذا ان کی پرستش کیوں کرتے ہو؟

# توضیحات

## (۱) شرک درخالقیت کی طرف پہلا قدم:

ممکن ہے زردشتی وہ پہلے لوگ ہوں جنہوں نے خالقیت میں خدا کا شریک ٹھہرایا، اگر ایسا نہ ہو تو بھی وہی شرک پر اعتقاد رکھنے میں زیادہ مشہور ہیں۔

زردشتیوں نے موجودات کی دو اقسام قرار دیں...... نیک و بد...... (خیر وشر) ...... پھر انہوں نے ان دونوں اقسام میں سے ہر ایک

---

[1] خلق و امر پر ''لہ'' کی تقدیم خدا کے لیے ان کے حصر اور غیر سے نفی کی دلیل ہے۔

کے لیے ایک الگ خالق تجویز کیا یعنی ''یزدان واہرمن، یا ''نور وظلمت'' اس کے لیے ان کی دلیل یہ ہے کہ خالق اور مخلوق میں مناسبت ہونا چاہیے اور ''خیر'' کے خالق کی ''شر'' سے کوئی نسبت نہیں لہٰذا ''خیر'' کا خدا ''خیر'' اور ''شر'' کا خدا ''شر'' کا حامل ہے۔[1]

بہر حال اگر موجودات جہان میں یہ گروہ بندی موجود ہوتی ہے تو ممکن ہے ان کا یہ استدلال صحیح قرار پاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جہان میں ''خیر'' کے علاوہ کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جس چیز کو ''شر'' کا نام دیا جاتا ہے وہ یا تو عدمی ہے یا نسبتی پہلو سے شر کہلاتی ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ''فقیر'' شر ہے، جب کہ فقر ضروریات زندگی سے تہی دامن ہونے کے سوا کچھ نہیں، یہ ناداری ایک امر عدمی ہے اور عدم ایک ایسی چیز ہے، کہ اس کا کوئی آفریدگار نہیں ہے۔

یا یوں سمجھ لیں کہ ہم شہد کی مکھی کے ''ڈنک'' اور درندے کے ''پنجے'' کو شر کہہ دیں جب کہ ہم خود کو مرکز و محور تصور کرتے ہوئے اس طرح کا فیصلہ دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم شہد کی مکھی کی طرف توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ڈنک اپنے دشمن سے دفاع کے لیے اس کی اہم ضرورت ہے اسی طرح درندے کا پنجہ اس کے لیے شکار کرنے اور اپنی خوراک بہم پہچانے کا وسیلہ ہے۔ لہٰذا یہ چیزیں ان کے لیے ''خیر'' کا پہلو رکھتی ہیں۔ اسی قسم کے اور بھی بہت سے موجودات ہیں جن کو ہم اپنے حسابوں ''شر'' کہتے ہیں لیکن ان کی اصلیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

کبھی ہماری جہالت اور بے علمی اس کا سبب بنتی ہے کہ ہم بعض چیزوں کو برا (شر) سمجھ لیتے ہیں۔

مثلاً ممکن ہے کہ ہم میکروب (جراثیم) کے وجود کو شر سمجھیں کہ وہ بیماری پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم بعض ماہرین کے نظریئے پر توجہ کریں کہ میکروب انسانی بدن کے سلول (خلیوں) کو ہمیشہ مقابلے پر اکساتے ہیں جس سے ان میں زیادہ سے زیادہ طاقت اور فعالیت پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ میکروب نہ ہوں تو شاید ایک انسان کا وجود اسی (۸۰) سال سے اوپر زندہ نہ رہتا اور اس زندگی میں بھی وہ کمزور و ناتواں ہوتا، اس لحاظ سے ہم مانتے ہیں کہ ہمارا ان میکروب کو شر (برا) سمجھنا خود ہماری ہی نادانی کا نتیجہ ہے اور وہ حیات انسانی کے لیے مفید اور نافع ہیں۔

یاد رہے کہ جس خالق نے ان میکروب کو پیدا کیا، جب وہ حد سے بڑھ جائیں تو ان سے مقابلہ کرنے اور انہیں زیر کرنے کا سامان بھی کر دیا ہے۔ چنانچہ انسان کے جسم میں ایسے خلیے موجود ہیں جو ان کا سامنا کرتے ہیں۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہے آج کے دور میں حیوانات کے زہر سے کئی ایک شفا بخش دوائیں تیار کی جارہی ہیں اسی لیے قسم قسم کے سانپ اور دوسرے زہریلے جاندار اپنے اندر زہر کی تیاری اور حفاظت کرتے ہیں۔ پس ایسے جانداروں کے ڈنک اور ان میں پائے جانے والے زہر مطلق طور پر بُرے (شر) نہیں ہیں اس موضوع کے بارے میں مزید وضاحت انشاءاللہ عدلِ الٰہی کی بحث کے ضمن میں کی جائے گی۔

## (۲) راہِ شرک میں دوسرا قدم:

مسئلہ شرک میں مسلمانوں کے دو گروہ صحیح راستے سے بھٹک گئے وہ شاعرہ اور معتزلہ (مفوضہ) ہیں۔

---

[1] بعض کے نزدیک یہ عقیدہ مزدک اور اس کے پیروکاروں کا ہے لہٰذا وہ زردشت کو موحد سمجھتے ہیں۔

## اشاعرہ:

اشاعرہ، ابوالحسن اشعری (متوفی ۳۲۴ھ) کے پیروکار ہیں، یہ لوگ عالمِ خلقت میں علت ومعلول اور ہر قسم کی تاثیر کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں: اگر آگ کسی چیز کو جلا رہی ہے تو یہ محض ایک مفروضہ ہے اور دراصل جلانے والا خدا ہے، لیکن خدا کا ارادہ یہ ہے کہ آگ اس وقت جلائے گی جب انسان کا ہاتھ اس سے مس کرے خدا ہی نے اس کے ہاتھ کے لیے جلنا مقرر کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اس جہان میں علت ومعلول کے وجود سے انکار کیا ہے، ان کے نزدیک بلا واسطہ اور براہ راست سب کاموں کی علت صرف خدا ہی ہے۔

انہوں نے ایک محسوس بلکہ محسوس سے بھی بالاتر چیز کا انکار کر دیا۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ہم عالم اسباب کا اعتقاد کر لیں تو ''توحید خالقیت'' اُلٹ پلٹ ہو کر رہ جائے گی [1]

اشاعرہ اس بہت بڑی غلط فہمی کے باعث ایک زبردست انحراف میں گرفتار ہو گئے وہ یہ کہ انہوں نے انسان کے اعمال وافعال کو بھی خدا کی مخلوق سمجھ لیا اور یہ جبر کی بدترین قسم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات جبر سے بھی کچھ بڑھ کر رہے کہ وہ کہتے ہیں: یہ ہم نہیں ہیں جو اچھے برے اعمال انجام دے رہے ہیں، بلکہ ان کا خالق خود خدا ہی ہے، اصل میں یہ براہ راست اسی کے اعمال ہیں اور یہ ہمارے جبری اعمال نہیں ہیں۔ (غور کریں)

## معتزلہ:

اشاعرہ کا نقطہ مقابل معتزلہ ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ اس جہان میں اسباب وعلل ہیں اور یہ اپنی تاثیر میں مستقل ہیں۔ مثلاً وہ معتقد ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے بعض انبیاء اور اولیاء کو پیدا کیا اور پھر امرِ خلقت ان کے سپرد کر دیا نیز وہ انسان کو اپنے اعمال میں کلی طور پر مختار و مستقل جانتے ہیں۔ اس طرح وہ انسان کو خالق اصغر اور خدا کو خالق اکبر تصور کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں گروہ غلط فہمی میں پڑ گئے اور دونوں ہی ایک طرح سے شرک میں مبتلا ہوئے ہیں، ان میں سے ایک گروہ شرک جلی میں اور دوسرا شرک خفی میں گرفتار ہے۔

چنانچہ معتزلہ جو ''تفویض'' کے قائل ہیں وہ شرک جلی میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے اعمال میں انسان کے مستقل ومختار کل ہونے کے معتقد ہیں یا وہ اس چیز پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے زمین وآسمان کی خلقت وآفرینش اپنے اولیاء کے سپرد کر دی اور خود ایک طرف ہو بیٹھا ہے۔ یہ نظریہ اور یہ تصور صریحاً قرآنی آیات کے خلاف ہے کیونکہ قرآن پکار پکار کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا شرکت غیرے اس کائنات کا خالق اور مدبر ہے۔ یہ بڑی تعجب کی بات کہ کوئی شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہو اور پھر ایسی لایعنی گفتگو کرے۔

---

[1] قانون علت صرف حسی چیز نہیں ہے بلکہ وجدان اور علم حضوری سے بھی اس تک رسائی ہوتی ہے کیونکہ ہر شخص واضح طور پر دیکھتا ہے کہ اس کی روح ایک ارادہ اور تفکر پیدا کرتی ہے۔

اسی طرح اشاعرہ کا گروہ بھی شرک کی ایک اور قسم کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ اولاً دنیا میں اصل علیت کے وجود سے انکار وجدان وحسن کے برخلاف ہے ثانیاً اگر اصل علیت کو ماننا شرک ہے تو پھر وجود انسان کو ایک اصل کے طور پر تسلیم کرنا بھی شرک ہوگا۔

انسان اپنے اعمال وافعال کی انجام دہی میں مختار اور آزاد ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کی قوت وطاقت یہاں تک کہ اس کے ارادے کی آزادی بھی خدا کی عطا کردہ ہے وہی ہے جو چاہتا ہے کہ انسان آزاد ہو۔ اس لیے انسانی اعمال جو انسان ہی کے ہیں، ان کی خدا کی طرف نسبت دی جاسکتی ہے اور وہ اس کے دائرہ خلقت سے خارج نہیں ہیں، جیسے یہ اعتقاد کہ وجود انسان اسی سے وابستہ ہے اور یہ شرک نہیں۔

ایک مثال پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ بہت سی گاڑیاں بجلی سے چلتی ہیں جس کے تار پٹڑی کے ساتھ ساتھ اُوپر تنے ہوتے ہیں، ان تاروں سے انجن کا رابطہ ایک آہنی حلقے کے ذریعے قائم رہتا ہے گاڑی چلانے والا (ڈرائیور) اپنے عمل میں آزاد ہے کہ اپنی مرضی سے گاڑی کو چلاتا اور ٹھہراتا ہے لیکن اس سارے عمل کی مرکزی قوت کسی اور کے ہاتھ میں ہے کہ جس کو بجلی کے تاروں کے اس سارے سلسلے پر قابو حاصل ہے اور وہ جب چاہے ایک بٹن دبا کر گاڑی کو روک دے۔ لہٰذا وہ یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ گاڑی کی حرکت میرے بس میں ہے اور گاڑی کا ڈرائیور بھی یہ بات کہنے کا حق دار ہے کہ گاڑی کا چلنا اور ٹھہرنا میرے ہاتھ میں ہے۔ درحقیقت وہ دونوں ہی سچ کہہ رہے ہیں کیونکہ وہ دونوں گاڑی چلانے ٹھہرانے کے فعل کے فاعل ہیں لیکن ان کا فعل ایک دوسرے کے طول میں یعنی یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتا ہے نہ کہ ایک دوسرے کے مقابل۔

ایک پہلے مرحلے میں گاڑی چلانے کے فعل کا فاعل ہے اور وہ بلند وبالا ہے۔

دوسرا مرحلہء دوم میں اس فعل کا فاعل ہے جو پہلے کے ساتھ وابستہ اور اس سے پست ہے۔

گاڑی کو چلانے اور روکنے کے عمل کی نسبت دونوں کی طرف ہے۔ لیکن اس کے باوجود ڈرائیور اپنے کام میں آزاد اور جواب وہ ہے نہ کہ مجبور...... بناء بریں انسان کے اپنے ارادے میں آزاد ہونے کا اعتقاد خدا کی خالقیت میں شرک متصور نہیں ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر اصل وجود انسان جو خدا سے وابستہ ہے اور اس کو تسلیم کرنا موجب شرک نہیں تو انسان کے افعال کو اس سے نسبت دینا بھی شرک قرار نہیں پاتا۔

اشاعرہ وجودِ انسان کو مستقل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، لیکن اگر ایک وجود وابستہ توحید میں مزاحم نہیں تو اس کے افعال بھی توحید میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتے۔

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک اور مثال سے اس بحث کو کچھ اور بھی واضح کردیا جائے۔

اشاعرہ کی طرف سے اصل علیت وسببیت کا انکار اس گمان کی بناء پر ہے۔ یہ شرک شمار ہوتا ہے یعنی اگر جلانے کے عمل کو آگ کی طرف نسبت دیں تو بقول ان کے یہ شرک ہے، جب کہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آیا خدا کے مقابل آگ کے اصل وجود کا قائل ہونا شرک نہیں ہے؟ اس کے جواب میں وہ لازماً یہ کہیں گے۔

کہ آگ کا وجود ذاتِ خداوندی سے وابستہ ہے۔ لہٰذا آگ کے وجود کو تسلیم کرنا شرک نہیں ہے (جیسا کہ وہ روشنی جو قمقمے سے مرتعش ہوتی ہے وہ اس قمقمے کے بجلی گھر سے رابطے کی بدولت اسی سے وابستہ ہے اور جب یہ رابطہ منقطع ہوجائے تو وہ روشنی ناپید ہوجاتی ہے)۔

بعینہ یہی بات ہم اس دنیا میں اسباب وعلل کی تاثیر کے بارے میں کہتے ہیں کہ آخرش وہ خدا کے وجود سے وابستہ ہیں، انسان کی قوت واختیار بھی اسی ذات سے وابستہ ہے۔ بہ ایں طور ان تمام موارد میں توحید ثابت ومحفوظ رہے گی، گویا ہر چیز کا خالق خدا ہے۔ اصل علیت اور انسان کی آزادی ارادہ کو تسلیم کرنے سے اس کی خالقیت ووحدانیت میں کوئی خلل نہیں آتا۔

جبر واختیار کی بحث میں انشاء اللہ اس موضوع سے متعلق مزید تشریحات سپرد قلم کی جائیں گی۔

# (۲) توحید ربوبیت

## اشارہ:

توحید ربوبیت کے معنی یہ ہیں کہ اس عالم ہستی کا منصوبہ ساز، اس کا نظام قائم کرنے والا اور اسے چلانے والا صرف خدائے واحد ہے۔

لفظ ''رب'' کہ خدا کے صفات میں سے ایک ہے اور فارسی میں اس کا بدل ''پروردگار'' آتا ہے۔ شاید یہ تمام اوصاف خداوندی میں سے قرآن میں سب سے زیادہ دوہرایا گیا ہے۔ (یعنی رب، ربك، ربکم، ربنا، اور ربی کی صورت نو سے زیادہ مرتبہ قرآن میں مذکور ہے)۔

بہت سی آیات قرآن میں خداوند تعالیٰ کو ''رب العالمین'' (اہل جہان کو پالنے والے) کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن مسئلہ توحید ربوبیت پر خاص طور پر توجہ دیتا ہے، کیونکہ مشرکین ایسے لوگ تھے جو تدبیر جہاں (دنیا کا نظام چلانے) میں بعض موجودات کو خدا کے ساتھ شریک اور ساجھی قرار دیتے تھے۔ چونکہ اکثر مشرکین جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ توحید خالقیت پر یقین رکھتے تھے، لیکن توحید ربوبیت کے ضمن میں شرک کے مرتکب ہو رہے تھے، یہی وجہ ہے کہ قرآن عقیدے کی اس غلطی اور اس بہت بڑی گمراہی کی بار بار تردید کرتا ہے۔ جو مختلف اقوام میں موجود رہی ہے، نیز یہ کہ شرک وروبیت بجائے خود بہت سی گمراہیوں اور بے لگامیوں کا سرچشمہ ہے جن کے بارے میں آئندہ مباحث میں گفتگو کی جائے گی۔

اس اشارے کے ساتھ ہی ہم توحید روبیت سے متعلق آیات قرآن میں سے درج ذیل آیتوں پر توجہ دیتے ہیں۔

(۱) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ (فاتحہ [1] ۔۱)

(۲) قُلۡ اَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡغِىۡ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَىۡءٍ ﴿الأنعام: ۱۶۴﴾

(۳) قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ﴿رعد: ۱۶﴾

(۴) فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَـقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡـكَرِيۡمِ ۱۱۶

﴿المؤمنون: ۱۱۶﴾

---

[1] رب العالمین'' کی ترکیب آیات قرآن میں کچھ اوپر چالیس بار آئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے مسئلہ توحید ربوبیت کی وضاحت اور تشریح پر بہت زیادہ توجہ دی ہے جس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۵) اللّٰہَ رَبَّکُمۡ وَرَبَّ اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ ۱۲۶ ﴿الصافات:۱۲۶﴾

(۶) قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اَمَّنۡ یَّمۡلِکُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَمَنۡ یُّخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَیُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ وَمَنۡ یُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ۔ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ اللّٰہُ۔ فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ۳۱ ﴿یونس:۳۱﴾

## ترجمہ:

(۱) تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں جو تمام اہل جہان کا پالنے والا ہے۔

(۲) کہو کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی پروردگار ڈھونڈوں، جب کہ وہ ہر چیز کا پروردگار ہے۔

(۳) کہو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ کہو کہ اللہ!

(۴) پس برتر ہے وہ خدا جو بادشاہ حق ہے (اس سے بالاتر ہے کہ تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہو) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرشِ کریم کا پروردگار ہے۔

(۵) وہی اللہ تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا پروردگار ہے۔

(۶) کہو کہ کون تمہیں آسمان و زمین سے روزی دیتا ہے؟ کون کان آنکھوں کا مالک (اور خالق) ہے؟ کون زندہ کو مردہ میں سے، اور مردہ کو زندہ میں سے نکالتا ہے؟ زندہ کو مردہ میں سے، اور مردہ کو زندہ میں سے نکالتا ؟ کون امور عالم کی تدبیر کرتا ہے؟ فوراً وہ (تمہارے جواب میں) کہیں گے......اللہ......کہو کہ پھر کیوں تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟ (کیوں خدا سے نہیں ڈرتے اور راہ شرک پر چلتے ہو)۔

## مفردات کی تشریح:

''رب'' یہ ایک بنیادی لفظ ہے، اس کی شاخیں اور موارد و استعمال بہت زیادہ ہیں۔ یہ ایک اساسی و بنیادی لفظ اس اس طرح ہے کہ المفرادات میں راغب اصفہانی کہتا ہے: اس کے معنی تربیت دینا اور کسی چیز کو کمال کی راہ پر ڈالنا ہیں۔

مقاییس اللغۃ میں اس کے چند ایک اساسی معنی بیان ہوئے ہیں۔

(۱) وہ شخص جو کسی چیز کی اصلاح کرے اور اس عمل پر قائم رہے۔

(۲) جو کسی چیز کو لازم کرے اور اسے قائم رکھے۔

(۳) دو چیزوں کو آپس میں ملانا۔

لیکن جیسا کہ ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں کہا گیا ہے کہ ان سب معانی کی بازگشت ایک اصل کی طرف ہے جس کی تعبیر کچھ یوں ہے: رب و ربوبیت سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو مختلف جہات مثلاً مادی و معنوی ذاتی و عرضی، نیز اعتقاد، صفات اور اخلاق میں کمال حاصل کرنے اور نقائص دور کرنے کے راستے پر لگانا اور اس میں اس کی نصرت کرنا۔

چونکہ ایسے عظیم کام کے لیے اقدام کرنے میں دیگر مفاہیم، جیسے اصلاح، تدبیر، حکومت مالکیت مصاحبت، سیادت، اجتماع، تعلیم اور تغذیہ بھی شامل ہیں، اس لیے ان معانی میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کتب لغت میں اس کے متعدد معانی ذکر ہوئے ہیں، مثلاً لسان العرب میں ہے۔ کہ لفظ ''رب'' کا اطلاق خداوند کریم کی ذاتِ پاک پر کیے جانے کے علاوہ اسے مالک وقاء مدیر، مربی، قیم اور منعم کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے یہ اصل میں اس کے معنی وہی پرورش، تربیت اور کمال کی طرف لے جانا ہیں پھر ان کے ساتھ لزوم رکھنے والے ہر امر پر اس کا اطلاق ہونے لگا، اسی بنا پر لفظ ''رب'' کے فارسی ترجمہ میں اسے ''پروردگار'' سے تعبیر کیا جاتا جو ان تمام معانی کا جامع ہے [۱]

بہرحال علماءِ لغت کے اقوال سے اس کا جو مفہوم سمجھ آتا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ ''رب'' مفرد طور پر صرف ذات الٰہی کیلئے بولا جاتا کیونکہ وہی تمام چیزوں کا مالکِ حقیقی، ولی اور مصلح ہے لیکن جب یہ غیر خدا کے لیے استعمال ہو تو یہ کسی اور کلمہ کی طرف مضاف ہوگا، جیسے ''رب الدار'' (گھر کا مالک) ''رب الابل'' اُونٹ کا مالک) اور ''رب الصبی'' (بچے کی پرورش وتربیت کرنے والا)'' [۲]

جب لفظ ''رب'' خدائے تعالیٰ کے لیے استعمال کیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ ربوبیت کے مختلف جہات کو ظاہر کر رہا ہو۔ جیسے مالکیت، تدبیر، اصلاح اور سرپرستی وعطائے نعمت وغیرہ (غور کریں)۔

''تدبیر'' اس کا مادہ ''دبر'' بروزن ''ابر'' ہے جس کا معنی کسی چیز کے بعد یا پیچھے آنا ہے، تدبیر سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کا انجام خوب ہو اور وہ مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کے قابل بن جائے...... یہ کام علم وآ گاہی کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ''مدبر'' ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو مختلف کاموں کے نتیجے پر نظر رکھیں، ان کو مطلوبہ مقاصد تک پہنچائیں اور اس بارے میں ضروری علم وآ گاہی رکھتے ہوں [۳]

---

[۱] یاد رہے کہ رب کا مادہ ''دبب'' ہے جیسے تربیت کا مادہ ''ربو'' ہے لغت میں ''رب'' کے جو معنی دیئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''رب وربو'' ایک ہی معنی رکھتے ہیں، علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان جلد ۱ صفحہ ۲ ۳ میں ان دونوں لفظوں کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔

[۲] لسان العرب، مفرداتِ راغب اور قاموس اللغۃ میں مادہ ''رب'' کے ذیل میں دیکھیں۔

[۳] ملاحظہ فرمائیں۔ مقاییس اللغۃ، مفرداتِ راغب، اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

## اے خدا......توسارے جہان کا پروردگار ہے

(۱) پہلی آیت جسے ہم اپنی نمازوں میں دوہراتے ہیں اس میں کہا گیا ہے تمام تعریفیں خدا کیلئے ہیں جو تمام اہل جہاں کا پالنے والا ہے۔ (الحمدللہ رب العلمین)

یہ جملہ اسی صورت میں قرآن کی متعدد آیات میں بندوں کی طرف سے اور خدا کی طرف سے بار ہا دہرایا گیا ہے، ان مواقع پر کبھی اس کا تعلق دنیا سے ہے اور کبھی قیامت سے مربوط ہے۔[۱]

درحقیقت یہ آیت اپنے اندر ایک پر معنی استدلال لیے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ خدائے بزرگ وبرتر ہر طرح حمد، ستائش اور تعریف کے لائق ہے کیونکہ وہ اہل جہاں کا حقیقی وواقعی مربی وسرپرست ہے۔ وہ ان کا خالق بھی ہے اور رازق بھی، ان کا مالک بھی ہے اور کمال کی طرف لے جانے والا بھی، وہ ان کے کام بنانے والا ہے بھی ہے۔ اور ان کو نیک وبد سمجھانے والا بھی وہ ان کا معلم بھی ہے اور ہادی بھی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ''الحمد'' جب جنس کی صورت میں آئے تو اس میں تمام اقسام کی تعریفیں اور ستائشیں شامل ہوجاتی ہیں، اسی طرح العالمین'' جب الف لام کے ساتھ جمع کی صورت میں آئے تو یہ تمام موجودات عاقل وغیر عاقل مادی ومجرد کو شامل ہوتا ہے۔ اس کے صیغہ جمع عاقل آنے کی وجہ مخلوق عاقل کی تغلیب وکثرت ہے[۲])

بنابریں اگر اس دُنیا میں کچھ لوگ تعلیم وتربیت اور رزق ونعمت دے رہے ہیں تو یہ اس خدائے واحد کی ربوبیت ہی کا پرتو ہے اگر کوئی شخص مالکیت رکھتا ہے تو یہ اسی کی مالکیت مطلقہ کی ایک شعاع ہے لہٰذا قبل اس کے کہ ہم اس کے بندوں کے احسان پر ان کا شکر یہ ادا کریں اور ان کی تعریف کریں، ہمیں خدا کی ذات مقدس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

چونکہ ''حمد وسپاس'' اس کی طرف سے عطاء ہونے والی نعمتوں پر ہے لہذا فخر رازی نے اس مقام پر خداوند تعالیٰ کی نعمتوں کا اجمالی تذکرہ کیا ہے وہ کہتا ہے، اگر صرف انسانی بدن پر بغور نظر ڈالی جائے تو بقول ماہرین علم الاعضاء اس میں قریباً پانچ ہزار مختلف اعضاء اور طرح طرح کی مفید ومنافع بخش رگیں اور نسیں ہیں جو خدا نے اپنے کرم سے ہمیں عنایت فرمائی ہیں نیز یہ کہ ان میں سے جو چیز یں معلوم ہوچکی ہیں۔ وہ ان کے مقابل بہت کم ہیں جو ابھی دریافت نہیں ہوئی ہیں بلکہ معلوم رگ وپے نامعلوم چیزوں کے سامنے سمندر

---

[۱] سورۂ انعام: ۱ سورۂ یونس۔ ۱۰ سورۂ صافات۔ ۱۸۲ سورہ زمر۔ ۷۵ سورۂ مومن۔ ۶۵۔

[۲] یہی وجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے سامنے خداوند تعالیٰ کو رب العالمین، کی صفت کے ساتھ یاد کیا تو اس نے پوچھا رب العالمین کون ہے؟ حضرت موسیٰ نے جواب دیا: رب السمٰوت والارض وما بینھما یعنی رب العالمین وہ ہے جو آسمانوں زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کا پروردگار ہے۔

میں سے ایک قطرہ کی مانند ہیں۔

پھر وہ خدائے تعالیٰ کی ربوبیت کے آثار اور جہان ہستی میں اس کی تدبیر وحکمت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: ان چیزوں پر توجہ دی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس دُنیا کی تمام چیزوں کو انسان کے اختیار میں دے رکھا ہے، لیکن وہ تا حال ان میں سے بہت کم چیزوں کی حقیقت تک پہنچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''الحمد اللہ'' کا جملہ ان تمام منکشف وغیر منکشف حقائق ومسائل کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔[1]

البتہ فخر رازی نے اپنے زمانے کے علوم کے لحاظ سے بات کی ہے۔ لیکن ہمارے زمانے تک مختلف علوم نے جو ترقی کی اور جو دریا فتیں ہو چکی ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اس نے جو اعداد و شمار دیئے ہیں وہ بہت کم بلکہ صفر کے برابر ہیں۔ کیونکہ صرف انسان کے بدن میں ایک کھرب سلول اور خلیے وجود رکھتے ہیں، جو انسان کی بقاء کے لیے مصروفِ کار اور پروردگار کی ربوبیت سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ خدا کی اس نعمت پر شکر ادا کرنا لازم ہے۔ اگر انسان اپنے بدن میں پائے جانے والے ان خلیوں کو شمار کرنا چاہے اور شب وروز اس کا م میں لگا رہے تو تین لاکھ سال درکار ہوں گے۔ پھر وہ خدا کے شکر کا حق کس طرح ادا کر سکتا ہے۔؟ یعنی انسان خدا کی نعمتوں پر جتنا بھی شکر ادا کرے وہ کم تر ہی ہوگا۔

(۳) دوسری آیت کہ جس میں رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے۔ اس میں فرماتا ہے (اے پیغمبرؐ! ان مشرکوں سے) کہو کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی پروردگار ڈھونڈوں جب کہ وہ ہر چیز کا پروردگار ہے۔(**وقل اغیر اللہ ابغی ربا وھو رب کل شیء**)۔

تم خود کو دنیا کے کلّی وعمومی نظام آفرینش سے کیونکر الگ رکھنا چاہتے ہو، جب کہ خدائے واحد تمام موجودات عالم کا پروردگار ہے پھر کیوں نہ ہم اسے اپنا ''رب'' سمجھیں؟ آیا یہ ممکن ہے کوئی دوسری چیز جو خود ہی اس کی ربوبیت کے تحت ہو ہم اسے خدا کے ساتھ شریک کریں اور جو مربوب ہے اسے رب مانیں، مخلوق کو خالق کے برابر لائیں اور بندے کو مولا کا ہمسر بنا دیں؟ یہ کیا فیصلہ ہے جو تم کرتے ہو؟

اگر لفظ ''شیء'' کے مفہوم کی وسعت پر توجہ کی جائے کہ جو تمام ''ماسوی اللہ'' (خدا کے سوا سب چیزوں) کو شامل ہے تو اس آیت میں توحیدِ ربوبیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں آیت ہذا سے پہلی دو آیتوں میں نبی کریمؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ مشرکین سے صاف کہہ دیں: میری نماز اور دیگر عبادات میری زندگی اور میری موت سب کچھ اس خدا کے لیے ہے جو سب اہل جہان کا پروردگار ہے۔(**قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین**)۔

میں غیر خدا کی پرستش کیوں کروں؟ سوائے خدا کے کسی آستان پر کیوں سجدہ کروں؟ اس کے غیر کی یاد کے لیے کیوں زندہ رہوں؟ اس کے غیر کے لیے کیوں اپنی جان دُوں؟ حالانکہ میرا خالق، مالک، مربی اور پالنے والا صرف وہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں توحید عبادت

---

[1] تفسیر فخری رازی جلد ۱ صفحہ ۶۔

اور توحید ربوبیت باہم جڑی ملی ہوئی ہیں اور ایک روحانی مرکب کا نمونہ پیش کر رہی ہیں [1]

(۳) تیسری آیت میں بھی پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہے اور نتیجہ کلام کے طور پر زمین وآسمان کے پروردگار کا ذکر ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ ''رب العالمین'' اور ''رب کل شيءٍ'' میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے اگر الفاظ مختلف ہیں، جیسا کہ فرمایا: (مشرکوں سے) کہو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ (قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)

چونکہ مشرکین یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ یہ بت یا انسانوں میں سے بنے ہوئے معبود اور ایسے ہی دیگر موجودات زمین وآسمان کی تدبیر کرنے والے، ان کو قائم رکھنے والے اور ان کا نظام برقرار رکھنے والے ہیں، لہٰذا بلا فاصلہ نبی اکرمؐ کو حکم دیا ہے کہ آپ خود ہی اس سوال کو جواب دیں، جیسا کہ فرمایا: کہو کہ اللہ (ہی زمین وآسمان کا پروردگار ہے) قُلِ اللّٰهُ۔

اب جو بھی اس کا غیر ہے۔ اس کو الوداع کہہ دو، اس کے سوا جو بھی ہے اس سے دل کو ہٹا لو اور صرف اسی کی ذات پاک پر تکیہ کرو، اپنا دل اس کے حوالے کر دو اور اپنی پیشانی اس کے آستان پر رکھو۔ تمہیں ان موجودات (بتوں) سے کیا سروکار کہ جو اپنے سود وزیاں کے بھی مالک نہیں پھر وہ دوسروں کے کیا کام آئی گے (لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا فرقان۔ ۳)

(۴) چوتھی آیت میں عرش کے بارے میں خدا کی ربوبیت کا ذکر ہے، لیکن اس کا آغاز اس کی ''حاکمیت'' کے بیان سے ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے۔ پس برتر ہے وہ خدا جو بادشاہ حق ہے (اس سے بالاتر ہے کہ تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہو (فتعالیٰ الله الملك الحق)۔

یہ جملہ تکمیل طور پر آیا ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلی آیت میں کہا ہے: اگر معاد وقیامت مقرر نہ ہو تو انسان کی خلقت وپیدائش بے معنی ہو جائے گی۔ کیونکہ دنیا کی یہ چند روزہ زندگی کوئی اتنا بڑا مقصد نہیں کہ آفرینش وپیدائش کا سبب قرار پائے (یہ معاد وقیامت کے بارے میں ایک اہم دلیل ہے، انشاء اللہ بحث قیامت میں اس پر مفصل گفتگو کی جائے گی)۔

پھر اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی عرش کریم پروردگار ہے (لا اله الا هو رب العرش الكريم)۔

''ملک'' حاکم اور مالک کے معنی میں ہے اور یہ وصف خداوند تعالیٰ کے علاوہ کسی اور پر صادق نہیں آتا، کیونکہ یہ خالقیت کی ایک شان اور اس کے لوازم میں سے ہے۔ چونکہ اس کے سوا کوئی خالق وجود نہیں رکھتا۔ لہٰذا کوئی مالک اور حاکم بھی نہیں ہے۔ اسی لیے بعد از اں اسے ''حق'' سے متصف کیا اور پھر معبود ہونے میں صرف اسی کا نام لیا ہے، کیونکہ عبادت صرف ملکِ حق ''حقیقی حاکم'' ہی کے لیے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے ''رب العرش الکریم'' کہہ کر اس بیان کی تکمیل اور تائید کی ہے۔ یہ چاروں اوصاف معاد وقیامت کے اثبات کے لیے ہیں

---

[1] ''نسک'' ایک مفرد لفظ ہے، بہت سے ماہرین لغت نے اسے ہر قسم کی عبادت کے معنوں میں شمار کیا ہے، جب کہ بعض مفسرین نے اس کو خاص طور پر قربانی کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن اس کے لیے کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد تمام عبادت ہیں، اس لیے اس کا ذکر صلوٰۃ (نماز) کے بعد آیا ہے جو خاص کے بعد عام ذکر کی مثل ہے۔

جواس سے پہلے کی آیات میں آئے ہیں۔

''عرش کریم'' کے الفاظ میں تمام جہانِ ہستی کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ عرش کے معنی بادشاہوں کا بلندتر تخت ہیں اور خداوند تعالیٰ کا تختِ حکومت تمام جہان آفرینش سے کنایہ ہے، اس صورت میں عرش کا مفہوم جملہ ''رب کل شیء'') سے ہم آہنگ ہے جو آیات ماقبل میں آیا ہے۔

''کریم'' کے معنی باشرف، بہترین اور زیادہ فائدہ مند ہوتے ہیں، عرش کی اس لفظ کے ساتھ توصیف اس لیے ہوئی ہے کہ پروردگار عالم کا تحت حکومت سب سے بڑھ کر ان معنوں کا مصداق ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے گمان کیا ہے۔ کہ وصف ''کریم'' کے معنی صاحب کریم ہیں، چونکہ یہ معنی عرش کے ساتھ صادق نہیں آتے، اس لیے یہ صفت خدائے پاک کی ہے نہ کہ عرش کی...... حالانکہ ''کریم'' غیر عاقل موجودات کی صفت بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً ''لهم مغفرةٌ ورزقٌ کریم'') یعنی مومنوں کے واسطے بخشش اور پرفائدہ وباشرف (کریم) روزی ہے۔(حج۔۵۰)[1]

(۵) پانچویں آیت انسانوں کے بارے میں ربوبیت خداوندی کو بیان کررہی ہے، اس میں پیغمبرِ ربانی حضرت الیاس کی زبانی ان کا اپنی قوم سے خطاب نقل ہوا ہے، آپ نے انہیں ایک مشہور بت ''بعل'' کی پرستش پر ملامت کرتے ہوئے فرمایا: خدائے تعالیٰ کہ جو احسن الخالقین ہے، تم لوگ کیوں اسے چھوڑ کر اس بت کے پیچھے لگ گئے ہو؟ پھر اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں۔ وہی خدا تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا پروردگار ہے (الله ربکم ورب آبائکم الاوّلین[2])

یہ اصل میں دُنیا کے تمام بُت پرستوں کے لیے ایک مسکت جواب ہے، کیونکہ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کیوں ان بتوں کی پرستش کرتے ہو تو وہ اپنے اعمال کی توجیہ کے طور پر کہتے ہیں: یہ ہمارے باپ دادا کی روش ہے اور ہم ان کی اس روش کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ حضرت الیاسؑ اپنے خطاب میں اس بات کو بنیاد بنارہے ہیں کہ عبادت و پرستش کے لائق وہ ہے جو عالم ہستی کا رب اس کو ایک نظام کے تحت قائم رکھنے اور واقعاً انسان کی پرورش کرنے والا ہے۔ وہی خدا تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا پرودگار ہے، اگر وہ اپنے معبود حقیقی اور اپنے پروردگار کی شناخت میں غلطی کر گئے تو اب تم کیوں اس غلط راہ پر چلے جارہے ہو۔

## خدا ہی مدبر امور ہے:

(۶) چھٹی اور آخری آیت میں ''رب'' کی بجائے ''تدبیر امر'' پر بات ہوئی ہے جو ''ربوبیت'' کے معنی کے قریب تر ہے نہ کہ کاملاً ہم معنی

[1] قرآن اور لغت کے اعتبار سے ''عرش'' کے معنی کے بارے میں تفصیلی مباحث سے آگاہی کے لیے تفسیر نمونہ فارسی جلد ۶ صفحہ ۲۰۴ ذیل آیت ۵۴ سورۂ اعراف...... نیز جلد ۸ صفحہ ۲۱۹ ذیل آیت ۳ سورۂ یونس کا مطالعہ کریں۔

[2] اس آیت میں ''اللہ'' منصوب یعنی زبر کے ساتھ ہے، اس لیے کہ یہ ''احسن الخالقین'' سے بدل ہے جو اس سے پہلے موجود ہے۔ بعض کا خیال ہے یہاں لفظ ''اللہ'' عطف بیان ہے۔

میں ہو۔اس آیت میں رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا: (مشرکوں سے) کہو کہ کون تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ (قل من یرزقکم من السماءِ والارض)۔

آفتاب کی رُوح پرور روشنی جو آسمان سے تم پر چمکتی ہے کہ تمہاری حیات وزندگی اس سے وابستہ ہے۔ بارانِ رحمت کی جاں بخش بوندیں جو آسمان (کی طرف) سے نازل ہوتی اور زندگی کا بیج جا بجا بکھیرتی ہیں اور ہوا جو ایک لطیف اور رُوح پرور چیز ہے۔اس نے تمہارے چاروں طرف کی فضاء کو پُر کر رکھا ہے بتاؤ یہ سب چیزیں کس نے تمہارے لیے مہیا کی ہیں؟

اسی طرح نباتات کہ جو زمین سے اُگتے ہیں، ان سے تم اناج اور لذیز میوے حاصل کرتے ہو بیش قیمت معدنی چیزیں جو تم زمین کی تہہ سے نکالتے ہو...... بتاؤ تو یہ چیزیں تمہیں کون عطا کرتا ہے؟ آیا یہ رزق وروزی بتوں کی طرف سے مل رہی ہے؟

اس کے بعد خود انسانی بدن کی طرف متوجہ ہو کر اعضاء بدن کے دو اہم حصوں کا ذکر کیا ہے کہ جن سے انسان اس دنیا کے ساتھ رابطہ پیدا کرتا ہے اور جو علم ودانش کے حصول کا وسیلہ ہیں ان کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتا ہے۔کون کان آنکھوں کا مالک (اور خالق) ہے؟ (امن یملك السمع و الابصار)۔

بعدہٗ عالم ہستی کے سب سے اہم معاملے یعنی مسئلہ موت وحیات پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کون زندہ کو مردہ میں سے اور مردہ کو زندہ میں سے نکالتا ہے؟ (ومن یخرج الحي من المیت و یخرج المیت من الحي)۔کیا یہ بتوں کی کارگزاریاں ہیں؟

آیت کے آخر میں اس کے بعد کہ تین اہم مسائل (رزق آسمانی وزمینی، کان آنکھ، اور موت وحیات) کا ذکر کیا جا چکا، سارے مضمون کو جامع طور پر بیان کرتے ہوئے فرمایا: کون امورِ عالم کی تدبیر کرتا ہے۔(وَ من یدبر الامر)۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اگر وہ (مشرکین) اپنی عقل اور وجدان کی طرف مراجعہ کریں تو ان کی طرف سے ان ساری باتوں کا کوئی اور جواب ہو ہی نہیں سکتا۔فوراً وہ (تمہارے جواب میں) کہیں گے......اللہ......(فسیقولون اللہ) یعنی تمام امورِ عالم کی تدبیر کرنے والا وہی اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔

پھر اپنے رسول سے فرمایا کہ اسی جواب کو بنیاد بنا کر اس گفتگو کو آگے بڑھاؤ: کہو کہ پھر کیوں تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے (فقل افلا تتقون) یعنی کیوں خدا سے نہیں ڈرتے اور راہ شرک پر چلتے ہو؟

درحقیقت اس آیت میں انسان کی تمام مادی ومعنوی روزیاں اور تمام تر تدبیر وعالمیان یکجا طور پر ذکر ہوئی ہیں مادی روزیاں زمین وآسمان سے اور معنوی روزیاں، یعنی علومِ حسی، عقلی ونقلی گوش وچشم کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں، تدبیر جہاں میں ان کے ساتھ دیگر بہت سے امور بھی شامل ہیں۔

اندریں صورت کون یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ یہ ناتواں کرسکتا ہے کہ یہ ناتواں بندے یا بتوں جیسی بے اصل چیز یہ رزق وروزی پیدا کرنے اور امورِ عالم کو چلانے کی اہل ہوسکتی ہے، پس توحید ربوبیت کوئی پیچیدہ نہیں حتیٰ کہ اگر مشرک لوگ چندے غور وفکر کریں تو یہ ان پر بھی واضح اور روشن ہوجائے گا۔

خدا کو کان آنکھوں کی ''مالکیت'' کا حامل قرار دینا اس کے ان کو پیدا کرنے اور وجود میں لانے کی طرف اشارہ ہے یا ان کی حفاظت اوران کے عجیب نظام کو قائم رکھنے یا ان سب امور کا خالق ومدبر ہونے کی وجہ سے ہے۔

آیات کے مذکورہ بالا مجموعے اوران کے مشابہ دیگر آیاتِ قرآن کو جن کی تعداد بہت زیادہ ہے ان سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قرآن اس تمام عالمِ ہستی ہر شے ہر موجود، زمین وآسمان، عرش، وکرسی اور موجود و گذشتہ انسانوں کا خالق و مالک اور مدیر و مدبر خداوندتعالیٰ ہی کو قرار دیتا ہے اور بڑی صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ اس کے سوا جہانِ ہستی میں کوئی اور ''رب'' اور پروردگار نہیں ہے۔

# توضیحات

## (۱) توحید یعنی درمیانی واسطوں کو حذف کرنا:

قرآن مجید کی آیات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ انسان براہ راست خدا کی طرف توجہ کریں اور درمیانی واسطوں میں گم ہوکر نہ رہ جائیں، اسی سے بات کریں، اسی سے تقاضا کریں اسی کے حضور سجدہ ریز ہوں اور اسی کی بارگاہ میں شکرِ نعمت بجالائیں، تمام مشکلات کا حل اسی سے طلب کریں، اسی کے ساتھ عشق ومحبت رکھیں بس اسی کیساتھ دل لگائیں اور اس کے غیر کی پرستش ہرگز نہ کریں۔

سورۂ حمد اور دیگر سورہ ہائے قرآن میں ''رب'' العالمین'' کی تعبیر اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور رکوع وسجود میں......سبحان ربی العظیم......اور......سبحان ربی الاعلیٰ......کا کئی کئی بار دوہرایا جانا بھی اسی بات کی تاکید کے لیے ہے۔ ہاں تو نہ صرف ہماری خلقت و پیدائش بلکہ ہماری بقاء ہماری خلقت و پیدائش بلکہ ہماری بقاء ہماری تربیت ہمارا تکامل اور ہمارے تمام امور کی تدبیر بھی خداوندتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

اس بات کی واضح دلیل موجود ہے، کیونکہ ''خالق'' اور ''رب'' اپنی مخلوق سے جدا نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر لحظہ ایک نئی خلقت اور ایک نئی پیدائش حاصل کرتا ہے جو اسی پروردگار کی طرف سے عطا ہوتی ہے، مختصر یہ کہ تمام موجودات اس کی محتاج دنیاو نیازمند ہیں اور وہ ہر جہت سے بے نیاز ہے، وہ ''صمد'' یعنی ایسا عظیم آقا و مالک ہے کہ ہر حاجت منداسی کی بارگاہ میں پہنچتا ہے۔

تاریخ مذاہب سے پتہ چلتا ہے کہ عالمِ بشریت اپنے اور اپنے رب کے مابین خودساختہ واسطوں اور وسیلوں میں گم ہوکر کیسے کیسے نامعقول اور بے ہودہ افکار وافعال میں گرفتار ہوا ہے، اس نے اپنے مقابلے میں پست تر موجودات یعنی بتوں اور مورتیوں کو اپنا معبود قرار دیا اوران کو زندگی اور اپنے سود وزیاں کا مالک سمجھتا رہا۔ پھر خداؤں اور معبودوں کی اس کثرت نے انسانی معاشروں کو تفرقہ ونااتفاقی، بدبختی وبدحالی اور دنائت وپستی کے سوا کیا کوئی اور تحفہ دیا ہے؟ لیکن جب یہ واسطے درمیان سے ہٹا دیئے گئے اور ہم نے اسی ذات کو رب مطلق مان لیا تو جیسا کہ دلائل عقلیہ کا تقاضا ہے ہم نے ہر چیز کو اسی کا نیازمند پایا، اسی طرح ہم نورِ عظمت، وحدت اور یگانگت کے سرچشمے تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں خدا کی صفت ''رب'' کا نوسو سے زیادہ مرتبہ ذکر آیا ہے اور اوصافِ الٰہی میں سے کسی وصف کی اس

قدر تاکید نہیں ہوئی اس لئے اسلام کے نظریہ توحید خالص کو سب سے پہلے اسی توحیدر بوبیت میں دیکھا جانا چاہیے۔

## (۲) تاریخ مذاہب اور بے اصل واسطے:

تاریخ مذاہب کا جتنا زیادہ مطالعہ کیا جائے اسی قدر یہ بات کچھ اور واضح ہوتی ہے کہ مختلف قوموں میں (رب و پروردگار کے معنی میں) چند خداؤں کا عقیدہ قدیم ترین زمانے سے موجود رہا ہے۔ اگر ان کے خداؤں کے نام اور ان کے بارے میں ان لوگوں کے عقائد کا ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے گی جو عجیب وغریب اور بے ہودہ نظریات سے پر ہوگی تاہم اس میں کوئی ہرج نہیں کہ ہم یہاں اس موضوع کو بطور خلاصہ بیان کردیں تاکہ قارئین اس اختصار سے اس کی تفصیلات کے بارے میں ایک تصور قائم کرسکیں۔

## (ا)۔ رومیوں کے خدا:

ایک معروف مغربی مورخ اس سلسلے میں رقمطراز ہے: رومیوں کا مذہب ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں......ان کے مذہب نے اپنے ماننے والوں کو کوئی حکم نہیں دیا تھا، اس میں لوگوں کی اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کے لیے کچھ بھی اہتمام نہ تھا اور وہ انہیں صرف اپنے خداؤں کو خوش کرنے کے رسوم سے آگاہ کرتا تھا۔

رومیوں کے خداؤں کی ایک بڑی تعداد وغیر معمولی قوتوں کی حامل تھی، کیونکہ ان میں سے ہر ایک زندگی کے کسی خاص گوشے سے تعلق رکھتا اور کوئی مقررہ کام انجام دیتا تھا۔ نہ صرف گھر کی دہلیز کا ایک خدا ہوتا تھا بلکہ جوتے اُتارنے کی جگہ اور ڈیوڑھی کے لیے بھی الگ الگ خدا ہوتے تھے علاوہ ازیں ہر فرد کا محافظ ایک ایک خدا ہوتا اور پھر ذیلی خدا ہوتے، مثلاً ایک خدا نوملود کو پہلی آواز نکالنے کا ڈھنگ سکھاتا، دوسرا کھانے پینے کا طریقہ بتاتا، ایک اور خدا گھر سے نکلنے کی ترکیب سمجھاتا اور ایک خدا گھر واپس آنے کی تعلیم دیتا تھا۔ ایک مخصوص خدا ہل چلانے میں، ایک خدا کیاریاں بنانے میں اور ایک تیسرا خدا بیج بونے میں مدد کرتا اسی طرح کچھ اور خدا بھی تھے جو مختلف کاموں میں برکت دیا کرتے۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ رومیوں کے ایک ہزار خدا ہوں۔ جیسا کہ ان کے روساء میں سے ایک نے مذاق کے طور پر کہا تھا کہ ہمارے ملک کے مندروں اور گھروں میں خداؤں کی تعداد ہماری قوم کے افراد سے کہیں زیادہ ہے [1]

## (۲) یونانیوں کے خدا:

وہی معروف مورخ لکھتا ہے: دوسری بہت سی قوموں کی طرح یونانیوں نے بھی سُورج، آسمانی بجلی، سمندر، آندھی، دریا، چشمہ، ہوا اور بارش جیسی تمام طبعی چیزوں کو مقام الوہیت پر فائز کرتے اور ان کو پوجتے تھے ہر باطنی اثر و تاثیر کو ایک ان دیکھی شخصیت سے نسبت دیتے اور انہیں خیر وشر کے مالک تصوّر کرتے تھے وہ ان کی پرستش کرتے تاکہ وہ ان پر مہربانی کریں یا اپنے ضرر کو ان سے دُور رکھیں:۔

---

[1] تاریخ آلبر مالہ۔ تاریخ روم جلد ۱ صفحہ ۲۹۔۳۰۔

پھروہ ''کرونوس'' کے بیٹے ''زوس'' کا ذکر کرتا ہے جو یونانیوں کا بڑا خدا تھا وہ اسے ایک ایسا آدمی تصور کرتے جو قوی ہیکل، بارعب، کشادہ پیشانی، لمبی زلفوں اور گھنی گھنگھریالی داڑھی والا ہے۔ زوس یونان میں رب الارباب اور خدائے شر سمجھا جاتا ہے اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے خداؤں کے بت رکھے ہوتے اس کی بیوی ''ہرا'' جس کا مسکن آسمان میں تھا، اس کے تین بیٹے، ہرمس، آرتمیس، آپولون، مانے جاتے اور یہ تینوں ترتیب وار بارش، چاند، سورج کے مالک تصور کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ یہ لوگ اور بھی بہت سے خداؤں کے قائل تھے۔ مثلاً دریاؤں کے خدا، زمین کے خدا، تہہ زمین کے خدا اور پھر ہر کام کے لیے الگ الگ خدا ہونے کے معتقد تھے [1]

## (۳) مصریوں کے خدا:

قدیم مصریوں میں سے اکثر لوگ کئی خداؤں (ملی تہہ السیم) کے معتقد اور ان میں سے ایک کو دوسروں سے برتر اور خدائے خدایان کے طور پر مانتے تھے۔ مصر کے ہر حصے میں لوگ اپنا خدا اور اپنا معبد (مندر) بنائے ہوئے تھے اور مجموعی طور پر ان کے خداؤں کی تعداد دو ہزار سے بھی کچھ زیادہ ہوا کرتی تھی۔ لیکن ان میں نو خداؤں کا بہت چرچا تھا اور وہ یہ ہیں: سورج کا خدا، فضاء کا خدا زمین کا خدا صحرا کا خدا، پہاڑوں کا خدا، سمندروں کا خدا، آباد زمین کا خدا، صحرا کا خدا، پہاڑوں کا خدا، سمندروں کا خدا، آباد زمین کا خدا اور بنجر زمین کا خد [2] ایک اور مورخ ''ویل ڈوارنٹ'' اپنی کتاب ''تاریخ تمدن'' میں کہتا ہے۔ دنیا کے کسی خطے میں اتنے زیادہ خدا نہیں پائے گئے جتنے مصر میں تھے۔ اہل مصر کہا کرتے کہ خلقت وآفرینش کا آغاز آسمان سے ہوا اور آسمان میں دریائے نیل سب سے بڑا رب النوع شمار ہوتا ہے۔ مصریوں کے اعتقاد میں ستارے صرف ایک جسم ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ خداؤں کے ارواح کی مادی صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ستاروں، حیوانوں اور درختوں کی شکلوں پر بنائے ہوئے بتوں کی صورت میں بہت زیادہ خدا تھے، یہاں تک کہ ان کی عبادت گاہیں اچھے خاصے نمائش گھروں کا نقشہ پیش کرتی تھیں [3]

## (۴) ایرانیوں کے خدا:

قدیم ایرانی بھی پہلے ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش اور پھر کئی خداؤں کی پوجا میں لگے رہے، تاہم کہیں کہیں، امشا سپندان، یعنی چھ خداؤں کی پرستش بھی ہوتی تھی۔ یعنی پالتو حیوانوں کا خدا، آگ کا خدا، دھاتوں کا خدا، زمین کا خدا، دریاؤں اور درختوں کا خدا، ستاروں اور سیاروں کا خدا [4]

---

[1] تاریخ ''آلبر ماله'' تاریخ ملل شرجلد ۲ صفحہ ۷۱ تا ۷۹ (خلاصہ)

[2] اسلام وعقائد وآراء بشری صفحہ ۴۶۔

[3] ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن جلد ۱ صفحہ ۲۹۸، ۳۰۰ (خلاصہ)

[4] اسلام وعقائد وآراء بشری صفحہ ۳۴۔

## (۵) چینیوں کے خدا:

چین کے قدیم باشندے معتقد تھے کہ دنیا میں دو اصلیں حکومت کر رہی ہیں، پہلی اصل ''نز'' یا ''مثبت'' یا ''نور'' اور دوسری اصل ''مادہ'' یا ''منفی'' یا ''ظلمت'' ہے۔ اپنے اسی فکر و خیال کے نتیجے وہ ثنویت، دوگانہ پرستی اور دو خداؤں کی پرستش کرنے لگے۔

''شانگتی'' اصل نرینہ و مذکر شمار کیا جاتا اور اسے خدائے آسمان تصوّر کیا جاتا تھا، ان کا خیال تھا، کہ یہی اس دنیا میں انسان کو نیک و بد اعمال کی جزو اسزا دیتا ہے۔ اور جب گناہ عام ہو جائے تو لوگوں پر سخت مصیبت نازل کرتا ہے۔

وہ ''ہاتن'' کو اصل مادہ و مونث قرار دیتے اور اس کی تعریف و توصیف کرتے تھے، پھر آہستہ آہستہ کچھ دوسرے خدا بھی بنا لیے گئے اور وہ لوگ بہت سے خداؤں کی پرستش کرنے لگے، مثلاً پیداوار کا خدا، بارش کا خدا، ہوا کا خدا، برف کا خدا، آگ کا خدا، اور پہاڑوں کا خدا وغیرہ [۱]

## (۶) عرب کے بُت پرست:

بعض مورخین اور مفسرین کا خیال ہے کہ عرب کے لوگ خدائے واحد ہی کو جہانِ ہستی کا خالق و رزاق اور رب و مدبر سمجھتے تھے، اس کے ثبوت میں وہ ایسی آیات قرآن پیش کرتے ہیں، جن میں ان لوگوں کی زبانی خدا کی خالقیت و رازقیت پر اعتقاد رکھنے کے اعتراف کا ذکر ہے۔ اس لیے ان کی بت پرستی کا موجب کئی خداؤں کا ماننا نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان سے حصولِ شفاعت اور تقرب خدا کی امید رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کا اعتقاد تھا کہ ہر بت کے ساتھ بہ حکم خدا ایک شیطان کو موکل بنایا جاتا ہے، اگر کوئی شخص کسی بُت کی قرار واقعی عبادت بجالاتا ہے تو وہی شیطان خدا کے حکم سے اس کی حاجتیں پوری کرتا ہے [۲]

لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عربوں کا ایک گروہ ستارہ پرستی کی طرف مائل تھا، ان کا نظریہ تھا کہ کچھ ستارے طلوع وغروب کے وقت بارش برساتے ہیں۔ وہ ان ستاروں کو 'انواء'' سے تعبیر کرتے تھے (انواء جمع ہے، ''نوء'' کی' اور اس سے مراد وہ ستارہ ہے جو ڈوبتا جا رہا ہو) وہ اپنی حرکت وسکون اور سفر و قیام کو ان ستاروں کے ساتھ مربوط رکھتے تھے (کیونکہ انہیں قسمت اور نصیب میں موثر خیال کرتے تھے) لہٰذا انہوں نے سورج، چاند اور زہرہ وغیرہ کی پرستش کے لیے بڑے بڑے عبادت خانے بنا رکھے تھے [۳]

جزیرہ نماعرب کے جنوب میں یمن کا علاقہ ہے اور وہاں آباد عرب قبائل میں بھی ستارہ پرستی کا روج تھا۔ ان میں ایک گروہ ''آفتاب پرست'' تھا کہ جس کی طرف قرآن نے ملکہ سبا کی داستان میں واضح اشارہ کیا ہے، بعض قبائل ''مہتاب پرستی'' اختیار کیے ہوئے تھے بعض ستارہ

---

[۱] اسلام وعقائد و آراء بشری صفحہ، ۱۵۷۔

[۲] بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۱۵۷۔

[۳] بلوغ الارب صفحہ ۲۲۳۔

شعریٰ کے پرستار اور اسی طرح دیگر قبائل بعض دوسرے ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔[۱]

## (۷) مختلف ممالک کے خدا:

دنیا کے دیگر ملکوں جیسے ہندوستان وجاپان وغیرہ میں بھی لوگ اربابِ انواع اور بہت سے خداؤں پر اعتقاد رکھتے تھے۔'' صائبین'' (ستارہ پرست) سات سیاروں کو ہفت اقلیم کے نگہبان سمجھتے تھے نیز وہ انہیں اہل زمین کے لیے سرچشمہ خیر اوران کی مصیبتوں کو رفع کرنے والے خداؤں کا درجہ دیتے تھے۔

''توتم'' کا نظریہ جو اس وقت دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلا ہوا تھا، وہ ابھی ارباب انواع کے عقیدے کے ساتھ ملتا جلتا ہی تھا۔ کیونکہ ہر قبیلے کا ایک ''توتم'' ہوا کرتا کہ جو اس قبیلے کے باپ اور رُوح کی منزلت کا حامل ہوتا تھا، وہ لوگ اسے حیوانات کی شکل میں ان جیسا تصور کرتے تھے۔

## (۸) مثل افلاطونی پر اعتقاد:

افلاطون نے عالمِ طبیعت کی ہر انواع کے لیے ایک ایک مجرد عقلی فرد قرار دیا اور وہ لوگ اسے قائم بالذات سمجھتے تھے چونکہ وہ ان مجرد وافراد کو اسماء وصفاتِ الٰہی کے مظاہر وامثال خیال کرتے تھے۔ اس لیے انہیں ''مثال'' کے نام سے موسوم کرنے لگے اور مثال کی جمع مثل بروزن رُسل ہے۔

افلاطون کا نظریہ تھا کہ جو چیز کوئی حقیقت رکھتی ہے وہ وہی مثال ہے کہ جو مطلق، غیر مبدّل، زمان ومکان سے بلند اور کلی وابدی وجود ہے۔ یہ مادی وجسمانی افراد وجسمانی افراد جو نظر آتے ہیں۔ متعدد تغیر پذیر، یا پابند زمان ومکان اور فانی ہیں، یہ فقط اس مثال کے پرتو کی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا یہ جسمانی افراد انسان اس مثالی انسان سے وہی نسبت رکھتے ہیں جو کسی سائے اور اصل وجود میں ہوتی ہے، گویا افلاطون کے نزدیک یہ عالم ظاہر وعالم محسوسات ''مجاز'' ہے اور حقیقت وہی عالمِ معقولات ہے[۲]

مثل افلاطون پر اعتقاد اگرچہ ارباب انواع کے عقیدے سے مختلف ہے، لیکن بعض جہات سے اس کے مشابہ ہے اور یہ ارباب انواع کے یونانی عقیدے کا مدہم سا فلسفی نقش ہے، اسی طرح، عقول مجرد فلکیہ کا نظریہ بھی ارباب انواع کے عقیدے سے ایک طرح کی قربت رکھتا ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ بعض فلاسفہ کے بقول چونکہ خدائے تعالیٰ ہر جہت سے بسیط ہے۔ لہٰذا اس کی مخلوق بھی ایک ہی ہوگی اور وہ مخلوق مجرد ہے کہ اسے ''عقل اوّل'' کا نام دیتے ہیں۔ پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ ''عقل اوّل'' جب ایک وجود اور ماہیت ہے اور دو

---

[۱] اسلام اور جاہلیت صفحہ ۲۹۵

[۲] دیکھیے کلیات فلسفہ اسلامی، سیر حکمت در اروپا اور ایسی ہی دیگر کتب۔

جنبے رکھتی ہے، الہٰذا اس سے ''عقل دوم'' او'' فلک اوّل پیدا ہوا اور اسی ترتیب سے وہ دس عقول اور نو آسمانوں کی پیدائش کے قائل ہیں۔
ان میں سے کچھ فلاسفہ بہ لحاظِ تعداد عقول کو بے شمار قرار دیتے ہیں اور ''عقول طولی (دس عقول جن میں سے ہر ایک دوسرے کی مخلوق ہے) کے علاوہ ''عقولِ عرضی'' کے معتقد بھی ہیں، وہ انہیں ''صور نوعیہ'' کے فیض کا واسطہ اور موجوداتِ جسمی کا مرتبہ اعلیٰ تصور کرتے ہیں، جیسے ارباب انواع اور مثل افلاطونی ہیں۔ البتہ اِن مسائل میں سے ہر ایک کے بارے میں بہت سے مباحث ہیں، چونکہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس لیے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اس بیان میں جو چیز ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ قرآن مجید نے ان تمام افکار کا مقابلہ کیا ہے، چنانچہ اس نے ان سبھی شرک آلود افکار اور مختلف مشرکانہ فلسفی مکاتب میں گزرتے ہوئے جس وضاحت اور خوبی کے ساتھ عالمِ ہستی میں توحید خالقیت و توحید ربوبیت (یعنی خالق و رب واحد) کے وجود کو ثابت کیا اور توحید خالص کو اجاگر کیا ہے اسے قرآن کے معجزات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

قرآن نے ان فرضی خداؤں اور خیالی ارباب انواع کے وجود بے سود پر خط تنسیخ اور فقط ''رب العالمین'' کو ''اللہ'' قرار دیا یہاں تک کہ ہر چیز اور ہر شخص کو مخلوق اور اس کی تدبیر و تربیت کے تحت شمار کیا، انسانوں کے دلوں اور جانوں کو نور وحدت سے روشنی بخشی اور ان کی توجہ ہر طرف سے ہٹا کر اس خدائے واحد لایزل کی ذات پر مرکوز کر دی۔

ہاں ان حالات سے یہ بات بخوبی واضح ہو رہی ہے کہ توحید خالص کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ انسان اپنے پاؤں چل کر اس تک جا پہنچے، بلکہ ضروری ہے کہ طریق وحی سے ایک غیبی ہاتھ اس کی طرف بڑھے اور اسے سنبھالا دے کر منزلِ توحید پہنچا دے۔ یعنی وہ ذاتِ مقدس جو وصف یکتائی کی حامل ہے۔ اس کے پیغمبر آئیں اور انسان کا ہاتھ پکڑ کر خضر راہ کی صُورت میں اس کو شرک کی تاریک وادی سے نکال کر توحید خالص کے آبِ حیات تک لے جائیں اور اسے سیراب کر دیں۔

## (۳) تفویض بھی شرک ہے:

اگر چہ تفویض کے کئی معنی ہیں اور بعض نے اس کے سات اقسام شمار کیے ہیں۔ نیز ان میں سے ہر ایک کے بارے میں بڑے بڑے مباحث موجود ہیں۔ لیکن یہاں جس نوع تفویض کا ذِکر لازم ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تفویض گروہ پیدا ہوا جن کا اعتقاد ہے کہ خدا نے پیغمبر اکرمؐ و ائمہ معصومینؑ کو پیدا کیا اور پھر خلق و رزق اور موت و حیات کا کام انہی کے سپرد کر دیا ہے۔

اس عقیدے کے متعلق بہترین تبصرہ وہی ہے جو علامہ مجلسیؒ نے ''مرآۃ العقول'' میں کیا اور فرمایا ہے۔ کہ ان قائلین تفویض کا یہ قول دو معنوں کا حامل ہو سکتا ہے۔

(ا) معصومین اس دنیا میں خلق و رزق اور موت و حیات کے اُمور اپنی قوت اور اپنے ارادے سے انجام دیتے ہیں اور وہ ان کے فاعلِ حقیقی ہیں، یہ صراحتاً کفر ہے اور دلائل عقلی و نقلی اس عقیدے کا بطلان کرتے ہیں، نیز اس عقیدے کے حامل لوگوں کے کفر میں کسی بھی عاقل کو ذرہ بھر شک نہیں ہے۔

(۲) معصومینؑ کے قصد وارادہ کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی ان کاموں کو انجام دیتا ہے، جیسے شق القمر، مردہ کو زندہ کرنا اور انبیاء سابقین کے معجزات رونما ہوتے رہے ہیں، اگر تفویض سے ان کی مراد یہی ہو تو خلافِ عقل نہیں۔ مگر ہم نے بحارالانوار میں ایسی بہت سی روایات کا ذکر کیا ہے۔ جو معجزات کے علاوہ معصومینؑ سے ان اُمور کے صدور کی نفی کرتی ہیں [1]

بہرحال دوسرا احتمال عقلاً محال نہیں ہے، لیکن روایات اس کی تائید نہیں کرتیں، ایسے بہت سے امور ہیں جو عقلاً محال نہیں مگر شرعاً ان کی نفی کی گئی ہے، جیسے انبیاء وائمہ علیہم السلام کی تعداد...... یعنی عقلی طور پر ممکن تھا کہ ان کی تعداد اس سے زیادہ ہوتی، تاہم نقلی دلائل نے اسے اس تعداد میں منحصر کر دیا ہے، جس کا ہمیں علم ہے۔

اس سلسلے میں ایک تیسرا احتمال بھی وجود رکھتا ہے وہ یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی پیغمبر یا امام کو یہ قوت عطا کر دیتا ہے کہ وہ اذنِ الٰہی سے کسی مُردہ کو زندہ کرے یا کسی لاعلاج مریض کو شفا دے دے، بلکہ حضرت عیسیٰؑ سے متعلق آیاتِ قرآن کے ظاہری معنی یہی ہیں اور یہ امر دیگر معصومینؑ کے بارے میں بھی ممکن ہے۔ لیکن جیسا کہ عبارتِ بالا میں ذکر ہوا۔ یہ بات صرف معجزات وکرامات تک محدود ہے نہ کہ خلقت آسمان وزمین اور امورِ کائنات کی تدبیر تک وسعت رکھتی ہو۔ کیونکہ قرآن بڑی صراحت کے ساتھ ساری کائنات کی خلقت، تدبیر وربوبیت کو خاص خدائے تعالیٰ ہی کے لیے قرار دیتا ہے۔ (اس فصل میں توحید ربوبیت سے متعلق پیش کی گئی آیات اس امر کی نشاندہی ہیں)

البتہ اس لحاظ سے کہ خلقت وآفرینش کا اصلی ہدف "انسان کامل" ہے اور معصومینؑ سبھی کامل انسانوں سے بلند وبالا ہیں، اس لیے کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عالمِ ہستی کو انہی کی خاطر وجود میں لایا گیا ہے اور بہ الفاظ دیگر عالمِ ہستی کی علت غائی وہی ہیں۔

## (۴) ایک سوال کا جواب:

## کیا فرشتے مدبر امر ہیں؟

سورۂ نازعات (آیت ۵) میں مدبرات امر کی قسم کھائی گئی ہے، جیسا کہ فرمایا: فالمدبرات امراً۔ اس میں مفسرین کا مشہور قول ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو امورِ دنیا کی تدبیر کرتے ہیں آیا یہ مسئلہ توحید ربوبیت کے منافی نہیں ہے؟

اس سوال کا جواب بڑا واضح ہے کہ اگر یہ فرشتے اپنے فرشتے اپنے فعل اور تاثیر میں مستقل ہیں تو یہ چیز عقیدۂ توحید کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی، لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ محض فرمان الٰہی کو عمل میں لاتے ہیں اور خدا کی مشیت وارادہ کے تحت ان اُمور کے ذمہ دار ہیں، جیسے عالم طبیعت میں اسباب ہیں کہ فرمانِ خداوندی کی بناء پر ایک اثر رکھتے ہیں۔

یہ نکتہ بہت سے مفسرین کے زیرنگاہ رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے خداوندتعالیٰ کے "رب العالمین" اور رب کل شئی ہونے اور جہانِ کائنات میں عالمِ اسباب کی تاثیرات اور فرشتوں کی طرف سے بحکم خدا امورِ عالم کی تدبیر کرنے کے درمیان کوئی تناقص محسوس نہیں کیا، یہاں وہی

---

[1] مرآۃ العقول جلد ۳ صفحہ ۱۴۳ (خلاصہ)

صورت ہے، جیسا کہ خدائے تعالیٰ قرآن میں خود کو تمام موجودات جہاں کا رازق وروزی وہندہ شمار کرتا ہے: وما من دابةٍ فی الارض الاعلیٰ اللہ رزقھا۔ (ھود ٦)

لیکن ایک اور مقام پر فرماتا ہے: وعلیٰ المولودلہٗ رزقھن و کسوتھن بالمعروفِ (بقرہ۔ ٢٣٣) یعنی ہر شیر خوار بچے کے باپ پر لازم ہے کہ اس کی ماں کو (دودھ پلانے کی مدت میں) عمدہ خوراک و پوشاک مہیا کرے (اگر چہ طلاق لے چکی ہو)۔

یہ مسلمہ بات ہے کہ شیر خوار بچے کے باپ کو "روزی دینے والا کہنے" اور خداوند تعالیٰ کو روزی دینے والا، کہنے میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ کیونکہ ان میں سے ایک ظاہری، عارضی اور اپنے خالق سے وابستہ ہے دوسرا مستقل اور بالذات روزی رساں ہے۔

نیز یہ کہ اگر ہم کہتے ہیں کہ شہد میں شفا ہے "فیہ شفآءٌ للناس" (نحل۔ ٢٩) یہ اس بات کے منافی نہیں کی شفا دینے والا صرف خدا ہے، جیسے عقیدہ توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بقول قرآن میں آیا ہے: واذا مرضت فھو یشفین (شعرائ۔ ٨٠) یعنی جب میں بیمار ہوجاتا ہوں تو خدا مجھے شفا دیتا ہے۔

یہ سب آیاتِ علت ومعلول کے سلسلے کو بیان کررہی ہیں۔ یعنی معاملہ ایک علت غیر مستقل سے شروع ہوکر علت العلل تک پہنچتا ہے جو مسبب الاسباب خدا ہے کہ ہر سبب اپنی تاثیر اور اپنے نتیجے میں اس کا محتاج ہے۔

## (۵) احادیث اسلامی اور توحید ربوبیت:

توحیدِ ربوبیت کا ذکر معصومینؑ کی کی حدیثوں اور دعاؤں میں بھی پوری تابانی کے ساتھ موجود ہے، وہ بہت سی دعائیں جو اصولِ کافی کی جلد دوم میں منقول ہیں، ان میں درج ذیل عبارات میں اس مسئلے کی طرف واضح اشارات دیکھے جاسکتے ہیں۔

اللھم رب السمٰوٰت اسبع ورب الارضین السبع...رب العرشِ العظیم ...رب المشعرالحرامِ ورب البلد الحرامِ ورب الحل والحرام...الحمد اللہ رب الصباح...رب الملائکةِ والروح...رب المستضعفین...رب جبرآئیل ومیکآئیل واسرافیل ورب القرآنِ العظیم ورب محمدٍ خاتم النبین۔[١]

ان عبارات میں سے بعض روایات اہل سنت میں بھی آئی ہیں[٢]

---

[١] اصول کافی جلد ٢ صفحہ ٥١٤ تا ٥٨٥۔

[٢] مزید وضاحت کے لیے "المعجم المفہرس الالفاظ الحدیث النبوی ٣ صفحہ ٢٠٧ کی طرف رجوع کریں۔

اس طرح آسمان وزمین، انبیاء وملائکہ امراء وغرباء صبح وشام، مکہ وکعبہ اورعرشِ عظیم کا رب خدائے قادرو یکتا کے سوا کوئی اورنہیں ہے۔
اصولی طور پر امورِجہان کی ہم آہنگی اوراس میں کارفرما نظاموں کا باہم مربوط ہونا ہی اس کے منتظم کی وحدت ویکتائی کی ایک روشن دلیل ہے چنانچہ امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب ایک زندیق نے واحدنیت پروردگار کے بارے میں آپ سے سوال کیا تو فرمایا۔

فلما راينا الخلق منتظماً ،والفلك جارياً ، واختلافِ اليل والنهارِ وَ لشمس والقمر، دل صحة الامر والتدبير وائتلافِ الامرِ علیٰ ان المدبرواحدٌ۔

یعنی جب ہم مخلوقات کومنظم حالت میں دیکھ رہے ہیں۔افلاک کی حرکت، دن رات کی آمدورفت، سورج اور چاند کا ایک نظام کے تحت طلوع وغروب فرمان وتدبیر کی یہ درستی اور تمام امور کا ایک دوسرے سے یہ ارتباط اس بات کی دلیل ہے کہ اس ساری کائنات کے نظام کو چلانے والا مدبر و پروردگار ایک اورصرف ایک ہے [1]

[1] توحید صدوق باب ۳٦ باب الرد علی التنویہ والزنادقہ صفحہ ۲۴۴۔

# (۳) توحیدِ مالکیت وحاکمیت تکونی

## اشارہ:

''توحید افعالی'' کی اہم ترین شاخوں میں سے ایک شاخ ''توحید مالکیت'' ہے یعنی بہ لحاظ تکوین و بہ لحاظ تشریع مالکِ حقیقی خدا ہی کی ذات پاک ہے اور دیگر تمام مالکیتیں غیر مستقل اور عارضی (مجازی) ہوتی ہیں، اس کی توضیح یہ ہے کہ مالکیت کی دو اقسام ہیں...... مالکیت حقیقی (تکوینی) اور مالکیت حقوقی (تشریعی)

مالکِ حقیقی وہ ہے جو کسی چیز پر تکوینی وخارجی تسلط رکھتا ہو، لیکن مالکیت حقوقی وتشریعی وہ قرارداد ہے جس سے کسی چیز پر قانونی حکم کا اجراء کیا جاتا ہے، جیسا کہ انسان کی مالکیت اپنے اموال پر ہے۔ ہر دو قسم کی مالکیت ایک موحد کی نظر سے پہلے درجہ میں خدا کے لیے خاص ہے کہ وہ دنیا کی تمام چیزوں کے وجود پر مالکیت کا اختیار رکھتا ہے، کیونکہ سب موجودات اسی کی مخلوق اور اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ وہ وجود کا فیض لحظہ بہ لحظہ اسی سے حاصل کرتی اور اس کی محتاج اور نیاز مند ہیں، اس ترتیب سے اس کی مالکیت حقیقی ہر چیز پر ہر جہت سے ثابت ہوتی ہے۔

مالکیت تشریعی وحقوقی یعنی قانونی مالکیت کے اعتبار سے بھی ہر چیز اسی کی مالکیت ہے، کیونکہ تمام اشیاء عالم کا خالق، پیدا کرنے والا اور انہیں وجود میں لانے والا وہی ہے۔ حتیٰ کہ جن چیزوں کو ہم وجود میں لاتے ہیں ان کے لیے مواد اور دیگر وسائل بھی اسی کے عطا کردہ ہیں، بناء بریں سب چیزوں کا مالک اصلی خدا ہے۔ اگرچہ کچھ مدت کے لیے اس نے یہ اشیاء امانت ہمارے سپرد کر رکھی ہیں۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف رُجوع کرتے اور آیاتِ ذیل پر نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۲۶ ﴿آل عمران: ۲۶﴾

(۲) اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۱۰۷ ﴿البقرۃ: ۱۰۷﴾

(۳) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۶ ﴿الزمر: ۶﴾

(۴) وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۲۴۷ ﴿البقرۃ: ۲۴۷﴾

(۵) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ

قِطۡمِيۡرٍؕ ۱۳﴿فاطر: ۱۳﴾

(٦) قُلِ ادۡعُوا الَّذِيۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ۚ لَا يَمۡلِكُوۡنَ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا لَهُمۡ فِيۡهِمَا مِنۡ شِرۡكٍ وَّمَا لَهٗ مِنۡهُمۡ مِّنۡ ظَهِيۡرٍ ۲۲﴿سبا: ۲۲﴾ [1]

## ترجمہ:

(۱) (اے پیغمبرؐ) کہو کہ اے اللہ تو حکومتوں کا مالک ہے، تو ہی جسے چاہتا ہے حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے، تمام خوبیاں تیرے دستِ قدرت میں ہیں، کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲) آیا تمہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کا مالک خدا ہے؟ (وہ حق رکھتا ہے کہ اپنے مصالح کے مطابق احکام میں تبدیلی کر دے)، خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست و مددگار نہیں ہے۔ (وہی تمہاری مصلحت کو جانتا اور اس کا تعین کرتا ہے)۔

(۳) وہی خدا تمہارا پروردگار ہے (عالمِ ہستی کی) حکومت اسی کے لیے ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر کیوں تم راہِ حق سے منحرف ہو رہے ہو۔

(۴) خدا اپنا ملک جسے چاہے بخش دیتا ہے، خدا (احسان کرنے میں) وسعت رکھتا ہے اور وہ (افراد کی لیاقت برائے منصب سے) آگاہی رکھنے والا ہے۔

(۵) وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے (سارے جہان کی) حکومت اسی کے لیے ہے اور اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے مالک بھی نہیں ہیں۔

(٦) (اے پیغمبر!) کہو کہ جن کو بزعم خویش تم خدا کے سوا پکارتے ہو (وہ تمہاری کوئی مشکل حل نہیں

---

[1] قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں مذکورہ آیات سے ہم آہنگ بہت سی آیات آئی ہیں۔ جیسے آیت ۱۷۔۱۸۔۴۰۔۱۲۰ مائدہ، ۱۵۸۔اعراف، ۱۱٦۔توبہ، ۱۱۱۔اسراء، ۲۔فرقان، ۱۰۔ص، ۴۴،۔زمر، ۴۹ شوریٰ، ۸۵۔زخرف اور دیگر آیات

کر سکتے ) کیونکہ انہیں آسمانوں اور زمین میں ایک ذرہ برابر اختیار نہیں، نہ وہ ان کی خلقت میں شریک ہیں اور نہ وہ اس میں خدا کے مددگار ہیں۔

## مفردات کی تشریح:

''ملک'' جیسا کہ مقابیس اللغۃ میں آیا ہے، اس کے معنی کسی چیز پر قوت رکھنا ہے اسی لیے ''تملیک'' بہ معنی قوت آتا ہے۔ بعد میں یہ لفظ وہاں استعمال ہوا جہاں انسان کسی چیز کا مالک ہو کیونکہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے، اسی لیے اس پانی کو ''ملک'' کہا جاتا ہے، جو مسافر کے پاس ہوتا ہے، کیونکہ جب مسافر کے پاس پانی ہو (خصوصاً پہلے زمانے کے بیابانی سفر میں) تو وہ اپنے کام پر مسلط ہوتا ہے۔

''ملک'' سلطان اور بادشاہ کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں قوت و اختیار رکھتا ہے۔

''ملکوت'' کے معنی عزت و سلطنت ہیں۔

''املاک'' بروزن ''اجلاس'' لغت عرب میں بہ معنی تزویج آیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک لفظ ''مملکت'' بھی ہے، جو لغت عرب میں حکومت اور عزت سلطانی کے معنی میں ہے، نیز اس کا اطلاق پانی اور مٹی پر بھی کیا گیا ہے یعنی بادشاہ کے زیر تسلط دریاؤں اور زمینوں کو اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

# آیات کی جمع آوری و تفسیر

## یا اللہ! تو ہی مالک الملک ہے:

(۱) زیرِ بحث آیات میں سے پہلی آیت کے بارے میں مفسرین نے کہا ہے کہ یہ فتح مکہ کے بعد یا جنگِ احزاب میں خندق کھدائی کے دوران اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کو ان کے ہاتھوں رُوم، ایران اور یمن کے فتح ہونے کی خوش خبری دی منافقین نے اسے حد سے زیادہ بڑا بننے، خیالی پلاؤ پکانے اور ناممکن باتوں کی طمع کرنے کے معنی پہنائے [1]

یہی وہ وقت تھا، جب یہ آیت اُتری، اس نے ان بے خبر لوگوں کو جھنجھوڑا اور بتایا کہ تمام ملکوں کا مالک خدا ہی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: (اے پیغمبر!) کہو کہ اے اللہ تو حکومتوں کا مالک ہے۔ (قلِ اللھم ملك الملك)

تو ہی جسے چاہتا ہے حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے تو جس کو چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے (توتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشآء وتعز من تشاء وتذل من تشاءُ)

نہ صرف حکومت دینا اور لے لینا، عزت و ذلت سے ہم کنار کرنا ہی تیرے اختیار میں ہے۔ بلکہ تمام خوبیاں تیرے سعت قدرت

---

[1] مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۲۷ ۔ تفسیر فخر رازی جلد ۸ صفحہ ۴۔

میں ہیں کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔(بیدك الخیر. انك علی كل شیء قدیر [1])

ہر چیز پر خدا کی قدرت واختیار وحقیقت زمین وآسمان کی وسعتوں پر اس کی حاکمیت کی دلیل ہے ظاہر ہے کہ خدا کے ہر چیز کا مالک ہونے کے دو پہلو ہیں۔یعنی ایک عمومی اور دوسرا حقیقی......یعنی خدا کا ہر چیز کا مالک ہونا حقیقی ہے اور عمومیت بھی رکھتا ہے لیکن جب دوسروں کے لیے اس کا ذکر کیا ہے تو اس میں جزائی اور مجازی پہلو نمایاں کر دیا ہے۔(تو تی الملك من تشآء)

یہ جو بعض مفسرین نے اس آیت کے مفہوم کو محدود کرتے ہوئے اس عہد نبوی کی فتوحات یا مومنین کی عزت اور یہودیوں کی ذلت وغیرہ مراد لی ہے تو اس پر کسی طرح کی دلیل موجود نہیں، کیونکہ یہ آیت بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے اس میں تمام حکومتیں، عزتیں اور ذلتیں شامل ہیں۔البتہ انہوں نے جن امور کا ذکر کیا ہے وہ اس کے واضح مصادیق میں سے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا جملہ آخر''(انك علی كل شیء قدیر) خدا کی اس کلی اور مطلق مالکیت پر ایک قوی دلیل ہے۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ اس آیت میں خدا کی جس مشیت وارادہ کا ذکر کیا ہے۔اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ خدا کسی قاعدے قانون کے بغیر ہی عزت دیتا ہے یا ذلت، حکومت عطا کرتا ہے یا واپس لے لیتا ہے بلکہ اس نے عالم اسباب میں فتح وشکست کے لیے عوامل کا ایک سلسلہ قرار دے رکھا ہے۔جو اس کی مشیت وارادہ کے مظاہر ہیں۔

اگر ایک روز مسلمان یورپ کے دروازہ''اندلس'' کو فتح کرتے ہیں یا کسی روز ان کو انہی کی آباد کی ہوئی اس سرزمین سے نکال باہر کیا جاتا ہے تو یہ دونوں حالتیں ان اسباب کا نتیجہ جو خدا کی مشیت وارداہ کے مظاہر ہیں۔

پھر اگر یزید اور چنگیز اسے خون آشام افراد لوگوں پر مسلط ہو جاتے ہیں تو افسوس ہے کہ یہ خود انسانوں ہی کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ ایسی ہی ظالم حکومتوں میں رہنے کے قابل ہوتے ہیں۔جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ہر قوم کے لیے وہی حکومت مناسب ہے جو اس پر حکمرانی کر رہی ہو۔

اس سے ان بہت سے سوالوں کا جواب مل جاتا ہے، جو اس آیت کے بارے میں اٹھائے جاتے ہیں۔لہٰذا کسی مزید توضیح کی حاجت نہیں ہے۔

(۲) دوسری آیت میں تحویل قبلہ پر یہودیوں کے اس بودے اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔انہوں نے کہا تھا: آیا خدا ایک حکم کو منسوخ کرکے اس کی بجائے دوسرا حکم جاری کرسکتا ہے کہ حکم قبلہ کو بیت المقدس سے ہٹائے اور کعبہ کے لیے نافذ کر دے؟ اس بارے میں فرماتا ہے: آیا تمہیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کا مالک خدا ہے؟(الم تعلم ان الله له ملك السمٰوت والارض)

اس صورت میں آیا یہ تعجب کی بات ہے کہ ایسا عالی قدر حاکم کسی حکم کو منسوخ کر دے؟ وہ نہ فقط اپنے بندوں کے مصالح ومنافع سے آگاہ ہے، بلکہ حاکمیت بھی خاص اسی کے لیے ہے اور وہ امور عالم کی تدبیر اور اس میں تصرف کرنے کا مختار مطلق اور بندوں کا مالک

[1] بعض ماہرین لغت کا خیال ہے کہ''خیر واختیار'' کا مادہ ایک ہی ہے اسی لیے خوبیوں کو''خیر'' کہتے ہیں۔کہ ہر شخص ان کو پسند کرتا اور انہیں حاصل کرنا چاہتا ہے(التحقیق، المفردات، تفسیر المیز ان میں آیت زیرِ بحث کے ذیل میں ملاحظہ کریں)

ہے۔اسی لیے آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے۔ خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست و مددگار نہیں ہے (وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر)۔

وہ اپنے کامل وآگاہی کے ذریعے مصالح ومفاسد میں تمہاری مدد کرتا اور اپنی حاکمیت کی بدولت تمہارے لیے قانون بناتا ہے۔

علاوہ ازیں خدا کسی مقام ومکان سے بے نیاز ہے اور اس کے لیے کوئی خاص سمت قرار نہیں دی جاسکتی کہ نماز کے دوران ادھر رُخ کیا جائے۔اس لحاظ سے بطور قبلہ ایک مقام کا تعین صرف اسی لیے ہے کہ یہ اس کا حکم ہے کیونکہ وہ سارے جہان کا ملک ہے۔

خدا کے لیے "ولی ونصیر" کے صفات قرآن میں بہت سے مواقع پر مذکور ہیں۔ممکن ہے ان میں دوجہتوں سے تفاوت وفرق ہو:

(۱) "ولی" کے معنی فوائد ومنافع کی حفاظت کرنے والا ہیں اور "نصیر" وہ ہے جو دُشمن کے مقابلے میں انسان کی مدد کرے۔

(۲) "ولی" وہ ہے جو اس کے لیے شخصاً کوئی کام کرے جو اس کی ولایت کے تحت ہو،لیکن "نصیر" وہ ہے جو انسان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنی مشکل کو دور کرسکے۔

(۳) انسانوں اور جانوروں کی خلقت وآفرینش اور ان میں ہونے والی عجیب وغریب تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے تیسری آیت میں فرماتا ہے: وہی خدا تمہارا پروردگار ہے (عالم ہستی کی) حکومت اسی کے لیے ہے۔(ذلکم اللہ ربکم لہ الملک)۔

وہ خالق بھی ہے اور مربی بھی، نیز اسی وجہ سے مالک وحاکم بھی ہے، اب اس بیان کو توحید عبادت کی بنیاد قرار دیتے ہوئے فرمارہا ہے۔اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں، پھر کیوں تم راہ حق سے منحرف ہورہے ہو؟ (لا الہ الا ھو فانی تصرفون)۔

اے بے خبر غافلو! اور اے وادی ضلالت وگمراہی میں بھٹکنے والو!! خدا کی خالقیت، ربوبیت اور مالکیت کی ان تمام روشن دلیلوں کے باوجود کیوں تم بے راہ ہوئے جارہے ہیں۔

دراصل زیر بحث آیت کے اس حصے میں خدا کی توحید حاکمیت" کو بنیاد بنا کر "توحید عبادت" کا اثبات کیا جارہا ہے اور اس کی حاکمیت کو مسئلہ خلقت وآفرینش کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے کیونکہ مشرکین بھی تسلیم کرتے تھے کہ اس دنیا جہان کا خالق اور اسے پیدا کرنے والا وہ خدائے واحد ہی ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں طالوت وجالوت کی داستان پر نظر کی گئی ہے۔ جالوت ایک ظالم وجابر شخص ہے جو بنی اسرائیل پر حکومت کررہا تھا۔ اور اس نے انہیں بری طرح دبا رکھا تھا۔اس زمانے کے پیغمبر "اشموئیل" [1] نے بنی اسرائیل کی درخواست پر ایک غریب کسان کے بیٹے طالوت کو ان کا سپہ سالار اور حکمران منتخب کیا تو اسرائیلی سردار اس انتخاب پر معترض ہوئے وہ سردارزادے اور سرمایہ دار ہونے کے باعث طالوت کی نسبت خود کو اس منصب کے زیادہ حق دار سمجھتے تھے۔تاہم ان بزرگ پیغمبر نے ان لوگوں کی اس غلطی فہمی کو دور کرنے کے لیے بڑی صراحت کے ساتھ کہا: وہ علم وآگاہی اور جسمانی قوت کے لحاظ سے تم پر فوقیت رکھتا ہے۔

---

[1] بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ پیغمبر شمعون یا یوشع تھے، لیکن یہ قول بیف بعید ہے، اور پھر یوشع تو اس زمانے میں ہو ہی نہیں سکتے، کیونکہ وہ حضرت موسیٰ کے وزیر تھے۔

اس کے بعد فرمایا: خدا اپنا ملک جسے چاہے بخش دیتا ہے (واللہ یوتی ملکہ من یشآءُ)
اس کے ساتھ ہی واضح کر دیا۔ خدا (احسان کرنے میں) وسعت رکھتا ہے۔ اور وہ افراد کی لیاقت برائے منصب سے) آگاہی رکھنے والا ہے (واللہ واسع علیم)
گویا خدا تعالیٰ اس جہان پر نہ صرف تکوینی حاکمیت رکھتا ہے، بلکہ انسانی معاشرے پر تشریعی وقانونی حکومت بھی اسی کی طرف سے ہے اور وہ جسے چاہتا ہے حکومت عطا کر دیتا ہے اگر چہ اس کا یہ چاہنا اور ارادہ کرنا افراد کی اہلیتوں اور لیاقتوں کی بناء پر ہوتا ہے۔
(۵) پانچویں آیت میں یہی مسئلہ ایک اور انداز سے ذکر ہوا ہے اس میں سورج، چاند اور نور وظلمت کے نظام پر خدا کی حاکمیت کے بیان سے ایک نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا: وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے۔ (ذٰلکم اللہ ربکم)
(سارے جہان کی) حکومت اسی کے لیے ہے۔ (لہ الملك)
اور اس کے سوا جن (معبودوں) کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے بھی مالک نہیں ہیں۔

(والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیرٍ)

مفسرین اور ماہرینِ لغت نے "قطمیر" کے کئی معانی بیان کیے ہیں، لیکن اس کا معروف ترمعنی وہ جھلی ہے جو کھجور کے گودے اور گٹھلی کے درمیان ہوتی ہے۔
بعض نے اسے اس چھوٹے سے سفید داغ کے معنی میں لیا ہے جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے کہ وہ یہیں سے اُگتی اور درخت کی شکل اختیار کرتی ہے۔
بعض نے اس سے دانہ خرما کے اوپر کا باریک چھلکا مراد لیا ہے کچھ لوگوں نے اس کو گٹھلی کے درمیانی شگاف کے معنی پہنائے ہیں اور بعض نے اسے وہ زندہ مادہ قرار دیا ہے جو گٹھلی کے اندر ہوتا ہے۔
بہر حال یہ پانچویں معنی کھجور کی گٹھلی سے ہی تعلق رکھتے ہیں جو ہمیشہ سے عربوں کی نظروں کے سامنے رہی ہے بعض تفسیروں میں قطمیر کے معنی پیاز کا چھلکا بھی کیے گئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اس سے قبل واضح کیا ہے اس کے پہلے معنی ہی زیادہ مشہور اور معروف ہیں۔ اندریں صورت ان میں سے جو معنی بھی مراد لیا جائے وہ ایک بے اہمیت، کم قیمت اور حقیر چیز کی طرف کنایہ ہے یعنی مشرکوں کے خود ساختہ معبود کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے بھی مالک نہیں ہیں۔[1]
مذکورہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خداوند عالم کے علاوہ کسی کے لیے کوئی مالکیت وحاکمیت نہیں ہے۔ مگر یہ کہ وہ اپنی مشیت کے تحت کسی کو عارضی حکومت عطا کر دے۔
(۶) چھٹی اور آخری آیت میں بھی اسی مطلب کو ایک نئی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔ تفسیر روح المعانی۔ تفسیر قرطبی تفسیر المیزان۔ تفسیر مراغی۔ المرادت راغب وغیرہم۔

ہوئے فرمایا گیا: (اے پیغمبران مشرکوں سے) کھو کہ جن کو بزعم خویش تم پکارتے ہو (وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے) (قل ادعو الذین زعمتم من دونِ اللہ)

پھر بتایا ہے کہ یہ اس لیے تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انہیں آسمانوں اور زمین میں ایک ذرہ برابر اختیار نہیں (لایملکون مثقال ذرۃٍ فی السمٰوٰتِ ولا فی الارضِ) نہ وہ ان کی خلقت میں شریک ہیں اور نہ وہ اس میں خدا کے مددگار ہیں (ومالھم فیھما من شرکٍ وما لہ منھم من ظھیرٍ)۔

اس لحاظ سے نہ وہ زمین اور آسمانوں کے مستقل مالک ہیں نہ مالکیت میں شریک ہیں اور نہ مددگار......اندریں حال ان کا وہ کونسا کارنامہ ہے کہ جس کے پیشِ نظر تم ان کے سامنے جھکتے اور ان کی عبادت کرتے ہو؟ ان ظاہری دلیلوں کے ساتھ قرآن اس جہان ہستی کی مالکیت وحاکمیت میں خدا کے ساتھ کسی کی شرکت کی نفی کرتا ہے یعنی کسی اور کی مستقل مالکیت وحاکمیت یا اس میں شریک ہونے یا مددگار ہونے کی تردید کرتے ہوئے اسے خاص خدا کے لیے قرار دیتا اور اسے ہر قسم کے شریک ومددگار سے منزہ و پاک شمار کرتا ہے۔

مذکورہ بالا چھ آیات اور ایسی ہی دیگر آیاتِ قرآن سے مجموعی طور پر ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کسی موحد کامل کے نقطۂ نظر سے اس جہانِ ہستی میں خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی مالک وحاکم وجود نہیں رکھتا۔ اگر کوئی شخص کسی مقام ومنصب پر فائز ہے تو بھی وہ ایک ذرہ خاک تک کا مالک نہیں ہوتا، اس کے حالت میں مشرکوں کے لیے بتوں۔ اربابِ انواع یا فرشتوں اور ایسی ہی کسی دوسری مخلوق کی عبادت کرنے کا کوئی عذر وبہانہ باقی نہیں رہتا۔

# توضیحات

## (۱) توحید مالکیت وحاکمیت پر ایمان کے تربیتی اثرات:

انسان میں طغیانی، سرکشی وتکبر اور بخل وحسد کے پیدا ہونے کا سبب ہمیشہ اس کا یہ خیال خام ہوتا ہے کہ وہ اموال واشیاء کا حقیقی مالک ہے یا ایک چھوٹے بڑے علاقے کی حکومت اس کے ہاتھ آجائے تو وہ خود کو مطلق العنان سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی وہ شرک آلود نظریہ ہے جو معاشرہ میں مختلف قسم کے گناہوں اور خرابیوں کے پیدا ہونے اور ان میں اضافے کا موجب ہے۔

لیکن جس وقت اس دنیا کو توحید کے آئینے میں دیکھا جائے اور آیاتِ بالا کے مطابق اسے بلا شرکت غیرے خداوند تعالیٰ کی ملکیت تصور کر لیا جائے تو پھر انسان خود کو مالک نہیں امانت دار سمجھنے لگتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ حدید آیت، میں آیا ہے اس مال میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرو جس میں اس نے تمہیں اپنا نمائندہ وجانشین بنایا ہے۔ (وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ۔ اگر انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ خود کو امانت دار الٰہی تسلیم کرے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اس امانت کے اصل مالک کے حکم پر عمل کرنے میں کوتاہی کرے یا حسد اور بخل میں مبتلا ہو جائے۔

اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس امانت کے اصل مالک کے حکم پر عمل کرنے میں کوتاہی کرے یا حس اور بخل

میں مبتلا ہو جائے۔

اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس دنیا کے اموال انسان کی سرکشی اور تکبر کا سبب بن جائیں کیونکہ یہ سب کچھ خدا کا ہے اور وہی ہر چیز کا مالک اصلی ہے۔ آیا ایک بنک آفیسران لاکھوں روپئوں پر مغرور ہوسکتا ہے جو روزانہ اس کے ہاتھوں میں آتے ہیں؟

یہی حال ان حکومتوں اور منصوبوں کا ہے جو افراد کو ملے ہوئے ہیں، ان کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اس عالمِ ہستی میں ایک چھوٹے سے حصے پر خدائے تعالیٰ کے نمائندہ اور اس کے امانت دار ہیں اس چیز کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے غرور اور سرکشی کے کیا معنیٰ؟ اور اس صورت میں انسان کیونکر ظلم اور فساد پر آمادہ ہوسکتا ہے؟

یہ توحید نظر اور الٰہی جہاں بینی انسان کو ایک اور ہی رنگ میں رنگ دیتی ہے وہ وہی خدائی رنگ (صبغۃ اللہ) ہے کہ جس سے انسان کی سیرت وکردار پر صلح پسندی، صاف باطنی، امن دوستی اور اتفاق وایثار کے نقوش اُبھر آتے ہیں۔

## (۲) خدائی مالکیت سے غلط استفادہ:

اس میں شک نہیں اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ خدا تمام جہانِ ہستی کا مالک ہے۔ نہ صرف بہت سی آیاتِ قرآن اس بات کو ثابت کرتی ہیں، بلکہ متعدد عقلی دلائل بھی ہے اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ کیونکہ اس کی ذاتِ مقدس پر واجب الوجود ہونے کا انحصار اور تمام موجودات کے اس کی بارگاہ میں محتاج و نیاز مند ہونے سے ان سب پر اس کی مالکیت پوری طرح ثابت ہوتی ہے۔

لیکن یہ چیز افراد انسانی کی اس محدود اور قانونی مالکیت کے منافی نہیں ہے جس کی اجازت خدا نے دے رکھی ہے جن لوگوں نے اس خدائی مالکیت کو بہانہ بنا کر ہر قسم کی ''خصوصی مالکیت'' کی نفی کی ہے یہ دے رکھی ہے جن لوگوں نے اس خدائی مالکیت کو بہانہ بنا کر ہر قسم کی ''خصوصی مالکیت'' کی نفی کی ہے یہ اس مسئلے سے غلط فائدہ اٹھانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی اسے اسلامی فکر قرار دیا جاتا ہے اور اس ناطے سوشلزم وکمیونزم کو اسلام کے ہم رنگ ثابت کرنے کی ناکام کوشش بھی کی جاتی ہے اس کے جواب میں ہم کھل کر کہنا چاہتے ہیں کہ جو قرآن خداوند عالم کے اس جہان کا مالک ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ اسی قرآن میں ''وراثت''''خمس''''زکات''''تجارت'' سے متعلق آیات بھی موجود ہیں اور اموال کے ''مالکان خصوصی'' کی مالکیت کو قانونی طور پر تسلیم کرتا ہے۔

قرآن کی چودہ آیتوں میں ''اموالکم'' (تمہارے اموال) اور اکتیس آیتوں میں ''اموالھم'' (ان کے اموال) کے الفاظ آئے ہیں اسی طرح بہت سی قرآنی آیات میں مسلمانوں کو ان کے اموال کے بارے میں احکام دیئے گئے ہیں اگر خدائی مالکیت اپنے مفہوم میں انسانی مالکیت کے منافی ہو تو پھر ان پینتالیس آیتوں میں جو الفاظ آئے ہیں (اور دیگر کئی آیات میں بھی ہیں) وہ کیا معنیٰ رکھتے ہیں؟

قرآن ایک مقام پر کہتا ہے: تم یتیموں کے اموال نہ کھاؤ (نساء ۲، ۱۰)

دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں، انہیں ایسی ایسی جزاء ملے گی (بقرہ۔ ۲۶۲)

سودخوروں کے بارے میں ارشاد ہوا: اگر سودخوری ترک کردو تو تم اپنے اصل سرمائے کے مالک ہوگے۔ (بقرہ۔ ۲۷۹)

قرآن یہ بھی کہتا ہے: جب یتیم سن رشد کو پہنچ جائیں تو ان کا مال انہیں دے دو (نساء۔٦)

قرآن میں ایسی اور تعبیرات بھی ہیں جو انسانی مالکیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

البتہ اسلام میں اسی خصوصی مالکیت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں۔ جیسے مالکیت عمومی'' اور مالکیت دولت یعنی عوامی مالکیت اور سرکاری مالکیت کہ قرآن میں ان کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی خدائی مالکیت سے اختلاف نہیں رکھتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ توحیدِ مالکیت'' اس سے مانع نہیں کہ ہر فرد انسانی یا معاشرے کا ایک گروہ خاص یا خود معاشرہ شرعاً کچھ چیزوں کا مالک ہوتا ہم ان مالکیتوں کے لیے مقررہ شرائط و احکام ہیں جو فقہ اسلامی میں مدون شکل میں موجود ہیں۔

# (۴) توحید قانون گذاری حاکمیت تشریعی

## اشارہ:

ہم جانتے ہیں کہ معاشروں کے نظم وضبط کے لیے تین قوتوں کی ضرورت ہے:

(۱) قوت قانونگذاری......اس کا کام ایسے قوانین وضع کرنا ہے کہ جن سے معاشرے کے نظام کی حفاظت ہو سکے اور کسی فرد یا گروہ کے حقوق تلف نہ ہونے پائیں۔

(۲) قوت مجریہ......یہ ایسی قوت جو قوت ہے قانون گذاری کے بنائے ہوئے قوانین کا نفاذ واجراء کرتی ہے اس میں عموماً حکومت، وزارتیں اور مختلف ادارے و محکمے شامل ہوتے ہیں۔

(۳) قوت قضائیہ......اس کا کام قانون کے خلاف چلنے والوں کو سزا دینا اور راہ راست پر لانا ہے۔توحید اسلام کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان تینوں قوتوں کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے اور اس کے فرمان کے بغیر کسی کو ان میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔کیونکہ وہی ذات قانون ساز ہے، وہی حکومت کرنے کا اذن واجازت دے سکتی ہے اور وہی ذات ہے جس نے قضاوت کو نظام بخشا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ یہ تینوں قوتیں خدا کے اذن سے اپنی مشروعیت اور اس کے حکم سے اپنے حدود وقواعد اخذ کریں، اگر چہ اس کے لیے بہت سے عقلی دلائل موجود ہیں، تاہم قرآن مجید میں بھی اس کا تفصیلی تذکرہ ہوا ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے اور آیاتِ ذیل پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

(۱) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ ﴿المائدۃ: ۴۴﴾

(۲) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ [۵:۴۵]

(۳) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ [۵:۴۷]

(۴) وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللهُ اِلَيْكَ ؕ

(۵) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ [۴:۶۵]

(۶) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ○(انعام۔ ۵۷، یوسف علیہ السلام ۴۰،۶۷)

(۷) وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۷۰ [۲۸:۷۰]

(۸) وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۣ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۸۸ [۲۸:۸۸]

(۹) وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝۱۰ [۴۲:۱۰]

(۱۰) وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ [۶:۱۱۵] [۱]

## ترجمہ:

(۱) جو لوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

(۲) جو لوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔

(۳) جو لوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔

(۴) (اہل کتاب) کے درمیان خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، ان سے بچ کر رہو کہ کہیں وہ تم کو خدا کے بعد احکام سے منحرف نہ کر دیں جو تم پر نازل ہوئے ہیں۔

(۵) تمہارے پروردگار کی قسم کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے، حتیٰ کہ اپنے اختلاف میں تمھیں منصف بنائیں۔ پھر تمہارے فیصلے پر اپنے دلوں میں کچھ تنگی محسوس نہ کریں اور اس کو پورے طور پر تسلیم کر لیں۔

(۶) حکم و فیصلہ صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے......

---

[۱] قرآن میں اسی مضمون کی دیگر آیات بھی ہیں۔ جیسے آیت ۴۸، ۵۰۔ مائدہ ۲۶۔ کہف، ۸۷۔ اعراف، ۱۰۹، یوسف ۴۵، ہود ۸۰، یوسف ۸، تین: ۶۰۔ نساء

(۷) وہ اللہ ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں دنیا میں اور آخرت میں، حاکمیت بھی اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

(۸) اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو، کیونکہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کی ذات کے علاوہ تمام چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں۔ حاکمیت صرف اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

(۹) جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو، اس کا فیصلہ صرف خدا ہی کے ہاتھ میں ہے وہی خدا میرا پروردگار ہے میں اسی پر بھروسہ کیے رہتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

(۱۰) کیا میں سوائے خدا کے کسی کو اپنا منصف بناؤں، حالانکہ وہی تو ہے، جس نے تمہارے لیے یہ آسمانی کتاب نازل کی ہے۔ جس میں ہر چیز کا ذکر ہے۔

## مفردات کی تشریح:

''حکم'' بروزن ''قفل'' ہے۔ بہت سے ماہرین لغت کے نزدیک اس کے اصل معنی منع کرنا اور روکنا ہیں[1] بعد میں اس کو ''قضاوت'' اور ''حکومت'' کے لیے استعمال کیا جانے لگا، کیونکہ قاضی اور حاکم اپنے قطعی حکم کے ذریعے لوگوں کو اس حکم کی مخالفت یا دیگر ناجائز کاموں سے باز رکھتا ہے۔

حکمۃ ''بروزن'' غلبۃ'' کا نعی لوہے کا وہ حلقہ یا کیل ہے جو لگام یا نکیل میں حیوان کے منہ یا اس کی ناک میں ڈالتے ہیں۔ جب اسے کھینچا جائے تو حیوان کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ مطیع ہو جاتا ہے تاہم اس میں بھی منع اور روکنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

لسان العرب کے مولف کا کہنا ہے کہ ''حکم'' کے کئی معانی ہیں۔ جیسے علم و فہم اور حق و عدالت کے مطابق فیصلہ دینا (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ امور انسان کو ناجائز کام سے باز رکھتے ہیں)

حکیم کو اس لیے حکم کہتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ علم و آگاہی رکھتا ہے جو اسے گناہوں، نادرست کاموں اور غلطیوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ لفظ (حکم) تینوں معنوں یعنی ''قانون گذاری'' ''قضاوت'' اور ''امور اجرائی'' میں استعمال ہوتا ہے اور ان ہر سہ فرائض میں سے ہر ایک کے ذمہ دار کو ''حاکم'' کہا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض کتب لغت میں ''حکم'' کے معنی تفویض اور ایک کام کسی دوسرے کے سپرد کرنا بھی ہیں۔

---

[1] المفردات راغب، مقاییس اللغۃ۔ مصباح المنیر قیومی۔

کتاب ''العین'' مین آیا ہے کہ ''حکمت'' کے لفظ میں علم، عدالت اور حلم کے معنی پائے جاتے ہیں۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ حکمت کے معنی کرنا ہے یا فساد سے منع کرنا بھی ہیں اور یہ تشریح ان تمام اہل لغت کے بیانات سے مطابقت رکھتی ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

''آیات محکمات'' کو اس لیے محکمات کہا گیا ہے کہ ان کی صراحت اور واضح دلالت ہر قسم کی نادرست تفسیر اور تاویل کا راستہ روک دیتی ہے۔

# آیات کی جمع آوری اور تفسیر

(۱) تا (۴) سورۂ مائدہ کی چار آیات (۴۴۔۴۵۔۴۹) میں مسئلہ توحید حاکمیت بڑے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفسیر میں ان سے قریب تر آیات بڑے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تفسیر میں ان سے قریب تر آیات ۴۸، ۵۰ بطور ضمیمہ ذکر ہوئی ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوا ہے: جو لوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ دوسری آیت میں کہا کہ وہ ظالم ہیں اور تیسری آیت میں ہے کہ وہ فاسق ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فائولك هم الكافرون۔ هم الظلمون... هم الفسقون)۔

ان تینوں تعبیرات کے مفاہیم مختلف ہیں یا سب ایک مفہوم کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اس بارے میں مفسرین نے بہت کچھ بحث کی ہے، بعض کا نظریہ ہے کہ یہاں ایک ہی گروہ کا ذکر ہے۔ جس میں متعدد صفات پائی جاتی ہیں اس کی تفسیر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ جو بھی شخص ما انزل اللہ (جو بھی خدا نے نازل فرمایا) کے خلاف حکم وفیصلہ کرے گا۔ چونکہ وہ خدا کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا ہے اس لیے کافر ہے۔ اس لیے کہ حقوق انسانی کی تلف کر رہا ہے وہ ظالم ہے اور اس کی وجہ سے کہ خدا کے مقرر کردہ حدود سے خارج ہو رہا ہے وہ فاسق ہے (یاد رہے کہ فسق کا مطلب وظیفہ بندگی کو ترک کر دینا ہے)۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ پہلی اور دوسری آیت یہودیوں کے متعلق اور تیسری آیت مسیحیوں کے متعلق ہے۔ چونکہ یہودیوں کی احکام الٰہی کے ساتھ دشمنی مسیحیوں سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا وہ کافر و ظالم ہیں اور فقط فاسق ہیں۔

بہر حال یہ ایک واضح امر ہے کہ آیات کا کسی مورد خاص میں نزول ان کے مفہوم کو خاص اور محدود نہیں کرتا اس لیے یہ آیات ان سب افراد اور گروہوں پر صادق آتی ہیں جو احکام الٰہی کے خلاف حکم وفیصلہ دیتے ہیں۔

جو بھی شخص فرمان الٰہی کے خلاف حکم دے گا اس کا ظالم و فاسق ہونا ثابت ہے البتہ کفر کا اطلاق اس صورت میں ہوگا کہ وہ حکم خدا کو رد کرے اور اسے باطل سمجھے۔ کیونکہ ایسا قول یا اعتقاد خدا کی ذات کا انکار یا اس کے علم حکمت اور یہ قطعی طور پر کفر ہے۔ اسی طرح کسی حکم نے انکار سے انکار رسالت محمد یہ لازم آئے تو یہ بھی کفر میں داخل ہے۔

لیکن اگر ایک شخص حکم الٰہی کے خلاف فیصلہ کرے اور اس کی بنیاد خواہش نفس پر ہو یعنی وہ توحید و نبوت کا انکار نہ کرتا ہو تو اس پر کفر لازم نہیں آئے گا۔

اس سورے کی آیت ۴۸ میں بھی یہی حکم آیا ہے۔جیسا کہ فرمایا(فاحکم بینهم بما انزل الله ) خدا کے احکام کے مطابق ان کے درمیان حکم خدا کے مطابق کرو۔ نیز اس کے ساتھ ہی آیت ۴۹ میں ہے(وان احکم بینهم بما انزل الله)لازم ہے کہ ان کے درمیان حکم خدا کے مطابق کرو۔

اس سے اگلی آیت ۵۰ میں فرمایا(فحکم الجاهلیة یبغون ومن احسن من الله حکماً لقومٍ یوقنون) کیا وہ تم سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، باایمان افراد کے لیے خدا کے سوا کون بہتر فیصلہ کرنے والا ہوگا؟

ان چھ آیتوں میں سے اس بات کی تاکید در تاکید ہوئی ہے کہ حقیقی حکم بس خدا ہی کا حکم ہے۔

ایک ہی سورے کی چھ آیتوں میں پے در پے مختلف عبارتوں میں حق حکم کو خاص خدا ہی کے لیے قرار دیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ کسی بڑے سے بڑے عہدیدار اور بلند سے بلند منصب رکھنے والے کو قانون سازی کا حق نہیں ہے، بلکہ یہ صرف اور صرف خدا کا حق ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے لیے قانون بنائے، پس جو شخص خدا کے حکم کے خلاف فتویٰ دے یا فیصلہ کرے یا حکومت کرے،تو وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا اور اسے ظالم وستم گار شمار کیا جائے گا۔ یہ ایک ایسا گناہ ہے جو اس کے بدن سے لباس ایمان اتار لے گا۔

اس ترتیب سے توحید وحاکمیت تشریعی اور حق قانون سازی کا خداوند حاکم کی ذاتِ مقدس میں منحصر ہونا نیز حکم کا حکم خدا میں انحصار پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے۔

(۵) پانچویں آیت میں منصب قضادت پر بات ہورہی ہے۔اسے پیغمبر اکرمؐ (اوران کی طرف سے امامت مطلقہ یا خصوصی قضاوت پر نصب کیے گئے افراد) کے لیے دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

تمہارے پروردگار کی قسم کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اپنے اختلاف میں تمہیں منصف بنائیں (فلا وربك لا یومنون حتیٰ یحکموك فیما شجر بینهم)۔

پھر تمہارے فیصلے پر اپنے دلوں میں کچھ تنگی محسوس نہ کریں۔(ثم لایجدوا فی انفسهم حرجاً مما قضیت)

اور اس کو پورے طور پر تسلیم کرلیں (ویسلموا تسلیماً)

بنابریں ایمانِ خالص کی یہ تین علامات ہیں۔

(۱) اپنے تمام اختلافات میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم وفیصلہ کنندہ قرار دینا۔

(۲) پیغمبرؐ جو حکم یا فیصلہ صادر فرمائیں اس پر کوئی ناخوشی یا تنگی محسوس نہ کرنا۔

(۳) حضور اکرمؐ کے حکم پر بہ تمام وکمال عمل درآمد کرنا۔

اس ترتیب سے یہ آیت حاکمیت کے دوسرے شعبے یعنی حاکمیت قضاوت کو بھی خداوند تعالیٰ کے لیے قرار دیتی ہے( کیونکہ نبی اکرمؐ خدا کے نمائندہ اور اس کی طرف سے مامور ہیں)۔

# حکم بس اللہ ہی کا ہے:

(۶) چھٹی آیت میں ایک مختصر جملے میں فرماتا ہے (حکم وفیصلہ صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے ان الحکم الا للہ۔

البتہ خود یہ جملہ کہ جو قرآن میں کئی بار دوہرایا گیا ہے بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے اور حکم بہ معنی قانون گذاری (قانون سازی) بھی اس میں شامل ہے نیز حکومت وقضاوت اور حکم تکوینی وتشریعی سبھی اس کے تحت آجاتے ہیں۔لیکن اس میں ایک اور پہلو بھی زیر نگاہ رکھنا چاہیئے کہ سورۂ انعام آیت ۵۷ اور سورۂ یوسفؑ آیت ۶۷ میں جملہ کافروں کے لیے عذاب و پاداش کے ضمن میں حکم خا کے اجراء کو بیان کر رہا ہے۔

بہر حال حکم بس اللہ ہی کے لیے ہونے کی تعبیر کا مختلف موارد میں استعمال جیسے ہم نے پہلے بھی کہا ہے۔اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ آیت بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے۔اور ہر قسم کے حکم فرمان کو خدا کے لیے مخصوص ٹھیراتی ہے، اس میں عالم تکوین اور عالم تشریع سے متعلق تمام احکام شامل وداخل ہیں۔

(۷) ساتویں آیت میں خدا کو دنیا وآخرت میں لائق عبادت اور قابلِ حمد وثنا قرار دینے کے بعد فرماتا ہے وہ اللہ ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں اس دنیا میں اور آخرت میں، حاکمیت بھی اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

(وهو الله لا اله الا هو له الحمد فی الاولی والاخرة وله الحکم والیه ترجعون)۔

''وله الحکم'' ہر دو عالم میں حاکم وہی ہے یہ جملہ درحقیقت صرف اسی کے حمد وستائش اور عبادت و پرستش کے لائق ہونے کی دلیل کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ ''معبود'' اور ''محمود'' وہ ہے جس کا حکم ہر چیز میں جاری ونافذ ہو اگرچہ بعض مفسرین مثلاً ابنِ عباس نے کہا ہے کہ یہاں ''حکم'' سے مراد قیامت میں اس کا بندوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے[1]

لیکن اس آیت کے مفہوم کو محدود کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔اور پھر ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ کسی آیت کے سبب نزول کی خصوصیت اس کے معنی ومطلب کی عمومیت میں مانع نہیں ہوتی۔

لہٰذا مذکورہ بالا آیت عالمِ تکوین اور عالمِ تشریع میں خدائے تعالیٰ کی توحید وحاکمیت اور قانون سازی وقضاوت کے حق کو ثابت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ ان امور میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔چنانچہ تفسیر المیزان میں بھی اس آیت کے مفہوم میں عمومیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[2]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جملہ ''له الحکم'' دو جہتوں سے حصر پر دلالت کرتا ہے، اوّل یہ کہ ''له'' کو مقدم کیا گیا اور دوم یہ کہ ''الحکم'' مطلق صورت میں آیا ہے۔یعنی اس میں ہر قسم کی حکومت شامل ہے۔

یاد رہے کہ خدائے تعالیٰ کی یہ کلی حاکمیت اس سے مانع نہیں ہے کہ وہ اختیار حکومت پیغمبروں، معصوم اماموں یا اپنے دیگر صالح بندوں

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۰ صفحہ ۹۲۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۶ صفحہ ۷۰۔

کوعطاء کردے، جیسا کہ حمد وستائش کا اسی کے لیے مخصوص ہونا اس سے مانع نہیں ہے کہ انسان ان صالح بندوں کا جو حصول نعمت کا وسیلہ ہیں یا ماں باپ اور استاد کی توصیف کرے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ دراصل یہ سب تعریفیں خدا ہی کی ہیں اور یہی ہے توحید حاکمیت کا مفہوم ومطلب!

(۸) آٹھویں آیت میں پہلے توحید عبادت کا ذکر کیا اور پھر توحید حاکمیت کے بارے میں فرماتا ہے: اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو کیوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں (ولا تدع مع اللہ الھاً اٰخر لا الہ الا ھو)۔

اس سے اگلا جملہ کہ جو اس حکم کی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں فرمارہا ہے اس کی ذات کے سوا تمام چیزیں فنا ہوجانے والی ہیں (کل شیء ھالك الا وجھه)۔

پھر آخر میں فرماتا ہے: حاکمیت صرف اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ (له الحکم والیه ترجعون)۔

یہ آیت عبادت، بقاء اور حکم وفیصلہ کو خدا کے لیے مخصوص شمار کرتی ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں ''حکم'' کو خدا کے حکم تکوینی اور اس ارادہ کے معنی میں لیا ہے جو ہر چیز میں کارفرما ہے بعض نے اسے قیامت میں فیصلہ کرنے اور بعض نے اس کو فقط حکم تشریعی سے متعلق قرار دیا ہے۔ الفاظ بتارہے ہیں۔ کہ یہ آیت مطلق اور بے قید وشرط ہے لہٰذا اس میں عالم ہستی اور عالمِ شریعت نیز اس دنیا اور دوسری دنیا کے بارے میں ہر حکم شامل ہوجاتا ہے۔

جملہ ''کل شیء ھالك الا وجھه'' میں لفظ ''وجہ'' سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسروں نے اس کی تشریح ان اعمالِ صالح سے کی ہے جو خدا کے ارادہ کے تحت انجام دیئے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خدا کا دین وآئین ہے اور بعض نے اس کی تفسیر خدا کے مقام ومرتبہ کے طور پر کی ہے۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ ''وجہ'' دراصل ''چہرہ'' کے معنی میں ہے پر اس لیے کہ بقول راغب اصفہانی ''چہرہ'' وہ پہلی چیز ہے جو کسی دوسروں سے جدا کرکے دکھاتی ہے اور یہ برترین عضوِ بدن ہے، اس لفظ کا اطلاق اعلیٰ اور برتر موجودات پر کیا جاتا ہے۔ اور اسی مناسبت ہے یہ خدا کی ذاتِ مقدس کے لیے استعمال ہوا ہے نیز اس آیت میں بھی ظاہراً اس کے یہی معنی مراد ہیں۔

لیکن اس لحاظ سے کہ ہر وہ موجود ومخلوق جو اس باقی وابدی ذات سے رابطہ پیدا کرلے وہ بھی ابدیت کا رنگ اختیار کرلیتی ہے، لہٰذا خدا کا دین وآئین اس کے حکم سے انجام دیئے گئے اعمال اور پیغمبران الٰہی کو جو اس سے رابطہ رکھتے ہیں وہ سبھی بقاء اور ابدیت سے ہم کنار ہوجاتے ہیں...... اسی ترتیب سے آیت زیر بحث کے ذیل میں بیان کی جانے والی تمام تفسریں اس میں جمع ہوگئی ہیں۔ اور یہ ان سب کی جامع ہے۔

## اپنے اختلافات میں خداوند پیغمبرؐ کی طرف رجوع کرو:

(۹) نویں آیت میں ''حاکمیت'' کو ''قضاوت'' کے معنی میں لایا گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے: جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ صرف خدا ہی کے ہاتھ میں ہے (وما اختلفتم فیه من شیء فحکمه الی اللہ)

ہاں وہی تو ہے جو تمہارے اختلافات کا فیصلہ کرسکتا ہے، کیونکہ وہ تمام چیزوں سے آگاہ اور باخبر ہے نیز وہ ان پر ولایت یعنی ملکیت

وحاکمیت بھی رکھتا ہے۔

پھراس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتا ہے: وہی خدا میرا پروردگار ہے (یہی وجہ ہے کہ) میں اسی پر بھروسہ کیے رہتا ہوں۔ اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ (ذٰلکم الله ربی علیه توکلت والیه انیب)۔

اس آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال ہیں۔ بعض مفسرین اسے لوگوں کے ذاتی اختلافات اور رنجشوں سے متعلق قرار دیتے ہیں کہ جن کا فیصلہ انہیں پیغمبر اکرمؐ سے کرانا چاہیے تھا۔ بعض اس کو آیاتِ قرآن کی تفسیر وتاویل میں اختلاف سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض اہل تفسیر اسے ان علوم میں اختلاف نظر شمار کرتے ہیں...... جو معارفِ دینی اور فرائض وذمہ داریوں سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے روح اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی شناخت کے مسائل ہیں [۱]

لیکن آیت کے کسی ایک مطلب تک محدود ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے اور جیسا کہ بہت سے محققین نے کہا ہے یہ آیت ہر قسم کے حکم وفیصلے کو شامل ہے، خواہ وہ احکام ومعارف دین ہوں، خواہ لوگوں کے تنازعات یا آیات متشابہ اور دیگر مسائل ہوں۔

یہ ان آیات میں سے ہے جو اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ تمام مسائل کا حل قرآن وسنت میں موجود ہے لہٰذا از خود قانون سازی کرنے اور قیاس دوڑانے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اگر قرآن وسنت میں تمامی احکام موجود نہ ہوتے تو اختلافات کے بارے میں ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ (غور کریں)

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ فخر رازی اور دیگر مفسرین نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اس آیت کو فقہی مسائل میں قیاس کے باطل ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ [۲]

کیونکہ یہ آیت کہہ رہی ہے کہ تمام اختلافات کا فیصلہ خدائے تعالیٰ سے حاصل کرنا چاہیے (نیز پیغمبر اکرمؐ بھی فیصلہ دے سکتے ہیں کہ وہ لوگوں میں خدا کے نمائندہ ہیں) پس اگر کتاب وسنت میں احکام وعقائد اور شریعت سے متعلقہ اُمور کا حل پہلے سے نہ کر دیا، ہوتا تو اختلافات میں خداوند جہاں کی طرف رجوع کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے۔

(۱۰) دسویں آیت میں ایک کلی نتیجہ کے طور پر پیغمبر اکرمؐ کی زبانی فرما رہا ہے: کیا میں سوائے خدا کے کسی کو اپنا منصف بناؤں حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے یہ آسمانی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا ذکر ہے۔ (افغیر الله ابتغی حکماً وهو الذی انزل الیکم الکتٰب مفصلاً)۔

بنابریں ''حَکم'' و ''قاضی'' صرف خدا کی ذات مقدس ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تمام چیزوں سے آگاہ وباخبر ہے اور یہ قرآن اس

---

[۱] روح المعانی جلد ۲۵ صفحہ ۱۵ پر یہ تینوں تفسیریں دیگر مفسرین سے نقل کی گئی ہیں۔

[۲] تفسیر فخری رازی جلد ۲۷ صفحہ ۱۴۹۔

کے علم وآ گاہی پر بہترین دلیل ہے [۱]

اس بارے میں "حکمیت" کس چیز میں مطلوب ہے؟ قرائن بتاتے ہیں کہ یہاں خداوندِ عالم سے پیغمبر اکرم کی حقانیت کے متعلق حکم وفیصلہ مراد ہے۔

اس آیت کی جوشانِ نزول نقل ہوئی ہے وہ بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے، جیسا کہ راوی کہتے ہیں:

مشرکین قریش نے نبی اکرمؐ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہمارے اور اپنے درمیان علماء یہود یا مسیحی پادریوں میں سے کسی کو حکم ومنصف ٹھہرائیں تا کہ وہ آسمانی کتابوں کی رُو سے ہمیں آپ کے مقام اور حیثیت سے آگاہ کریں [۲]

اس سے یہ آیت نازل ہوئی کہ جس میں انہیں جواب دیا گیا ہے کہ خدا کے علاوہ بھی کوئی حکم ومنصف وجود رکھتا ہے؟

علاوہ ازیں اس آیت کا آ کری جزء بھی اس مفہوم کا شاید ہے کہ جہاں فرماتا ہے: جن لوگوں کو ہم نے (اس سے پہلے) آسمانی کتابیں دیں وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن حق کے ساتھ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے(والذین اٰتینھم الکتب یعلمون انه منزل من ربك بالحق)۔

بہرحال اس آیت کا مفہوم بڑی وسعت رکھتا ہے اور یہ بلا استثناء تمام امور میں حکمیت کو خدا کے لیے مخصوص قرار دیتی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آیت کا موردنزول اس کے مفہوم کو محدود نہیں کر

مذکورہ بالا دس آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ ہستی وعالمِ شرع میں حاکمیت اور نفوذ حکم وفرمان خدائے تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے نیز حاکمیت بہ معنی قانون سازی، قضاوت اور حکومتِ اجرائی (نفاذ قانون) کا سرچشمہ خداوندِ عالم ہی ہے اگر کوئی شخص ان امور میں سے کسی امر یا اس کے ایک جز کا ذمہ دار بنے تو اس کے لیے خدا کا اذن وحکم ضروری ہے۔

البتہ ان دس آیات میں مختلف تعبیرات آئی ہیں۔بعض میں حاکمیت کے تمام شعبوں کا ذکر ہے اور بعض میں صرف قانون سازی کی طرف اشارہ ہے لیکن مجموعی طور پر ان آیات میں "توحید حاکمیت" اپنے تمام پہلوؤں سمیت پوری طرح واضح اور عیاں ہے۔

---

[۱] "حکم" بروزن "عمل" ہے مجمع البیان وتبیاں کے مطابق حکم وہ ہے، جس کا فیصلہ ہمیشہ حق ہو، جبکہ حاکم کا فیصلہ ناحق ہوسکتا ہے، لیکن اس مفہوم کے لیے کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ لفظ "حکم" صفت مشبہ ہے اور دوام واستمرار رکھتا ہے۔ یہ لفظ اس پر بولا جائے گا جو ہمیشہ صحیح فیصلہ دے، لیکن جنگ صفین میں حکمین کے تقرر کا واقعہ اس کی نفی کرتا ہے۔لیکن جب "حکم" یا "حاکم" کے الفاظ خدائے تعالیٰ کیلئے استعمال ہوں تو اس سے مراد ایسا فیصلہ ہوگا۔جس میں ظلم وخطا کا شائبہ نہیں مگر یہ مطلب لُغت سے مطابقت نہیں رکھتا۔

[۲] تفسیر رُوح المعانی جلد ۸ صفحہ ۷۔

# توضیحات

## (۱) خدائی حاکمیّت عقل کی روشنی میں:

اس بات میں شک نہیں کہ ہر خداشناس شخص جس نے توحید خالق کو مانا ہوا ہے۔ وہ جہانِ ہستی میں اس کے فرمان کو بھی جاری وساری سمجھتا ہوگا۔ جب عالمِ ہستی پر اس کی حاکمیت تسلیم کی جا چکی تو پھر اس کی ولایت وحکومتِ تشریعی میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ جب اس جہان کا خالق ومالک اور مدیر ومدبر وہ ہے تو بجز اس کے کوئی دوسرا یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ نظامِ تکوین وآفرینش سے ہم آہنگ قانون سازی کر سکے۔

اس طرح جب وہ خالق ومالک اور مدیر ومدبر ہے تو ضروری ہے کہ وہی بندوں پر قانونی حکومت اور ان کے اخلافات کا فیصلہ کرنے کی ذمہ داری کسی کے سپرد کردے۔ اس کے علاوہ ہر صورت میں خدا کی مالکیت وتدبیر کے دائرہ عمل میں بے جا مداخلت تصور کی جائے گی۔

ایک اور لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک صحیح قانون وہی ہے جو انسان کے جسم وجان سے ہم آہنگ ہو۔ اس کی مادی ومعنوی ضرورتیں پوری کرے۔ کم یا زیادہ مدت میں اس کا کوئی برا اثر ظاہر نہ ہو اور معاشرے پر اس کے اجراء کے لیے ایک قوت موجود ہو، نیز لوگوں میں اسے قبول کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہو۔

دوسرے لفظوں میں ایک اصلی قانون ساز وہ ہے جو ایک طرف کامل انسان شناس ہو اور دوسری طرف اس عامِ ہستی کی صحیح شناخت بھی رکھتا ہو تاکہ وہ انسانوں کے ظاہر وباطن پر نظر رکھتے ہوئے قانون سازی کرے مزید یہ کہ وضع قوانین میں اپنا کوئی فائدہ بھی اس کے پیشِ نظر نہ ہو۔

ہم انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں یہ جو بڑی خرابیاں دیکھتے ہیں تو اس کی وجوہات کچھ یوں ہیں۔

(۱) ایک ایسا شخص جو انسان کے جسم وجان کی باریکیوں کو جانتا ہو اور اس دُنیا میں کارفرما طبعی قوانین سے بھی آگاہ ہو وہ انسانی معاشرے میں نہیں مل سکتا۔ کیونکہ ابھی تو دانش وردوں کی طرف سے انسان موجود ناشناختہ...... جیسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں، جہاں خود اپنے بارے میں انسان کی معلومات اتنی کم اور اتنی کمزور ہوں وہاں اس وسیع کائنات سے متعلق اس کے علم وآگاہی کا کیا حال ہوگا؟

(۲) انسان ایک ایسا موجود ہے جو بہت سی حاجتیں رکھتا ہے لہٰذا کسی معاشرے میں جو بھی گروہ قانون سازی کرتا ہے وہ اپنے گروہ اور اپنی پارٹی کے مفاد کو مدنظر رکھتا ہے۔

(۳) ان باتوں کو چھوڑتے ہوئے بھی ایک اہم چیز باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی انسان غلطی اور غلط فہمی سے مبرا نہیں ہے، اسی وجہ سے انسانوں کے وضع کیے ہوئے قوانین ہمیشہ تغیر وتبدل کی کیفیت سے دوچار رہتے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ان کی خامیاں اور نقائص سامنے آتے ہیں پھر ان میں ایک طرف سے اصلاح کرتے ہیں تو دوسری طرف سے ایک اور نقص سر نکالنے لگتا ہے اس لیے انسانوں کی بنائی ہوئی مجالس قانون ساز بطور آزمائش گاہ کے وجود میں آئی ہیں کہ ہمیشہ سے قوانین کی آزمائش کر رہی ہیں اور آزمائش کا یہ سلسلہ کہیں جا کر نہیں تھمتا۔

بنابریں خدائے تعالیٰ کی مالکیت وحاکمیت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی اصولاً انسان کو پیدا کرنے والا کہ جو اس کے جسم وجان کی تمام حاجتوں سے آگاہ، ہر چیز اور ہر شخص سے بے نیاز اور ہر طرح کی غلطی وغلط فہمی سے منزہ و پاک ہے، اس کے سوا کوئی اور شخص قانون سازی کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

لٰہذا ہمارا وظیفہ و ذمہ داری صرف یہ ہے قوانین الٰہی کے کلی اصولوں کو اپنے عہد کے تقاضوں سے مربوط کریں اور ان کی روشنی میں قابل عمل جزئی احکام مرتب کر کے خدا کی زمین پر خدا کے قانون کا نفاذ ممکن بنائیں۔

## (۲) حکومت ایک امانتِ خداوندی ہے:

مذکورۂ بالا آیات سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حکومت ایک امانتِ خداوندی ہے، اس لیے حکمرانوں اور عہدیداروں کو خدا کے نمایندوں کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر حالت میں حکومت کے اصلی مالک (خدا) کے بتائے ہوئے اصول وضوابط کا لحاظ رکھیں اور ان کے تحت اپنے فرائض ادا کریں۔

حضرت داؤدؑ جو تاریخ انسانی میں مذکور بڑی بڑی حکومتوں میں سے ایک حکومت کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ ان سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ (اور نمایندہ) قرار دیا ہے، لوگوں میں حق کے ساتھ حکم وفیصلہ کرو، اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ (یداودانا جعلنك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالحق و لاتتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله۔ (ص ۲۶))۔

یہ تعبیر بھی حکومت کے امانت خداوندی ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ نیز ایک مکمل شرعی والٰہی حکومت کے نقوش کو بڑی عمدگی کے ساتھ واضح وعیاں کرتی ہے۔

## (۳)۔ حکومت کی تشکیل صرف خدا کی طرف سے ہے:

اسلام اور نظریہ توحید کی رو سے حکومت طرف بالا سے تشکیل پاتی ہے نہ جانب پست سے...... یعنی حکومت خدا کی طرف سے ہے نہ لوگوں کی طرف سے...... تاہم عوامی تائید بھی خدا کی طرف سے حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی اس امانت الٰہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ نظریہ توحید اور نظریہ شرک میں جو فرق پائے جاتے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ ایک توحید پرست انسان حکومت کو اس کی تمام شاخوں (قانون، اجرائی، قضائی) سمیت خدا کی طرف سے تصور کرتا ہے جو انبیاء ان کے اوصیاء اور پھر علماء وصلحاء اُمت کو ملتی ہے۔

ان احکام کے لیے لازم ہے کہ وہ خود خدا کے سامنے جواب دہ سمجھیں اور ہر بات سے پہلے اس کی رضاء پر نظر رکھیں اور اس کے بندوں کے ہمدرد اور خدمت گذار بن کر رہیں۔ ایسی حکومت خالقِ اکبر کے پیغام سے الہام پا کر لوگوں کی راہنمائی کر سکتی ہے نہ یہ کہ بے راہ خواہشوں اور گناہ آلود کاموں کے پیچھے چل پڑے۔

اس صورت میں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حکومت اسلامی میں عوامی رائے کا کوئی دخل نہیں اور یہ دراصل صالحین کی آمریت ہے۔

لیکن یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے، کیونکہ اس شوریٰ کہ جو توحیدی آئین میں حکومت کی ایک بنیاد کے طور پر ذکر ہوئی، قرآن نے اس کی تاکید فرمائی اور پیغمبرؐ اکرم کا عمل اس پر گواہ ہے کہ جو عقلِ کل کے مقام پر فائز تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ جو ''مالک الملک'' اور احکم الحاکمین'' ہے......اس نے یہ حکم دیا کہ امور حکومت میں لوگوں سے مشورہ لیا جائے تا کہ وہ ان مین شریک وحصہ دار ہوں۔

اس نظر سے حکومت توحیدی واسلامی، عوامی مذہبی حکومت قرار پائے گی، یعنی اس میں لوگوں کی آراء اور خدا کے حکم کو اہمیت دی جاتی ہے لیکن یہ عوامی رائے اصول دین اور احکام الٰہی کے حدود اربعہ میں رہنی چاہیے......اس قول کی شرح انشاء اللہ حکومت در اسلام' کے مباحث میں آئے گی۔

نتیجہ کلام یہ ہے کہ مثلاً عام لوگ جب صدر جمہوریہ یا ارکان شوریٰ کے انتخاب میں ووٹ ڈالنے جائیں تو اس نکتے کی طرف متوجہ رہیں کہ خدا نے ان کو حق رائے دہی عطا فرمایا ہے۔یعنی وہ امانت دار الٰہی ہیں اور یہ ووٹ جو حکم وفیصلہ (حکومت) کی ایک قسم ہے اسے کسی ایسے شخص کے حق میں استعمال کریں، جس میں خدا کے پسندیدہ عادات وخصائل موجود ہوں ورنہ وہ امانت میں خیانت کے مرتکب قرار پائیں گے۔

سورۂ نساء کی آیت ۵۸ میں آیا ہے: خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان حکم وفیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے کام لو(ان اللہ یأمرکم ان تودوا الا مٰنٰت الی اھلھا واذا حکمتم بین النّاس ان تحکموا بالعدل)۔

روایات اسلامی میں آیا ہے کہ امانت کے اطلاقات میں سب سے اہم ''حکومت'' ہے تفسیر درمنثور میں بھی اس کی تاکید ہوئی ہے: لوگوں کے امام وحاکم پر لازم ہے کہ وہ خدا کے فرمان کے مطابق حکومت ان یودی الامانة)[1]

بنابریں ووٹ دینے والے لوگوں کو یہ کبھی نہ سوچنا چاہیے کہ کون سا صدر جمہوریہ اور کونسا رُکن شوریٰ ان کے ذاتی یا گروہی مفادات کی حفاظت کرے گا یا ان میں سے کون ان کے ساتھ دوستی یا رشتہ داری کا تعلق رکھتا ہے اور کون انہیں پسند یا ناپسند ہے۔ بلکہ وہ ہر موقع پر خدا و رضائے خدا اور انسانی ودینی اوصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا ووٹ استعمال کریں تا کہ حق امانت ادا ہو سکے۔

لیکن مادیت پرست جمہوری وعوامی حکومتوں میں ممکن ہے کہ ووٹ دینے والے لوگ ذاتی پسند وناپسند، گروہی تعصب، سیاسی وابستگی، ناجائز مالی فوائد اور خصوصی رابطے کو پیش نظر رکھ کر اپنا ووٹ استعمال کریں اور اس امانتِ الٰہی میں خیانت کے مرتکب ہوں، جب کہ اسلامی حکومت میں صرف رضائے الٰہی اور فلاحِ انسانی کے لیے ووٹ دیا جاتا ہے۔ع

بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

---

[1] تفسیر ورالمنشو رجلد ۲ صفحہ ۱۷۵۔

## (۴) توحید حاکمیت پر ایمان رکھنے کے اخلاقی اثرات:

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ توحید حاکمیت پر ایمان یعنی زندگی کے ہر گوشے پر خدا کی حکومت کا اعتقاد اور یہ نظریہ کہ حکومت انسانوں کے ہاتھ میں خدا کی امانت ہے، اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ لوگ حکومت کے اعلیٰ ودانی عہدوں کیلئے انتخاب کرنے وقت اس بات کو مدِنظر رکھتے ہیں کہ حکومت خدا کی عطاء اور اس کی امانت ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ الہٰی ضابطے کے مقابلے میں کسی شخص سے اپنے ذاتی رابطے کا لحاظ کریں اور ایسا کوئی امکان نہیں کہ وہ معاشرے کے مفاد کو اپنے شخصی مفاد پر قربان کریں۔

جہاں تک حکمرانوں اور فرماں رواؤں کا تعلق ہے، ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑی مصیبت یہی خودغرض صاحبان حکومت ہیں جو طول تاریخ میں ہزاروں مرتبہ دنیا کے بڑے بڑے خطوں کو اور بعض اوقات پوری دنیا کو آتش جنگ وجدل کی طرف کھینچ لائے، اس طرح انہوں نے نوع انسان کے ایک بڑے حصے کو تنگی و سختی اور رنج والم کے اندھے کنوؤں میں دھکیل دیا۔

ہمارے ماضی قریب میں ہٹلر نے لاکھوں انسانوں کو موت کے منہ میں ڈال دیا، اسٹالن کے ہموطنوں نے اس کے بارے میں وحشت ناک اعداد وشمار شائع کیے ہیں، ان کے مطابق وہ تین کروڑ انسانوں کا قاتل پایا گیا اور اب بھی دنیا کے حالات ایسے ہی ہیں اگرچہ ان کی شکل کچھ بدلی ہوئی ہے۔ آج بھی اگر کوئی حکمران توحیدی نظریہ رکھتا ہو اور حکومت مطلقہ کو خدا کیلئے مخصوص سمجھے کہ جو اسے لوگوں کی آراء اور ان کی تائید سے خدا نے عطا کی ہے تو وہ کبھی مغرور، ظالم اور خودغرض نہیں بنے گا......وہ حکومت پر فائز ہوتے ہوئے بھی امیرالمومنین امام علی بن ابی طالبؑ کی طرح کہہ اُٹھے گا: اگر خدا نے علماءِ حق سے یہ عہد نہ لیا ہوتا کہ وہ ظالموں کی سیری اور مظلوموں کی گرسنگی پر خاموش نہ رہیں گے تو میں ناقہ خلافت کی مہار اس کے کندے پر ڈال دیتا (اور یہ حکومت کہ جس کیلئے دنیا پرستوں کے سینے چاک ہوئے جاتے ہیں میں اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا)[1]

ہاں! ایسا حاکم ہر حال میں حکومت کو امانت الہٰی اور خود کو اس کا امانت دار اور اس مالک اصل کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے۔

یہ نقطہ نظر اس دنیا میں حکومت کے طور طریقوں کو یکسر تبدیل کرسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ انسان اس نظریئے کو اپنے دل کی گہرائیوں میں بسالے اور یہ روح انسان پر اپنا رنگ چڑھا دے۔ یہ بات صرف سربراہان حکومت کیلئے نہیں بلکہ حکومت کے تمام کارگزاروں......گورنروں، جنرلوں، افسروں مجسٹریٹوں، ججوں اور ماتحت ملازمین۔ پر بھی صادق آتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اختیارات کو امانت الہٰی تصور کرتے ہوئے اس کی رضا وفرمان کے مطابق استعمال کرے۔ گزشتہ مباحث میں جو کچھ کہا گیا ہے مجموعی طور پر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت کی شکل نہ آمرانہ ہے۔ اور نہ مغربی جمہوریت سے مشابہ ہے بلکہ ایک عوامی حکومت ہے جو اصولِ دین کی حدود میں رہ کر کام کرتی ہے۔ وہ دراصل حکومت الہٰیہ کا رنگ رکھتی ہے اور اس کے بتائے ہوئے طریقے سے عوامی تائید حاصل کرتی ہے یہی اس کا وہ امتیازی پہلو ہے جو اسے دنیا کے دیگر طریق ہائے حکومت سے الگ قرار دیتا ہے۔ حکومتِ از نظر قرآن'' کے بارے میں بحث کے کئی گوشے ہیں، یہاں فقط'' اور ''سرچشمہ حکومت خدا ہے۔ کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے کے باقی مباحث انشاءاللہ کلی حکومت'' کے زیرعنوان پیش کیے جائیں گے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ۔ ۳

# (۵) توحید اطاعت

## اشارہ:

اقسام توحید کے ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ ایک موحد انسان صرف خدا کو واجب الاطاعت جانتا ہے اور اسی کی بندگی کا طوق اپنی گردن میں ڈالتا ہے وہ فخر کرتا ہے کہ میں خدا کا بندہ ہوں کہ آنکھ اور کان اس کے حکم کی طرف اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھتا ہوں۔

البتہ اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں۔ان کے معصوم جانشینوں اور پھر ان کی طرف سے مقرر کیے گئے نائبوں اور عاملوں کی اطاعت بھی خدا ہی کی فرمانبرداری شمار ہوتی ہے۔لہٰذا وہ موحد انسان ان کے حکم کو بھی بسر وچشم مانتا ہے۔وہ صرف ایک ہی چیز کے خیال میں رہتا ہے۔اور وہ محبوب حقیقی (خدائے واحد) کی رضا اور اس مالک اصلی کے احکام پر عمل بجالانا ہے۔

ایک مرد موحد کسی صورت میں بھی ''ناراضی خدا'' کے بدلے میں ''خوشنودی افراد'' اور ''معصیت خداوندی کے بدے میں'' ''پیروی انسان'' کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ اسے شرک کی ایک قسم سمجھتا ہے۔

توحید کی یہ قسم کہ جو ''توحید اطاعت'' کہلاتی ہے۔اصل میں ''توحید حاکمیت'' سے قوت پاتی ہے۔جس کا ذکر گزشتہ بحث میں کیا گیا ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کے حضور پہنچتے اور آیاتِ ذیل کی صدا دل کے کانوں سے سنتے ہیں:۔

(۱) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ [۵:۹۲] (مائدہ)

(۲) قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ [۳:۳۲] (آل عمران)

(۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ [۴:۵۹] (نساء)

(۴) فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا [۶۴:۱۶] (تغابن)

(۵) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (آل عمران ۵۰، شعراء ۱۷۹،۱۶۳،۱۲۶،۱۰۸، زخرف ۶۳)

(۶) اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ [۷:۳]

(اعراف)

(۷)وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيۡنًا ؕ﴿۳۶﴾ [۳۳:۳۶] (احزاب)

(۸)يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱﴾ [۴۹:۱] (حجرات)

(۹)اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَالۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۱﴾ [۹:۳۱] (توبہ)

(۱۰) اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۙ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعۡبُدُوۡنِىۡ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ﴿۶۱﴾ [۳۶:۶۱](یٰس) [1]

## ترجمہ:

(۱) خدااور پیغمبر کی اطاعت کرو اور (نافرمانی سے) بچتے رہو پس اگر تم روگردانی کرو گے۔ (سزا کے مستحق ہو گے) تو جان لو کہ ہمارے پیغمبرؐ کا فریضہ بس صاف صاف بتادینا ہے۔

(۲) (اے حبیب) کہو کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو پس اگر وہ سرپیچی کریں تو (جان رکھیں) خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۳) اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو اللہ کے رسول اور صاحبانِ امر کی اور جب کسی چیز میں نزاع ہو تو اسے خدا د رسولؐ کی طرف پلٹا دو اگر تم خدا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

(۴) جہاں تک ہو سکے تقوائے الٰہی اختیار کرو۔اس کا حکم دھیان سے سنو اور اطاعت کرو۔

---

[1] قرآن میں اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات موجود ہیں۔مثلاً۔انفال۔۲۰۔۴۶۔نور۔۵۴۔محمد۔۳۳۔مجادلہ۔۱۳۔نساء۔۱۶۔انعام۔ ۱۵یونس۔۱۵۔زمر۔۱۳

(۵) تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

(٦) خدا کی طرف سے نازل کیے گئے احکام کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے معبودوں کی پیروی نہ کرو۔

(۷) جو کوئی خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں گرفتار ہے۔

(۸) اے ایمان لانے والو! کسی امر میں خدا اور اس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھا کرو، تقوائے الٰہی اختیار کرو، یقیناً وہ سنتا جانتا ہے۔

(۹) ان لوگوں نے اپنے علماء صلحاء کو خدا کے مقابل معبود بنا رکھا ہے اور (اسی طرح) عیسیٰ بن مریمؑ کو بھی، حالانکہ انہیں حکم نہیں دیا گیا، مگر یہ کہ خدائے واحد کی عبادت کریں۔ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پاک و منزہ ہے وہ اس بات سے کہ یہ لوگ اس کے شریک ٹھہراتے ہیں۔

(۱۰) اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور یہ بھی کہ تم میری ہی عبادت کرتے رہنا کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

## مفردات کی تشریح:

''اطاعت'' اس کے معنی تابع ہونا اور حکم ماننا ہیں، یہ وہ معنی ہیں کہ بہت سے ماہرین لغت نے ان کی تصریح کی ہے، پھر اسے حکم وفرمان کی پیروی کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا۔

بعض اہل لغت نے ''اطاعت'' اور ''مطاوعت'' میں فرق کیا ہے، یعنی اطاعت کے معنی تابع ہونا اور حکم کی پیروی کرنا بتائے ہیں جب کہ مطاوعت کے معنی موافقت وہم آہنگی قرار دیئے ہیں، اسی لیے کتاب ''العین'' کے مولف خلیل بن احمد نے لکھا ہے کہ حاکم کی نسبت سے رعایا کے لیے لفظ ''اطاعت'' بولا جاتا ہے۔ اور شوہر کی نسبت سے زوجہ کے لیے ''طواعیت'' یا مطاوعت'' کا استعمال کیا جاتا ہے۔

# آیات کی جمع آوری وتفسیر

## خداوند! ہم صرف تیرے فرمان کے مطیع ہیں:

(۱) پہلی آیت میں اگر چہ شراب، جوا، انصاب (بتوں کی ایک قسم) اورازلام (قسمت آزمائی کے ایک کھیل) کوحرام قرار دینے کے بعد خدااوررسوؐل کی اطاعت کاحکم آیا ہے۔لیکن بن کہے ظاہر ہے کہ یہ ایک عمومی فرمان ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔خدااور پیغمبرؐ کی اطاعت کرواور (نافرمانی سے) بچتے رہو۔(واطیعو الله واطیعوا الرسول واحذروا)۔

پھراس بات کی تاکید کےطور پر فرمایا: پس اگرتم روگردانی کروگے (سزا کے مستحق ہوگے) تو جان لوکہ ہمارے پیغمبرؐ کا فریضہ بس صاف صاف بتادینا ہے۔(فان تولیتم فاعلموا انما علی رسولنا البلاغ المبین[1])

یہ سامنے کی بات ہے کہ اطاعت رسول خدا کی اطاعت کا ایک جزاورعکس ہے اورایک طرح سے وہ بھی بعینہٖ اطاعتِ خداہی ہے، کیونکہ حضوراکرمؐ خدا کے قول وحکم کے علاوہ کچھ اور بیان نہیں فرماتے، یہ جو ''اطیعوا'' کا لفظ دوبارہ آیا ہے تواس سے یہی مراد ہے کہ خدا کی اطاعت ذاتی واصلی ہے اوردوسری اطاعت فرعی وظاہری ہے۔

(۲) دوسری آیت میں یہ مضمون پیغمبراکرمؐ سے خطاب کی شکل میں تبدیل ہوگیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے (اے حبیب) کہو کہ خدااور اس کے رسوؐل کی اطاعت کرو، پس اگر وہ سرپیچی کریں کریں تو (جان رکھیں) خدا کافروں کودوست نہیں رکھتا (قل اطیعواالله والرسول فان تولو فان الله لایحب الکافرین)۔

ذیل آیت سے واضح ہوتا ہے کہ خدا کے حکم سے سرتابی کفر ہے۔لیکن یہ اس صورت میں ہے جب خدااوررسوؐل کے فرمان کی نسبت عنادودشمنی رکھنے کے باعث ان کے حکم سے سرتابی کی جارہی ہو۔یا یہ کہ ہم کفرکووسیع معنی میں لیں اورہرقسم کی نافرمانی اورگناہ اس میں شامل سمجھا جائے بہرحال یہ آیت خداورسوؐل کی اطاعت کے وجوب پرایک تاکید ہے یعنی یہ کتاب وسنت کی پیروی کولازم قرار دیتی ہے۔

اگر چہ اس آیت میں پیغمبراکرم کا بلاواسطہ الله سے عطف ہوا ہے۔لیکن اس سے پہلی آیت میں جوکہا گیا (اے نبی) کہو کہ اگرتم خدا سے محبت رکھتے ہوتو میری پیروی کرو(قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی) اس سے ظاہر ہورہا ہے کہ اطاعت رسوؐل

---

[1] اس آیت میں جزائے شرط محذوف ہے اورترتیب کے لحاظ سے صورت یہ ہے ''قامت الحجة علیکم یا استحققتم العاب، یا ''لم تضروابتولیکم الرسول، (تفسیر مجمع البیان تفسیر فخررازی تفسیر روح المعانی۔تفسیر مراغی میں آیت زیربحث کے ذیل میں دیکھیں۔

خدا کی اطاعت ہی کی ایک شاخ ہے۔

یہ آیت بخوبی واضح کرتی ہے کہ خدا اور رسولؐ کے ساتھ سچی اور کھری محبت کی علامت یہ ہے کہ دل وجان سے ان کی اطاعت اور پیروی کی جائے ورنہ ان سے محبت کا دعویٰ ایک جھوٹ ہے یا محبت ہے تو سہی مگر بڑی کمزور ہے۔

(۳) تیسری آیت اطاعت خدا و رسولؐ کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کو ضروری قرار دیتی اور یہ فرمان سناتی ہے: اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو خدا کی اطاعت کرو رُسولؐ اور صاحبانِ امر کی اور جب کسی چیز میں نزاع ہو تو اسے خدا اور رسولؐ کی طرف پلٹا دو، اگر تم خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو(یایها الذین اٰمنوا اطیعوالله واطیعو الرسول واُولِي الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوه الیٰ الله وارسول ان کنتم تومنون بالله والیوم الاٰخرِ)۔

یہ الفاظ وعبارت بھی بڑی وضاحت سے بتا رہے ہیں کہ اطاعت خدا کے مخصوص ہے، پھر پیغمبرؐ اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم کہ ہر نزع واختلاف کے حل کی خاطر ان کی طرف ہاتھ پھیلانا چاہیے۔ اگر انسان کا طرزِ عمل اس کے مطابق نہیں تو پھر خدا و قیامت پر اس کے ایمان میں تزلزل اور ڈگمگاہٹ در آتی ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں صرف اطاعت خدا کا ذکر ہے جیسا کہ فرماتا ہے: جہاں تک ہوسکے تقوائے الٰہی اختیار کرو، اس کا حکم دھیان سے سنو اور اطاعت کرو(فاتقوالله مااستطعتم و اسمعوا واطیعوا)۔

سب سے پہلے تقویٰ اور گناہ سے پرہیز کا حکم دیتا ہے کیونکہ کسی چیز کو پاک وصاف کرنا اسے سجانے بنانے سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ اس لیے تقویٰ کے فرمان کے بعد حکم خدا کو سننے کو ہدایت کی ہے کہ سننا اطاعت کرنے پر مقدم ہے اور پھر شرط اطاعت وپیروی کرنے کا امر وحکم دیا ہے......یہی وہ اطاعت ہے جو خدا کے لیے مخصوص ہے۔

یہ جو بعض نے گمان کیا ہے۔ فاتقو الله مااستطعتم جہاں تک ہوسکے تقوائے الٰہی اختیار کرو کہ جو تقویٰ کا حق ہے۔ لیکن یہ ایک غلط فہمی ہے کیونکہ یہ دونوں جملے ایک ہی حقیقت کو بیان کررہے ہیں وہ اس طرح کے حق تقویٰ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ انسان سے جہاں تک ہوسکے پرہیزگاری اختیار کیے رہے۔

(۵) پانچویں آیت جو قرآن میں بہت سے پیغمبروں کی زبان سے آئی ہے۔ یہ پہلے تقویٰ کا حکم دیتی اور پھر پیغمبروں کی اطاعت کرنے کی تاکید کرتے ہوئے کہتی ہے: تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری (پیغمبر کی) اطاعت کرو(فاتقو الله واطعیونِ
(

یہ جملہ جیسا کہ ہے......حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ اور حضرت مسیحؑ کی زبانی قرآن میں نقل ہوا ہے(ایک بار بہ زبانِ نوحؑ: سورہ شعراء ۱۰۸ دو بار بزبانِ ہودؑ شعراء ۱۲۶، ۱۳۱، دو بار بزبان صالحؑ: شعراء ۱۴۴، ۱۵۰ ایک بار بزبان لوط: شعراء ۱۶۳، ایک بار بہ زبان شعیبؑ: شعراء ۱۷۹ اور دو بار بہ زبان مسیحؑ: آل عمران۔ ۵۰، زخرف۔ ۶۳)۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ درجہ اوّل میں یہ اطاعت ایمان بالتوحید اور ترک بت پرستی سے متعلق ہے اور دوسرے مرحلے میں تمام دینی احکام کی اطاعت ہے جو انبیاء سے ملتے ہیں۔ یہ اصل میں فرمانِ خدا کی اطاعت ہے کیونکہ وہ اس کے قول و حکم کے بغیر کچھ نہ کہتے تھے۔

(۶) چھٹی آیت میں احکام الٰہی کی پیروی کا ذکر ہوا ہے جو اطاعت ہی کا دوسرا نام ہے، اس میں اس بات کا اضافہ ہے کہ یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ خدا کے سوا کسی کی اطاعت و پیروی نہ کرو۔ یہ نفی و اثبات ''توحیدِ اطاعت'' کا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: خدا کی طرف سے نازل کیے گئے احکام کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے معبودوں کی پیروی نہ کرو(اتبعو ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعو من دونہ اولیآءَ)

یہ آیت خدا کے علاوہ لوگوں کے خودساختہ معبودوں کی اطاعت پر خط بطلان کھینچتی ہے، جو کوئی بھی ہے اور جہاں بھی ہے وہ ان کی اطاعت کو چھوڑ کر خدائے واحد کی اطاعت اختیار کرے۔

یہ آیت اور ایسی ہی دیگر آیات کھلی ہوئی گواہی دیتی ہیں کہ انسانوں کے احکام و آراء جیسی کچھ بھی ہوں پیروی کے لائق نہیں ہیں( کیونکہ وہ خطاء و غلطی سے پر ہیں، جب کہ ہم خدا کے علاوہ غیروں کی اطاعت کے لازم ہونے کی کوئی دلیل بھی نہیں پاتے)۔

(۷) ساتویں آیت میں اس امر کی تصریح کرتا ہے کہ کسی باایمان مرد و زن کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے حکم کے سامنے اپنا کچھ بھی اختیار رکھتے ہوں۔ جیسا کہ فرمایا: جو کوئی خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں گرفتار ہے۔(ومن یعصِ اللہ ورسولہٗ فقد ضل ضلالاً مبیناً)۔

آیت کا شروع و آخر ''توحید اطاعت'' کو بیان کرتا ہے، اسے ایمان کی علامت شمار کرتا اور اس کی مخالفت کو ضلال مبین( کھلی گمراہی) کہتا ہے، اس سے بڑی گمراہی اور کیا ہوگی کہ انسان خداوند عالم کو جو رحمان و رحیم ہے چھوڑ دے اور اس کے غیروں کے پیچھے ہوئے؟

(۸) آٹھویں آیت میں مومنین سے خطاب ہے اور اس کے لیے کئی ایک شان ہائے نزول ذکر ہوئی ہیں تاہم وہ سبھی گواہی دیتی ہیں کہ کبھی کبھار بعض مسلمان خدا اور رسولؐ سے سبقت کرتے اور کہتے تھے: اگر فلاں حکم اس طرح نازل ہوتا تو بہتر

تھا......اس پر یہ آیت اُتری اور اس میں ان لوگوں کو خبردار کیا گیا: اے ایمان لانے والو! کسی امر میں خدا اور اس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھا کرو، تقوائے الٰہی اختیار کرو۔ یقیناوہ سنتا جانتا ہے......حتیٰ کہ تمہارے خفیہ باتوں کو سنتا اور تمہارے سینہ میں چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے......(یاَیها الذین اٰمنو لاتقدموبین یدیِ اله ورسوله واتقوا الله اِن الله سمیعٌ علیمٌ)

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خدا مکان نہیں رکھتا تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے آگے نہ بڑھا کرو دراصل یہ اس سے کنایہ ہے کہ کسی بات اور کسی کام کے بارے میں اس پر سبقت نہ کرو[1]

بہر حال یہ آیت نہ صرف حکمِ الٰہی کی اطاعت کو لازم کرتی ہے۔ بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ ہر کام میں ہمیشہ اس کے فرمان کا انتظار کیا کرو، پھر جب حکم دے دیا جائے تو نہ تندی (تیز روی) کرو، اور نہ کندی (سست روی) کرو کیونکہ ان دونوں طرح کے لوگ غلط فہمی میں ہیں۔

تفسیر مراغی میں عربی ادبیات کے بعض ماہرین کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ "لا تقدم بین یدیِ الامام کا مفہوم یہ ہے کہ کاموں کی انجام دہی میں امام سے پہل نہ کرو۔

## عالموں اور رہبروں کی پرستش نہ کرو:

(۹) نویں آیت میں یہود و نصاریٰ کی مذمت ہوئی ہے کہ کیوں وہ اپنے علماء وصلحا کو خدا کے مقابل اپنے معبود قرار دیتے ہیں، چنانچہ فرماتا ہے: ان لوگوں نے اپنے علماء وصلحاء کو خدا کے مقابل معبود بنا رکھا ہے۔

(اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دونِ الله)[2]۔

---

[1] یہاں "لاتقدمو" کے بمعنی "لاتقدموا" ہونے میں مفسروں کے درمیان بحث گفتگو ہے (پہلا جملہ باب تفعل سے اور دوسرا باب تفعل سے ہے) لیکن جملہ "بین یدی الله ورسوله" کا مفہوم پہلی صورت میں: خدا اور رسولؐ پر سبقت نہ کرنا ہے۔ دوسری صورت میں اس کا مفہوم: کسی چیز کو خدا اور رسولؐ کے احکام سے مقدم نہ سمجھنا ہے، ان میں معنی اول زیادہ مناسب ہیں۔

[2] "احبار" جمع "حبر" بروزن "ابر" ہے یا "حَبَر" بروزن "فکر" اچھے اثر کے معنی میں ہے۔ بعد میں اسے عالم و دانش مند کے لیے استعمال کیا گیا، جیسے ابن عباس کو "حبرالامۃ" کا لقب دیا گیا ہے "رہبان" جمع ہے "راہب" کی بعض نے کہا ہے کہ یہ واحد و جمع ہر دو کے لیے آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں "خدا ترس شخص" اور یہ عیسائیوں میں ایک گروہ ہے، کاروبار اور ازواج کو ترک کر کے خانقاہوں میں عبادت کیا کرتے ہیں۔ (المفرداتِ راغب وغیرہ)۔

اس طرح انہوں نے حضرت مسیح ابن مریمؑ کو بھی ایک معبود کا درجہ دے رکھا ہے (والمسح ابن مریم) حالانکہ انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ خدائے واحد کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پاک و منزہ ہے۔ وہ اس بات سے جو یہ لوگ اس کے شریک ٹھیراتے ہیں۔ (وما امروا الا لیعبدوا الھاواحدا لاالٰہ الا ھو سبحنہٗ عما یشرکون

یہ مانا کہ یہود و نصاریٰ اپنے علماء و صلحاء کے بارے میں الوہیت کا اعتقاد نہیں رکھتے، وہ ان کی عبادت اس طرح ہرگز نہیں کرتے، جیسے ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں، پھر کیوں قرآن نے ان کے متعلق ''رب'' اور ''الٰہ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں؟

اس کا جواب امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک روایت میں آیا ہے کہ فرمایا: اماواللہ ما صاموا (لھم) ولا صلوولکنھم احلوالھم حراماً وحرموا علیھم حلا لاً فاتبعوھم وعبدوھم من حیث لایشعرون۔[1] قسم بخدا کہ وہ اپنے پیشواؤں کے لیے نہ روزہ رکھتے اور نہ نماز پڑھتے، بلکہ وہ پیشوا ان کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا دیتے تو وہ اس پر عمل کرتے...... اس طرح وہ انجانے میں ان کی پرستش کرتے تھے۔

یہ حدیث مختلف طرق سے شیعہ و سنی کتب حدیث میں آئی ہے، ہم ان میں سے بعض کتابوں میں اسے یوں پاتے ہیں: عدی بن حاتم (مشہور حاتم طائی کے فرزند) حضرت رسولؐ کی خدمت میں آئے، جبکہ ان کی گردن میں سنہری صلیب لٹک رہی تھی، حضورؐ نے فرمایا، اس بت کو اپنے گلے سے اُتار پھینکو! عدی کہتے ہیں...... میں نے سنا کہ نبی اکرمؐ آیت: اتخذوا احبارھم ...... کی تلاوت کررہے تھے میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ لوگ ہرگز اپنے علماء پرستش نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا: آیا ایسا نہیں کہ ان کے علماء حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتے ہیں۔ اور وہ لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: ہاں ایسا ہی ہے! آپ نے فرمایا: یہی پرستش ہے جو وہ لوگ کررہے ہیں[2]

اس طرح واضح ہو رہا ہے کہ جو لوگ حکمِ خدا کے خلاف فرمان دیتے ہیں ان کی اطاعت و پیروی بھی شرک کی ایک قسم ہے۔

(۱۰) دسویں اور آخری آیت میں تمام انسانوں (بنی آدم) کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

(الم اعھد الیکم یٰبنی ادم ان لاتعبدو والشیطٰنَ انہ لکم عدو مبینٌ)۔

اور یہ بھی کہ تم میری ہی عبادت کرتے رہنا کہ یہی سیدھا راستہ ہے (وان اعبدونی ھذا صراطٌ مستقیم)۔

مان لیا کہ کوئی شخص (رکوع و سجود اور نماز اور روزہ کی شکل میں) شیطان کی پرستش نہیں کرتا، پھر یہ کونسی عبادت ہے کہ جس سے نہی ہورہی ہے؟ کیا یہ اطاعت کے علاوہ کوئی چیز ہوسکتی ہے۔

ہاں! وہ لوگ جو شیطان کے مطالبوں کو مان لیتے اور اس کے حکم کو حکم خدا پر مقدم شمار کرتے ہیں، وہ مشرک اور شیطان پرست ہیں یہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۵ ص ۲۳، تفسیر برہان جلد ۳ – ۷ ص ۱۲۰

[2] تفسیر رُوح المعانی جلد ۱۰ صفحہ ۷۵، یہی مطلب دیگر تفاسیر میں بھی آیا ہے، اور کچھ تفاوت کے ساتھ تفسیر دارالمنثور میں بھی منقول ہے۔

رکوع وسجود میں شرک نہیں، حکم ماننے میں شرک ہے۔

جس عہد وپیمان کا حوالہ دیا جارہا ہے، خدانے فرزندانِ آدم سے وہ عہد کہاں اور کیسے لیا؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ عہد ''عالمِ ذر'' میں لیا گیا اور بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ وعظ ونصیحت ہے جو پیغمبرانِ الٰہی اپنی اپنی قوموں کو کرتے رہیں۔ لیکن ظاہراً یہ آیت اس عہد کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہبوطِ آدم کے وقت بنی آدم سے لیا گیا اور وہ سورۂ اعراف۔ آیت ۲۷ میں مذکور ہے۔ فرماتا ہے۔ اے فرزندانِ آدم شیطان تمہیں دھوکہ نہ دے جائے۔ جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ (آدمؑ وحوا) کو جنت سے نکال دیا تھا۔ (یبنی آدم لایفتننکم الشیطن کما اخرج ابویکم من الجنۃ)۔

اسی طرح سورۂ اعراف ہی کی آیت ۲۲ میں حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے شیطان تم دونوں (میاں بیوی کا) کھلا ہوا دشمن ہے (ان الشیطین لکما عدوٌ مبینٌ)۔

پھر سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱۷ میں حضرت آدمؑ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے ہم نے کہا اے آدم! یہ شیطان تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے۔ (فقلنا یادم ان ھذا عدو لك ولزوجك)۔

ظاہر ہے کہ ایسا دشمن آدم وحوا کی اولاد کا بھی دشمن ہوگا، کیونکہ اس کی عداوت صرف آدمؑ سے نہیں، بلکہ وہ ان کے تمام فرزندان اور ان کی پوری نسل سے عداوت رکھتا تھا، لہٰذا اس نے شروع ہی میں قسم کھائی: میں تھوڑے سے مخلص بندوں کے سوا تمام فرزندِ آدم کو گمراہ کروں گا۔ (اسراء۔ ۶۲، ص۔ ۸۲)۔

# توضیحات

## (۱) مطاعِ مطلق صرف خدا ہے

مذکورہ بالا آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلام اور قرآن کی نظر میں ''واجب الاطاعت'' فقط خدا ہے اور جن لوگوں کی اطاعت خدا ہی کی اطاعت ہے وہ بھی اسی میں شامل ہیں لیکن فرمانِ خدا کے مقابلے میں کسی کی اطاعت وپیروی قرآن کی نظر میں ایک قسم کا شرک اور بت پرستی ہے۔

لہٰذا اگر پیغمبر وامام یا ماں باپ کی اطاعت لازم ہے تو اس لیے کہ یہ فرمانِ خدا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اس لیے کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے وما آرسلنا من رسولٍ الا لیطاع باذن اللہ (انساء۔ ۶۴)۔

اس مسئلے کو دلیل عقل سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کیونکہ مطاع مطلق صرف وہی ہے جو ہر چیز سے آگاہ حکیم وخبیر، ہر طرح کی خطاء سے پاک اور رحمن ورحیم ہے، یہ صفات صرف ذات خداوندی میں جمع ہیں۔ اگر حکمرانوں، دوستوں فرزندوں، رشتہ داروں حتیٰ کہ اپنے دل کی چاہت خدا کی رضا کے مطابق نہ ہو تو اس کی پیروی طریق دراہِ شرک ہے۔

ایک توحید پرست انسان کہتا ہے: اگر میں سوئی کے ناکے برابر بھی خدا کی اطاعت سے ہٹوں تو میں مشرک ہوں۔ کیونکہ میں نے اس کی اطاعت میں کسی اور کو شریک کیا ہے۔

## (۲) توحید اطاعت اور احادیث:

مختلف حدیثوں میں بھی اس مسئلے پر تاکید ہوئی ہے کہ شرک کی ایک قسم شرک دراطاعت ہے کتبِ حدیث میں جو روایات آئی ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

الف:......حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں ہے:

لاطاعة فی معصیة الله، انما الطاعة فی المعروفِ۔

"خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، اطاعت صرف معروف میں جائز ہے"[۱]

ب:......نہج البلاغہ میں امیرالمومنینؑ کا فرمان ہے۔

"لاطاعة المخلوقٍ فی معصیة الخالقِ"

"حکم خدا کی مخالفت میں کسی شخص کی اطاعت جائز نہیں ہے۔"[۲]

ج:......امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے:

"من اطاع رجلاً فی معصیةٍ فقد عبدهٗ۔

"جس نے حکم الٰہی کے خلاف کسی شخص کی اطاعت کی گویا اس کی عبادت کی ہے۔

د:......ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام اور اسی طرح امام محمد تقی علیہ السلام سے بھی منقول ہے۔

"من اصغیٰ الیٰ ناطقٍ فقد عبدهٗ۔ فان کان الناطق یؤدی عن الله فقد عبد الله، وان کان الناطقُ یودی عن الشیطانِ فقد عبد الشیطان۔"

"جس نے کسی کہنے والے کی آواز پر کان دھرا تو اس کی عبادت کی ہے، اگر کہنے والے نے حکم خدا بتایا تو اس نے خدا کی عبادت کی اور اگر کہنے والے نے شیطان کا حکم سنایا تو اس نے شیطان کی

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۳ صفحہ ۱۴۶۹۔

[۲] نہج البلاغہ "کلماتِ قصار" کلمہ ۱۶۵۔

عبادت کی ہے۔“

ھ:......ہم اس بیان کو امیر المومنین علیہ السلام کی ایک اور حدیث کے ساتھ اختتام کو پہنچاتے ہیں آپؑ نے فرمایا:۔

لا دین لمن دان بطاعة المخلوقِ فی معصیة الخالق“

”جو کوئی خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر واضح ہوتا اور توحیدِ عبادت میں اسلامی معیارات معلوم ہوجاتے ہیں۔

o......خداوند! راہِ توحید پر چلنا بڑا مشکل اور پیچیدہ عمل ہے، تو اس پر پیچ راستے میں ہماری رہنمائی فرما!

o......بارِالٰہا! مختلف چیزیں چاروں طرف سے ہمیں اپنی اطاعت کی طرف بلاتی ہے......ہوا و ہوس ہمارے اندر سے اور شیطاطین جن وانس باہر سے......ہم چاہتے ہیں کہ صرف تیرے ہی حکم کے مطیع رہیں، تو اس راہ میں ہماری مدد ونصرت فرما!

ناصر مکارمِ شیرازی

ختم شد جلد سوم تفسیر پیام قرآن۔

تاریخ آغاز: ۱۸ ر ذی القعدہ، ۱۴۰۸ھ۔